تیری طلب کی چاہ میں

عائشہ غزل

سخت سہی ہستی کے مراحل، عشق میں راحت آج بھی ہے
اے غم جاناں، ہو نہ گریزاں، تیری ضرورت آج بھی ہے

وہ پونم کی رات تھی دلکش لیکن پُراسرار۔ سیاہ آسمان پر ستاروں کا اژدھام تھا، جو ٹمٹما ٹمٹما کر وقت کے اس دھارے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ جس کو ازل سے لے کر ابد تک نہ بدلا جاسکا ہے نہ ہی بدلا جا سکے گا۔ اس لیے کہ ان کے بیچ ایسی اَن دیکھی طاقت موجود ہے جس نے وقت کی لگامیں اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام رکھی ہیں۔

وہ پونم کی رات تھی۔ چاند نے اپنے تمام تر حُسن اور دلکشی کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کر لیے تھے۔ خاموش لیکن نکھری نکھری شفاف چاندنی میں ڈوبی ہوئی رات۔ آکاش سے لے کر دھرتی تک یوں جان پڑتا تھا جیسے تاریکی کو مٹانے کی خاطر خاموش اور پُرسکون روشنی کا جوار بھاٹا آ گیا ہو۔ گمبھیر تاریکی کسی طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو، اسی لیے ہر چیز اس اداس روشنی کی ٹھنڈک میں گم صم، چپ چاپ کھڑی تھی گویا کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔ کسی اہم فیصلے کا وقت ہو۔ کسی انہونی بات کا اندیشہ ہو۔

”پروردگارِ عالم یہ حاضر ہے۔“

اسی رات عالم بالا پر فرشتوں نے ایک اور شاہکار خدا کے حضور میں پیش کرتے ہوئے بڑے ادب سے التجا کی۔

”خداوند عالم..... کیا..... یہ..... ممکن نہیں ہوسکتا کہ..... یہ.....“

”نہیں۔“ جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی آواز کی لہریں روک دی گئیں۔ فرشتوں نے حد ادب کے خوف سے زبان کے ساتھ آنکھیں بھی بند کر لیں۔ مبادا کائنات کے خالق کو ان کی

یہ جرأت ناگوار گزر جائے۔

"تخلیقِ آدم ازل سے ایک اٹل حقیقت کی طرح قائم ہے۔" آواز کی گونج میں کیا جادو تھا کہ فرشتوں کے نورانی اجسام منجمد ہو کر رہ گئے۔

"جتنی روحیں زمین پر جانی ہیں انہیں جانا ہوگا۔ پھر...... بھلا اسے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ اسے بھی جانے دو۔"

فرشتے نے تعمیل حکم میں سر جھکا کر اس "تخلیق" کو بڑی آہستگی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ واپس مڑا۔ بڑے غور اور دکھ بھری مسرت کے ساتھ اس روشن اور چمکدار پیشانی پر لکھی گئی تحریر کو پڑھا۔ پھر چلتے چلتے ایک سیکنڈ کے لیے رک کر اس نے نیچے بہت نیچے نظر ڈالی۔ اس فانی دنیا کی طرف جہاں ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ جہاں ان گمبھیر تاریکیوں نے روشنیوں کو بھی مانند کر دیا تھا۔ جہاں مصنوعی چہرے تھے۔ جہاں اجڑی ہوئی رونقیں تھیں اور جہاں...... اس نے بزرگانہ دعاؤں کے بعد ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔ زندگی اور موت عزت اور ذلت سب تیرے ہی اختیار میں ہے خداوند...... اور......

☆

یہ وقت کی بات تھی اور شاید تقدیر کی ستم ظریفی بھی کہ عین اس وقت جب نواب وجاہت علی کی حویلی کے ایک حصہ میں ان کی بیوی دردِ زہ سے کراہ رہی تھی تو اسی حویلی کے دوسرے حصے میں ان کی ماں ناقابل برداشت اذیت میں مبتلا بڑی حسرت سے ایک ایک کا منہ تک رہی تھی۔ بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر ان کی مسہری کے قریب بیٹھے تشویشناک انداز میں فقط نبض کی رفتار گننے میں مصروف تھے۔ تجربے بے کار ثابت ہو چکے تھے۔ دواؤں کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ جب یہ تمام چیزیں ساتھ چھوڑ دیں اس لمحے کانپتے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ جاتے ہیں لیکن اکثر دعاؤں کا ہلکا پن انہیں امید اور ناامیدی کے بیچ معلق کر دیتا ہے، تب ہی مرض تو کسی نہ کسی صورت میں باقی رہتا ہے لیکن مریض ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے مایوس ہو کر نبض پر سے ہاتھ اٹھا لیا، دھیرے سے ان کی ادھ کھلی آنکھیں بند کیں، دونوں ہاتھ سیدھے کیے اور سفید چادر منہ پر ڈال دی۔

نواب وجاہت علی نے پھٹی پھٹی نظروں سے ڈاکٹر کو یہ سب کرتے دیکھا پھر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کیوں ڈاکٹر! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کچھ مت کہنا۔"

"نواب صاحب! اللہ کی یہی مرضی تھی۔ زندگی دینا اور لینا ہمارے اختیار میں تو نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے آہستہ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"لیکن ڈاکٹر...... یہ...... تو میری اماں حضور ہیں۔ میں تو ان کے بغیر ہر محبت، ہر دعا سے محروم ہو جاؤں گا۔ خدارا آپ یہ مت کہیے گا کہ...... یہ......" نواب وجاہت علی نے اپنے کپکپاتے ہونٹ ان کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر بڑی آہستگی سے انہیں اپنے قریب کر لیا۔

"ہمت سے کام لیجیے۔ میں جانتا ہوں ماں کی موجودگی اولاد کو طوفانوں سے بچانے کے لیے ایک مضبوط دیوار ہوتی ہے۔ ایک ڈھال ہوتی ہے۔ لیکن...... اللہ کے کاموں میں بندہ دخل نہیں دے سکتا نواب صاحب!"

نواب وجاہت کچھ دیر تک خاموش کھڑے ماں کے خوبصورت لیکن نہایت پُرسکون چہرے کو تکتے رہے۔ پھر جھک کر آہستہ سے ان کی پیشانی، ان کے سفید بالوں کو چوم لیا۔ آنسوؤں کے ریلے کو بمشکل آنکھوں میں روک کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئے گیلری میں سے گزرتے ہوئے ان کے کانوں میں کسی کی سہمی سی آواز آئی۔

"نواب...... صاحب!" ان کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ نرس حالات سے قطعی لاعلم تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ نواب وجاہت علی ایک مضبوط سہارے کے ٹوٹ جانے سے بکھر چکے ہیں۔

"مبارک ہو۔ آپ کے یہاں صاحبزادی صاحبہ تولد ہوئی ہیں؟"

مبارک کا لفظ معمولی پتھر کی چوٹ ہوتا تو سہہ بھی لیا جاتا لیکن وہ تو پورا کا پورا پہاڑ ثابت ہوا جس نے نواب صاحب کے شکستہ احساسات کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ وہ بجلی کے کرنٹ کی سی تیزی سے پلٹے اور اپنی پوری طاقت سے نرس کے رخسار پر تھپڑ رسید کر دیا۔

"دور ہو جاؤ میرے سامنے سے۔" وہ اپنی پوری طاقت سے چلائے لیکن اس کے دور چلے جانے سے پہلے وہ خود ہی تیز تیز قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

☆

سوئم کی فاتحہ کے بعد جب تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ عابدہ بیگم بنا کسی ارادے،

بنا کسی مقصد کے دبے دبے قدموں سے چلتی ہوئی نواب وجاہت علی کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ سامنے ہی اپنی مخصوص کرسی پر وہ نیم دراز تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ اماں حضور کی موت نے دو دن کے اندر انہیں کتنا زرد اور کمزور بنا دیا تھا۔ انہیں دیکھ کر عابدہ بیگم کا دل رو اٹھا۔ اس لمحہ انہیں خیال آیا۔ اماں حضور کو بھی تو اپنی اولادوں میں وجاہت ہی بہت پیارا تھا شاید۔ کھلنڈرا اور ضدی بیٹا۔ اماں حضور کو کتنا تنگ کیا کرتا تھا لیکن اس کے باوجود تمام زندگی کے کسی بھی لمحے میں اس کو برا نہ کہہ سکیں۔ کبھی کسی بھی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ بعض اوقات جب اس کی بے جا ضدوں پر انہیں شدید غصہ آتا تو ضبط کی انتہائی کوشش میں آنکھیں بند کر کے چپ چاپ لیٹ جاتیں اور اس وقت اگر وجاہت سامنے ہی رہتا تو ڈانٹنے کے بجائے صرف اتنا ہی کہتیں۔ ”وجاہت میرے سامنے سے چلے جاؤ بیٹا! تھوڑی دیر کے لیے سہی لیکن مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ اور پھر اگر یہ تھوڑی دیر کافی دیر میں تبدیل ہونے لگتی تو کس طرح بے چین ہو کر اماں حضور کمرے سے باہر نکل آتیں نوکروں کی شامت آ جاتی۔ ڈانٹیں پڑتیں، حکم دیا جاتا۔ ”جاؤ بھاگ کر دیکھو تمہارے چھوٹے سرکار کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے نظر کیوں نہیں آئے؟“ پھر جب ان کا خاص نوکر ڈھونڈ ڈھانڈ کر چھوٹے سرکار کو اماں حضور کے سامنے پیش کر دیتا تب کہیں جا کر انہیں چین آتا۔ ان کا سرخ و سفید چہرہ خوشی سے کھل اٹھتا۔ سب کچھ بھول بھال کر اسے اپنے سینے سے لگا کر کشادہ پیشانی چوم کر کہتیں۔ ”اپنی ماں کو اتنا نہ ستایا کرو وجاہت!“

یہی حال وجاہت کا بھی تو تھا۔ عابدہ بیگم کی آنکھیں خشک تھیں لیکن دل رو رہا تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے ”یاد ماضی عذاب ہے یارب!“ انہیں یاد آیا چار دن کے لیے اماں حضور منصور کی پیدائش پر میرے یہاں آئی تھیں تو دوسرے ہی دن بھڑبھڑاتا ہوا آن پہنچا تھا۔ ”میں اپنی اماں حضور کو لیے جا رہا ہوں آپا بیگم! بس بہت رکھ لیا آپ نے اپنے پاس۔ میرے منہ میں خاک اگر کہیں کل کلاں ان کا اکلوتا بیٹا لڑھک گیا اور اس کو کچھ ہو گیا تو.....؟ کون سنبھالے گا میری اماں کو۔“

عابدہ بیگم نے ہلکی سی سسکی لی۔ آنسوؤں کا ریلا رکاوٹوں کو پار کر چکا تھا۔ انہوں نے بہتے آنسوؤں کو رومال میں جذب کیا۔ قریب جا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے دھیمے لہجے میں بولیں۔

”وجاہت۔“ نواب صاحب نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ بہن کو اتنے قریب کھڑا دیکھ کر زبردستی مسکرا دیئے۔

”ارے آپ..... کب آئیں میرے کمرے میں؟ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔“ وہ کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ عابدہ بیگم نے مصنوعی مسکراہٹ کا جواب اسی تصنع آمیز مسکراہٹ میں اس طرح دیا کہ سسکیاں اندر ہی گھٹ کر رہ گئیں۔

”بس تمہیں ڈھونڈتی ہوئی یہاں آ گئی۔ مہمانوں کو رخصت کر کے تمہیں اندر آنا چاہیے تھا، نا کہ یہاں سب سے الگ تھلگ آ کر بیٹھ گئے۔“

”دراصل۔“ وہ کچھ جھجکے۔ ”میں بہت تھک گیا تھا آپا بیگم!“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ ایسے موقعوں پر جسمانی تھکن سے زیادہ ذہنی تھکاوٹ ہو جاتی ہے لیکن کیا تمہیں یاد نہیں رہا کہ اندر دلہن تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

نواب وجاہت نے غور سے بہن کے چہرے کی طرف دیکھا، ہلکے سے مسکرائے۔

”آپ درست فرماتی ہیں آپا بیگم! میں واقعی آپ کا بہت نالائق بھائی ہوں۔ اب یہی دیکھیے آپ کب سے میرے پاس کھڑی ہیں اور میں نے آپ سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔“

”چلو معاف کیا۔ آئندہ خیال رکھنا۔ ویسے اس وقت میں یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آئی ہوں تمہیں لینے آئی ہوں۔ اندر چلو غیر لوگ سب جا چکے ہیں۔ گھر میں اب صرف قریبی رشتہ دار ہیں اور تمہارے منتظر ہیں۔“

انہوں نے خاموشی سے گردن جھکا لی۔ کچھ سوچتے ہوئے جوتے کی نوک سے قالین پر بنے پھولوں کو روندتے رہے۔

”کیا سوچنے لگے؟“ کچھ دیر ان کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد عابدہ بیگم نے پوچھا تو انہوں نے سر اٹھا کر بہن کی طرف دیکھا۔ ان کے مرجھائے ہوئے چہرے اور خشک ہونٹوں کو دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے۔

”آپا بیگم! آپ جا کر آرام کریں۔ کتنی کمزور اور تھکی تھکی نظر آ رہی ہیں۔ میں شام تک اندر آؤں گا۔“

”ابھی کیوں نہیں؟“ انہوں نے پھر سوال کیا۔

”یونہی..... کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ میں نے کہا نا آپا بیگم شام کو اندر آؤں گا۔“ کچھ

دیر خاموش رہنے کے بعد عابدہ بیگم بڑے ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولیں۔

''وجاہت! یہ مانا کہ ابا حضور کی موت نے تمہیں نوابیت کی گدی پر بیٹھا کر بلند مرتبہ اور بے شمار اختیارات عطا کر دیئے ہیں لیکن آج جبکہ اماں حضور ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ مجھے یہ تو حق پہنچتا ہے کہ بحیثیت بڑی بہن اور ماں کے تم سے اپنی ہر جائز بات منوا لوں۔ اس وقت اماں حضور زندہ ہوتیں اور یوں اتنی دور سے چل کر تمہارے پاس کسی اہم مقصد کے تحت آتیں تو کیا تم ان کا کہا ٹال جاتے۔ انکار کر دیتے۔ ذرا سوچو تو آج تیسرا دن بھی ختم ہونے والا ہے۔ تم نہ اندر آئے، نہ ثریا دلہن سے ملے اور نہ ہی اپنی نومولود بچی کو دیکھا۔ جس کی پیدائش سے پہلے......تم......''

''آپا بیگم۔'' نواب وجاہت علی نے بڑی نرمی لیکن ٹوٹے ہوئے لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔ ''بادشاہت یا نوابیت کی کرسی مل جانے سے خونی رشتوں کی اہمیت تو کم نہیں ہو جاتی، نہ ہی ان کے احترام میں فرق پڑتا ہے۔ اماں حضور کی زندگی تک آپ صرف میری بڑی بہن تھیں اور اب جب سے وہ ہمارے درمیان نہیں رہی ہیں آپ ان کی جگہ ہیں۔ اب آپ ہی میری بہن بھی ہیں اور ماں بھی۔ لیکن......'' انہوں نے بڑے کرب سے عابدہ بیگم کی طرف دیکھا۔ بلا کے حوصلے نے ان جھلملاتے آنسوؤں کو آنکھوں میں ہی رک جانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن عابدہ بیگم کے اندر تو وہ ضبط و حوصلہ نہیں تھا۔ وہ نہ تو وجاہت علی تھیں اور نہ ہی نواب گلزار نگر۔ وہ اس وقت محض ایک عورت تھیں جس کی ماں کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ وہ کھلے آسمان تلے کھڑی تھیں۔ وہ ایک بھائی کی ایسی بہن تھیں جس کے کندھوں پر اللہ تعالیٰ نے دوہری ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا تھا۔ ایک چہیتے بھائی کی شکستگی کا احساس تھا جو ماں جیسی مشفق ہستی کی محبت سے محروم ہو چکا تھا۔ دوسری طرف بھاوج کی اس کسمپرسی کا بھی احساس تھا جو تین دن سے زچہ خانے میں پڑی اپنی پہلی اولاد کی ولادت پر مسکرانے کے بجائے آنسو بہاتی رہی تھی۔ جس نے ماتم پرسی کے لیے آنے والی خواتین کی تیز نظروں کے ڈر سے اپنی بچی کو نظر بھر کر دیکھا تک نہیں تھا اور جسے اس بھائی کا بھی خیال تھا جس نے ماں جیسی انمول شے کے بدلے ایک بچی خریدی تھی اور اب جسے وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

''تم اتنے توہم پرست تو نہیں تھے۔ تم تو بڑے وسیع النظر تھے وجاہت! پھر اب یہ ہچکچاہٹ کیوں؟ اللہ تعالیٰ کے نظام میں دخل اندازی کیوں؟ جتنی روحوں کو اس دنیا میں آنا

ہے وہ تو ہر حال میں آئیں گی اور جن کو رخصت ہونا ہے انہیں ہم اور تم روک تو نہیں سکتے۔ موت اور زندگی کا یہ کھیل تو ازل سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے لیے معاملات زندگی سے تو منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ یہ کفران نعمت ہے۔'' انہوں نے قائل کرنا چاہا۔ ''میں مانتی ہوں ماں جیسی ہستی اور اس کی بے غرض اور بے لوث محبت انسان کو کبھی بھی کسی بھی صورت میں نہیں مل سکتی لیکن وجاہت! اللہ کے بنائے ہوئے دوسرے رشتے اور دوسرے فرائض بھی تو اہم ہیں اس غم میں کہیں تم کسی فرض کی ادائیگی میں غفلت اور کسی کی حق تلفی نہ کر بیٹھو جو اللہ کے نزدیک ناقابل معافی ہو۔''

''آپا بیگم! مجھے حقوق کی ادائیگی کا بھی احساس ہے اور فرائض کی اہمیت کا بھی۔ میں کوتاہ نظر بھی نہیں ہوں۔ لیکن......ایک کمزور انسان ضرور ہوں آپ سے التجا کرتا ہوں آج آپ اس وقت مجھے اندر لے جانے کے لیے مجبور نہ کریں اس لیے کہ مجھے اپنے آپ پر بھی اعتبار نہیں رہا ہے۔ ممکن ہے اماں حضور کی محبت ساری زندگی کے لیے ثریا کو مجھ سے دور کر دے اور وہ معصوم بچی قدرت کی اس ستم ظریفی پر ہمیشہ کے لیے باپ کی محبت سے محروم ہو جائے میں اپنی غیر یقینی کیفیت پر قابو پا لوں آپا بیگم۔ پھر خود ہی اندر آ جاؤں گا۔''

''تمہاری مرضی......ویسے کوشش کرنا وجاہت کہ اپنی غیر یقینی کیفیت پر قابو پانے کے لیے کوئی قدم غلط نہ اٹھا لو، کوئی غلط فیصلہ نہ کر لو جس پر وقت نکل جانے کے بعد پچھتانا پڑے۔'' عابدہ بیگم جانے کے لیے مڑ گئیں نواب وجاہت نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اس کوشش اور کشمکش پر قابو پانے کے لیے تو آپ جیسی بہن کو مایوس لوٹا رہا ہوں مجھ سے خفا ہو کر مت جایئے گا۔ ویسے ممکن ہے آپ کی اس خواہش کی تکمیل آج رات تک ہی ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے......کہ......''

''کیا؟ کیا ممکن ہے؟'' جاتے جاتے دروازے کے قریب رک کر انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہی......کہ ممکن ہے مہینوں گزر جائیں۔'' وہ بڑے دکھ سے مسکرائے۔ عابدہ بیگم کے قدموں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا ہو وہ جہاں تھیں وہیں جم کر رہ گئیں۔ ان چند لمحوں میں ان پر کتنی صدیوں کے بوجھ گرے اور کچلتے ہوئے چلے گئے۔ اس ناقابل برداشت دکھ کا اندازہ بھلا نواب وجاہت علی کو کس طرح ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ جذبے کی شدت اور اقتدار کی گرمی

انسان کو احساسات کی اسی سطح پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں کانٹے کی چبھن تو محسوس ہوتی ہے لیکن اتنی نہیں کہ انسان تکلیف سے بلبلا اٹھے۔ عابدہ بیگم بنا جواب دیئے خاموشی سے باہر نکل گئیں۔ وہ چند سیکنڈ تک ہلتے ہوئے پردے کو تکتے رہے۔ پھر سر کو زور سے جھٹک کر گویا بکھرے ہوئے منتشر خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ کچھ دیر تک خالی الذہن، دونوں ہاتھ پیچھے کیے ٹہلتے رہے پھر اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلے گئے۔ تین دن سے وہ ریاست کے معاملات سے قطعی بے خبر تھے اب ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنے اس عظیم فرض سے کوتاہی برتنا نہیں چاہتے تھے۔

☆

مختلف قسم کی رسومات زندگی کا اہم ترین جزو بن چکی ہیں۔ ان میں ایک خاص حُسن اور ایسی دلکشی ہوتی ہے جنہیں دیکھنے اور ادا کرنے سے زیادہ دلوں کی گہرائیوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے بزرگوں کی طرف سے دی گئی یہ امانتیں ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہتی ہیں یہ اور بات ہے کہ کسی نے انہیں اپنا قیمتی اثاثہ سمجھ کر سنبھالا ہوا ہے اور کسی نے بے جا اسراف سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے لیکن وہ قدریں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں ابھی بھی قائم ہیں۔

عابدہ بیگم کی خواہش، خاندانی دستور اور زبردستی کا نتیجہ تھا کہ ثریا بیگم نے نہا کر سیاہ ماتمی دوپٹہ اتار کر کلدار گلابی دوپٹہ اوڑھ لیا تھا۔ اپنی پرانی روایات کے احترام اور سب سے بڑھ کر بھاوج کے سہاگ کی سلامتی کے لیے عابدہ بیگم نے مالن کے لائے ہوئے پھولوں میں ایک ہار اٹھا کر بھاوج کے جوڑے میں لپیٹ دیا تھا۔ ہاتھوں میں پھول باندھتے ہوئے بڑے پیار سے بولیں۔

''بی بی! میں جانتی ہوں یہ سب کچھ تم صرف میری خوشی اور دل رکھنے کی خاطر بڑی مجبوری سے کر رہی ہو لیکن کیا کروں میرا دل ڈرتا ہے ثریا بہن! آج تو وہ دن تھا کہ تمہیں بری کا جوڑا پہنا کر سارے زیوروں سے لاد کر دلہن بنایا جاتا۔ بہت بڑی دعوت کا اہتمام ہوتا اور آدھی رات گزرنے کے بعد تمہیں آسمان تلے لا کر تارے دکھانے کی رسم ادا کی جاتی۔ لیکن......'' ان کا گلا رندھ گیا۔ ''خدا تمہارے سہاگ کو قائم رکھے اور تمہاری گود بھری رہے۔ اس دفعہ نہ سہی اگلی بار میں اپنی بھاوج کو دلہن بنا کر سارے ارمان نکال لوں گی اور وجاہت

سے منہ مانگا نیگ لوں گی۔'' ثریا بیگم ہلکے سے مسکرا دیں۔ پنگوڑے میں سوئی ہوئی بچی کو اٹھا کر پہلے تو عابدہ بیگم نے چمٹا چمٹا کر خوب پیار کیے پھر دھیرے دھیرے چلتی ثریا بیگم کے نزدیک آئیں اور بسم اللہ پڑھ کر بھاوج کی گود بھر دی۔ ماں باپ اور بیٹی کی صحت، زندگی اور خوشیوں کی دعاؤں کے ساتھ صدقہ اتارا گیا۔ خیرات بانٹی گئی ماں اور بیٹی کے ہاتھوں میں سہاگ کی نشانی کے طور پر انہوں نے سونے کے کنگن پہنائے۔ سب سے آخر میں تمام رسومات ادا کرنے کے بعد جب عابدہ بیگم نے بھاوج کا منہ میٹھا کرنے کے لیے ان کا چہرہ اوپر اٹھایا تو دھک سے رہ گئیں۔

''نہیں...... ثریا بہن۔'' انہوں نے ان کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''بیٹی! مجھے تمہارے اس دکھ کا بخوبی اندازہ ہے خدا کے لیے تم اس لمحے اپنے آنسوؤں کو آنکھوں سے باہر مت آنے دینا۔ بہت برا شگون ہوگا۔ تمہارے لیے بھی اور وجاہت کے لیے بھی اور اس معصوم کے لیے بھی جسے دنیا والوں کے ساتھ ساتھ خود اس کا اپنا باپ بھی بدقسمت اور منحوس سمجھ رہا ہے۔''

ثریا بیگم نے بڑے حوصلے سے آنسوؤں کو پی کر ہنستے ہوئے نند کی طرف دیکھا۔ ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں تھام کر بولیں۔ ''میں رو تھوڑا رہی ہوں آپا بیگم! بھلا رونے کی کوئی بات ہو بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ اور وجاہت کا سایہ ہم ماں بیٹی کے سروں پر قائم رکھے۔ یہی میری خوش قسمتی ہوگی۔''

لیکن اس روز کی آخری رسم ادا کرتے ہوئے عابدہ بیگم بھی حوصلہ ہار بیٹھیں۔ اس شدید اذیت اور تکلیف کو جس سے وہ صبح سے دو چار تھیں اس لمحہ پانی کے گھونٹوں کے ساتھ پی جانا چاہ رہی تھیں۔ ثریا بیگم دور بیٹھی خاموشی سے ان کی حالت دیکھ رہی تھیں۔ نند کی اس قوت برداشت اور ہمت پر ان کے ہونٹوں پر آپ ہی آپ افسردہ سی مسکراہٹ عود کر آئی۔ وہ آخری رسم نواب وجاہت علی کی پہلی اولاد کا نام رکھنے کی رسم تھی۔ مردان خانے میں بیٹھے مولوی صاحب قرآنی آیات پڑھ رہے تھے۔ ادھر چلمن کے نزدیک عابدہ بیگم اماں حضور کی جگہ وجاہت علی کی بچی کو گود میں لیے منتظر بیٹھی تھیں۔ نواب صاحب کا خاص ملازم ان کو بلانے گیا ہوا تھا۔ باپ کے ہوتے ہوئے باپ کی غیر موجودگی میں نام کا اعلان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بدشگونی تھی، گھنٹہ بھر بعد نوکر واپس آ گیا۔

''کیوں...... نواب صاحب نہیں آئے؟'' اسے تنہا آتا دیکھ کر عابدہ بیگم کے شوہر رشید

احمد نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی..... سرکار! وہ کسی ضروری کام سے گاؤں چلے گئے ہیں۔''

''رشید احمد کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ بڑے بہنوئی کے ناتے انہیں واقعی غصہ آ گیا تھا۔ چلمن کے پیچھے بیٹھی عابدہ بیگم کا چہرہ بھی آگ کی طرح تپ اٹھا۔ انہیں بھائی سے ایسی امید نہیں تھی۔ انہوں نے کن انکھیوں سے بھاوج کی طرف دیکھا۔ وہ سر پر آنچل سنوارے بڑے سکون سے بیٹھی تھیں۔ اس خبر نے انہیں چونکایا نہیں تھا جیسے انہیں پہلے ہی سے یہ خبر تھی کہ ایسا ہی ہونا ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔''

''مولانا صاحب! آپ اپنا کام شروع کیجیے۔'' رشید احمد نے جھنجلا کر غصے میں مولوی صاحب کو حکم دیا۔ انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ آیات پڑھیں۔ قرآن پاک کے اوراق پلٹے۔ پھر پہلے حرف کے مطابق مولانا صاحب نے چاندی کی تھالی پر سچے موتیوں سے ''نادیہ'' لکھ کر بڑے ادب سے تھالی رشید احمد کے ہاتھوں میں تھما دی۔ ''حرف ''ن'' سے ''نادیہ'' نام تجویز ہوا ہے مبارک ہو۔'' رشید احمد نے دکھ اور مسرت کے ملے جلے تاثرات میں نام پڑھا۔ پھر چلمن کے نزدیک آن کر دھیمی آواز میں بولے۔

''ثریا دلہن!'' نادیہ نام مبارک ہو، خدا کرے تمہاری بیٹی کے لیے یہ نام خوش بختی کی علامت ہو۔''

''نادیہ وجاہت علی مبارک ہو۔ ثریا دلہن۔'' عابدہ بیگم نے قریب آن کر بچی ماں کی گود میں دے دی۔

''آپ کو بھی مبارک ہو آپا بیگم!'' انہوں نے بڑے دھیرے سے مگر اپنے اوپر جبر کر کے اس مبارکباد کا قرض ادا کیا اور بچی کو ہاتھ بڑھا کر آپا کی گود میں دے دیا۔

''نواب وجاہت علی کی اس غیر متوقع حرکت پر جتنا شدید دکھ ثریا بیگم کو تھا اس سے کہیں زیادہ شرمندگی اور خجالت عابدہ بیگم کو تھی۔ ان میں اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں تھا کہ وہ آنکھ ملا کر بھاوج سے بات کر سکتیں یا آگے بڑھ کر گلے لگا لیتیں۔ وہ جانتی تھیں یہ سب چیزیں اس بیوی اور اس ماں کے لیے قطعی اہمیت نہیں رکھیں گی جو مہینہ بھر سے شوہر کی لاتعلقی اور بچی کے لیے ایک نامعلوم خطرے کو بڑے حوصلے سے سینے کے اندر دبائے ہوئے ہے۔ کون جانے کل اس بچی کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ چبھن تو خود ان کے اندر موجود تھی مگر اظہار کرنا

نہیں چاہتی تھیں۔ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ ڈر اس بات کا تھا کہ کہیں اس ننھی سی جان کے ماتھے پر نفرت اور نحوست کا دھبا نہ لگ جائے۔''

☆

دادی کی موت کے دن پوتی نے پیدا ہو کر جو غلطی کی تھی اس کی سزا بیٹی کے ساتھ ساتھ ماں کو بھی اس طرح بھگتنا پڑی کہ ڈیڑھ ماہ تک وہ اس شوہر کی صورت کو ترس گئیں جس کی ایک دن کی غیر حاضری بھی ثریا بیگم کو بیکل کر دیا کرتی تھی۔ اتنی محبت اور خیال کرنے والا شوہر بے تعلق اور بیگانہ ہو جائے گا۔ انہوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ آخر کو ان کا قصور بھی کیا تھا۔ پیدائش اور موت کا دن اور وقت اگر انسان کے بس میں ہوتا تو ہر بندہ اپنی مرضی اور سہولت کے تحت دونوں کام کرتا لیکن خدا کے کاموں میں کس کا دخل ہے۔ روحیں عالم بالا سے آتی بھی ہیں اور اس کی طرف کوچ بھی کرتی رہتی ہیں یہ قسمت کا کھیل تھا کہ نادیہ بیگم کی آمد اور دادی جان کی موت کے ایک ہی مقررہ وقت نے رشتوں کی مضبوط دیوار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ باپ کی بیزاری اور سخت دلی کی سزا اس ننھی سی جان کو اس طرح مل رہی تھی کہ سارا سارا دن گزر جاتا اور ثریا بیگم اسے گود میں لینا تو درکنار نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں۔

ایک روز دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد جب سب لوگ آرام کرنے کے لیے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ ثریا بیگم نے لیٹنا چاہا لیکن ایک عجیب سی گھٹن نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔ لیٹنے کے بجائے وہ دیر تلک کمرے ہی میں ٹہلتی رہیں۔ بچی آیا کے پاس تھی۔ انہوں نے کچھ سوچا۔ کمرے کے دروازے تک گئیں پھر واپس پلٹ آئیں۔ یہ انا کا مسئلہ تھا بنا کسی قصور کے انہوں نے سزا بھگتی تھی اب وہ خود چل کر کیوں نواب وجاہت علی کے پاس جاتیں۔ معذرت تو انہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ خاموشی سے آن کر مسہری پر ٹک گئیں، کتنے ہی کٹھن لمحے فیصلہ کرنے میں گزر گئے۔ آخر کار ایک عورت بلکہ ایک بیوی کو ہار ماننی ہی پڑی۔ دھیرے دھیرے چلتی وہ حویلی کے اس حصے کی طرف آ نکلیں جو نواب وجاہت علی کے لیے مخصوص تھا۔ راہداری سے گزر کر ان کے کمرے کے قریب آئیں۔ ایک سیکنڈ کے لیے ان کی خودداری نے للکارا۔

''جب اس شخص کو میری پروا نہیں۔ تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔'' انہوں نے واپس پلٹنا چاہا لیکن ایک اٹوٹ زنجیر نے ان کے قدم جکڑ لیے۔

"وجاہت تم جو خدا معلوم کیا کیا دعوے کیا کرتے تھے اب تمہاری اس محبت کا بھرم ٹوٹ چکا ہے۔ آخر کو تم بھی ان عام مردوں میں سے ایک نکلے جن کے ظاہر و باطن کی سچائی کی تلاش میں عورت ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی ہے لیکن میں...... جو بہت کمزور ہوں اس دل کا کیا کروں جس میں ہر لمحہ صرف تمہارا ہی دھیان رہتا ہے۔ پھر بھلا۔"

بہت آہستہ سے پردہ ہٹا کر نواب صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ سامنے ہی اپنی مخصوص کرسی پر چپ چاپ لیٹے نامعلوم کن سوچوں میں غرق تھے۔ وہ قالین پر قدموں کی آواز پیدا کیے بغیر چلتی ہوئی ان کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئیں۔

"نواب صاحب!" انہوں نے محض سرگوشی کی تھی لیکن نواب صاحب اس طرح پلٹے جیسے کسی نے انہیں جھنجوڑ ڈالا ہو۔ ایک لمحہ کے لیے تو انہیں سماعت اور آنکھوں پر اعتبار نہ آیا ان کے پاؤں، ان کے ہاتھ اور ان کی آنکھیں ایک ہی مرکز پر جم کر رہ گئیں۔ ثریا بیگم کے قریب آن کر بہت دھیرے سے اپنے دونوں ہاتھ ان کے کندھوں پر رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولے۔

"ثریا بیگم...... آپ...... یہاں۔"

ثریا بیگم کی آنکھوں میں آنسو ڈول رہے تھے لیکن بظاہر ہنستے ہوئے بولیں۔

"اس میں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجرم ہی تو عدالت تک جایا کرتا ہے۔ نواب صاحب!" طنز کا نشتر انہوں نے محسوس کیا لیکن چبھن کو چھپانے کے لیے زور سے ہنس دیے۔

"بہت ناراض ہو ثریا! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تم کیا جانو یہ دن تمہارے بغیر کیسے گزارے۔ تمہیں یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان دنوں تمہارا وجاہت کتنا مصروف، کتنا پریشان رہا ہے۔ یقین ماننا ثریا بیگم۔" وہ بڑے پیار سے ان کا رخسار تھپ تھپا کر بولے۔

"ہر روز یہ سوچتا تھا کہ آج سارے کام نمٹا کر ضرور تمہارے پاس جاؤں گا لیکن......"

"ہر روز کاموں میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔" ثریا بیگم نے ان کی بات کاٹ کر آہستگی سے ان کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیے۔

"تو...... اتنی خفا ہو۔" وہ ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولے۔

"چلو اب معاف بھی کر دو۔ مجھ سے واقعی بہت بڑی غلطی ہوئی۔ لو ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"میرے یہاں آنے کا یہ مقصد تھوڑا ہی تھا کہ آپ اتنے اہم کاموں کا حرج کر کے میرے پاس ضرور آئیں۔" وہ زور سے ہنس دیں۔

"پھر کیا مقصد تھا؟" بڑے دنوں بعد نواب وجاہت علی کے چہرے پر بھی شگفتگی آئی تھی۔ ثریا نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولیں۔

"اپنے وجاہت کو کھو کر ایک نواب کو دیکھنے چلی آئی تھی۔ ناگوار ہو تو چلی جاؤں؟"

"ثریا۔" نواب وجاہت علی چلا پڑے۔

"یہ مت سمجھنا کہ جس دکھ میں تم اتنے دنوں آنسو بہاتی رہی ہو اس اذیت میں تمہارا یہ پتھر دل وجاہت نہیں رو سکتا۔ مجھے بھی تو تمہارا انتظار تھا۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر آ گئے۔

دونوں نے وہ تمام راستہ نہایت خاموشی سے کچھ سوچتے ہوئے طے کیا۔ اپنے کمرے کے دروازے پر رک کر ثریا بیگم نے بڑے خلوص سے دعا مانگی۔

"پروردگار! بچی کو دیکھ کر باپ کے دل میں محبت پیدا کرنا۔ نفرت نہیں۔" اپنے کمرے میں آ کر نواب وجاہت علی بڑے آرام و سکون سے مسہری پر دراز ہو گئے۔ ان کے چہرے سے غیر معمولی خوشی اور مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ثریا بیگم ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئیں۔ وہ بھی بہت خوش تھیں اگرچہ کسی انجانے خوف سے دل دھڑک رہا تھا۔

"یوں لگتا ہے جیسے آج مدتوں کے بعد ہم مل رہے ہوں۔ یہ دوریاں کتنی اذیت ناک ہوتی ہیں۔ وجاہت۔" وہ دھیرے دھیرے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

"ہاں...... شاید۔" ان کی آنکھیں بند تھیں۔ انہیں واقعی بڑا سرور مل رہا تھا۔ تھکاوٹ ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

"اتنا کام بھی نہ کیا کیجیے کہ صحت پر اثر پڑے۔"

آنکھیں کھول کر انہوں نے بڑے غور سے ان کی طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولے۔

"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن بدقسمتی سے تمہارا شوہر گلزار نگر کا نواب ہے۔ کاش وہ ایک معمولی درجے کا انسان ہوتا کہ...... اس کے دن اور رات تو اپنے ہوتے۔"

"مانتی ہوں آپ کے کندھوں پر بہت ذمہ داریاں ہیں لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ

انسان دن اور رات میں امتیاز نہ کر سکے۔''

''اگر امتیاز کرنے بیٹھ گیا تو ڈرتا ہوں بھٹک جاؤں گا، رعایا کی ذمہ داریوں سے غافل ہو جاؤں گا اور میں نہیں چاہتا کہ یہ دونوں حرکتیں یا غلطیاں مجھ سے سرزد ہوں۔''

''خدا نہ کرے...... میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا لیکن اگر حدود متعین کر لی جائیں تو اس میں بہتری ہے۔''

''دراصل ثریا بیگم! اللہ تعالیٰ نے جس بندے کو بھی اس زمین پر خلیفہ نامزد کیا وہ اس کا سب سے اہم اور کٹھن امتحان ہوتا ہے بظاہر وہ حاکم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اللہ نے تو اسے رعایا کے ادنیٰ خادم کی حیثیت دی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم جہاں اللہ کے بتائے ہوئے اور راستوں سے بھٹک چکے ہیں۔ وہیں ہم نے اس اقتدار کی کرسی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ یہاں تک کہ دنیاوی دولت کے لیے ایمان کی دولت بھی۔'' انہوں نے تکیہ پر سر رکھ کر پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''اتنے مایوس نہ ہوں۔ مایوسی گناہ ہے۔'' ثریا بیگم نے ان کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''میں مایوس نہیں ہوں'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ''ہاں پریشان ضرور ہو جاتا ہوں۔ تم جانتی ہو رعایا کو حاکم سے اس وقت تک محبت ہوتی ہے جب تک وہ ان کی تمام ضروریات اور آرام کا خیال رکھتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں معافی نہیں ملتی۔''

ثریا بیگم خاموش تھیں جواب بھی کیا دیتیں۔ بس یہ سوچ رہی تھیں اگر میرا بس چلے تو اس نوابیت کو لات مار کر اپنے وجاہت کے ساتھ کہیں بہت دور چلی جاؤں جہاں یہ معاملات اور فکریں تو زندگی کو گھن کی طرح نہ کھاتی رہیں گی۔ وہاں کم از کم سکون اور اطمینان تو ہو گا۔ عین اسی لمحہ ثریا بیگم کے کانوں میں آیا کی آواز آئی۔

''بیگم صاحبہ! صاحبزادی نادیہ رو رہی ہیں۔'' ان کا دل دھک سے رہ گیا وہ واپس اس حقیقی کی دنیا میں پلٹ آئی تھیں جس نے ان کا سکون چھین لیا تھا۔ گھبرا کر ایک نظر نواب صاحب پر ڈالی پھر سہمی ہوئی آواز میں بولیں۔

''اندر لے آؤ۔''

''کون...... نادیہ؟'' نواب صاحب نے تکیہ پر سے سر اٹھا کر بڑے تعجب سے پوچھا۔

ان کے اس انجان پن اور حیرانی پر ثریا بیگم کٹ کر رہ گئیں۔ آیا نے اندر آ کر بڑے ادب سے بچی ماں کے حوالے کر دی۔

نواب وجاہت علی نے بڑے غور اور تجسس سے بچی کی طرف دیکھا۔ پھر جیسے کچھ یاد آ گیا ہو اور اس یاد کے ساتھ ہی ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسرتوں کی وہ ان گنت کرنیں ماند پڑ گئیں۔ انہوں نے جھنجلا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ثریا بیگم نے اپنے اور ان کے درمیان والی مختصر سی جگہ پر بچی کو لٹا دیا پھر اس کے سنہرے گھونگھریالے بالوں کو سمیٹتے ہوئے اپنے آپ ہی سے بولیں۔

''سنتے ہیں خدا کو اپنے بندوں سے ماں سے کہیں زیادہ پیار ہوتا ہے لیکن یہ اللہ کی مصلحت اللہ ہی جانے کہ وہ کس بندے کے گناہوں کی پاداش میں دوسری معصوم ہستی کو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے اس دنیا میں دھکیل دیتا ہے۔''

''اللہ کا کوئی بھی کام مصلحت سے خالی نہیں ثریا بیگم! وہ کسی کو بھی ناکردہ گناہوں کی سزا نہیں دیتا۔ وہ بندے کا مستقبل ہوتا ہے جو حال کی غلطی بن کر ساری زندگی سزا بھگتنے پر مجبور کر دیتا ہے۔''

ثریا بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن ان کے ہونٹوں پر بڑی پژمردہ سی مسکراہٹ تھی۔

''اس میں بھی تو اللہ کی ہی مصلحت ہوتی ہو گی کہ موت اور زندگی کی آمد ایک ہی لمحہ ایک ہی وقت میں وقوع پذیر ہوں اگر انسان اس کی مصلحتوں پر اتنا ایمان رکھتا ہے تو بندے سے کیوں شکایت؟ اگر کرنی ہے تو خدا سے شکایت کرے۔ معصوم انسان یہ سزا کیوں بھگتے؟'' ان کا لہجہ بڑا تلخ ہو گیا تھا۔ نواب صاحب نے کن انکھیوں سے نزدیک لیٹی ہوئی بچی کی طرف دیکھا۔ پھر ثریا بیگم کی آنکھوں میں چمکتے آنسوؤں کو دیکھ کر کانپ سے گئے۔ ان کا اپنا دل رو اٹھا۔ دوبارہ نظریں جھکیں تو برابر میں لیٹی ہوئی بچی انہی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ان کا دل چاہا اٹھ کر اس کمرے سے ہی نہیں اس گھر سے بھی بھاگ جائیں لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے مقصد کو عملی جامہ پہناتے۔ نادیہ وجاہت علی منہ بسور کر رو پڑی۔

نوابیت کا عالیشان محل...... نفرت کے بلند مینارے اس ننھی سی آواز اور آنسوؤں کے ان دو قطروں کی ٹھیس سے زمین پر آن گرے۔ انہوں نے سر اٹھا کر غور سے بچی کی طرف دیکھا۔ دیکھتے رہے۔ ان کے اپنے اندر دو متضاد جذبات کی جنگ بڑی شدت سے جاری تھی

کہ دوبارہ نادیہ کے رونے کی ننھی سی آواز ان کے کانوں میں آئی۔ وہ تیزی سے اٹھے اور بے اختیار ہو کر بچی کو گود میں اٹھا لیا اس کی پیشانی، رخسار اور ننھے منے ہاتھوں پر بے شمار پیار کر ڈالے۔ ثریا بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ہنسے جا رہی تھیں۔

☆

"نادیہ بیٹی! آج سیر کرنے باہر نہیں گئیں۔ کیا بات ہے؟"

تمام دن کی مصروفیت کے بعد شام کو جب نواب صاحب زنانہ حصے میں آئے تو خلاف معمول نادیہ کو لان کے ایک کونے میں منہ پھلائے ہوئے بیٹھا دیکھ کر پوچھ بیٹھے۔

"یہ بہت شریر ہو گئی ہیں اس لیے سزا کے طور پر ان کی آج کی سیر بند کر دی گئی ہے۔" نواب صاحب کی آمد کی اطلاع ملتے ہی ثریا بیگم باہر آتے ہوئے بولیں، نواب صاحب مسکرا دیئے۔

"اتنا ظلم...... نہیں ثریا زیادتی ہے۔" پھر نادیہ کے قریب جا کر دھیرے سے پوچھا۔

"کیوں بیٹے کیا شرارت کی تھی کہ آپ کی امی حضور اتنی سخت خفا ہیں؟"

"ایسا تو کچھ بھی نہیں کیا تھا بابا جان۔" اس نے کچھ اس قدر معصومیت سے جواب دیا کہ نواب صاحب کے ساتھ ساتھ ثریا بیگم بھی اپنی ہنسی نہ روک سکیں۔ نواب صاحب نے جھک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ پھر پیشانی چومتے ہوئے بولے۔

"تمہاری یہ امی حضور بڑی ظالم ہو گئی ہیں۔ کہو تو دوسری اچھی والی لا دوں؟"

نادیہ کے پھولے سوجے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہاں...... بابا جان لیکن ایسی لائیے گا جو ہمیں کبھی نہ ڈانٹے۔" ثریا بیگم کو ہنسی آ گئی۔ نواب صاحب نے زوردار قہقہہ بلند کیا۔

"سن رہی ہو ثریا تمہاری بیٹی کیا کہہ رہی ہے؟"

"بیٹی کے اس جملے نے تو آپ کو بہت خوش کر دیا ہے نوابوں کو اور چاہیے بھی کیا چاروں طرف اٹھلائی ہوئی آیائیں، اتائیں اور......"

"بس لگ گیا برا۔ ارے بھئی یہ تو محض مذاق تھا۔" انہوں نے بڑے پیار سے ثریا بیگم کے کندھے کو تھپ تھپایا۔

"آپ کا میاں وہ مخصوص قسم کا نواب نہیں ہے جو تین چار شادیاں کر کے عورتوں سے اپنا حرم سرا آباد رکھتا ہے۔"

"چھوڑیئے اس قصے کو۔ مجھے آپ پر فخر ہے اور بھروسہ بھی۔ آپ ذرا اپنی ان لاڈلی سے پوچھئے تو کہ بھلا چھوٹی بہنوں کو بھی کوئی مارتا ہے۔"

"تو یہ بات تھی۔" انہوں نے حیران ہو کر بیٹی کی طرف دیکھا۔

"یہ تو بہت بلکہ بہت ہی بری بات ہوئی بیٹے جان!"

"پھر...... وہ میرے ساتھ کھیلتی کیوں نہیں؟" نادیہ نے اپنے دونوں ننھے منے ہاتھوں میں چہرے کو تھام کر شکایت کی نواب صاحب ہنس دیئے۔

"رانی بیٹی!" وہ اس کو اپنے برابر والی کرسی پر بیٹھاتے ہوئے آہستگی سے سمجھاتے ہوئے بولے۔

"ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے نا۔ بڑا ہونے دو جب آپ کے برابر ہو جائے گی تو خوب کھیلے گی۔"

خدا معلوم یہ نکتہ اس کی سمجھ میں آیا بھی کہ نہیں لیکن کچھ بولنے کے بجائے اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا پسندیدہ بسکٹ اٹھا لیا اور کھانا شروع کر دیا۔

"آپا بیگم کل جا رہی ہیں ثریا۔" نواب صاحب حقائق کی دنیا میں واپس آ گئے۔

"جی ہاں آج صبح ہی انہوں نے مجھے اطلاع بھجوائی تھی۔" ثریا بیگم نے چائے بنا کر پیالی ان کے سامنے رکھ دی۔ "آپا بیگم اور بھائی صاحب کا خیال ہے کہ منصور کو ساتھ لے جائیں اور نازلی کو ہمارے پاس چھوڑ دیں۔"

"نازلی کو ساتھ لے جانے میں کیا قباحت تھی؟" ثریا بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔

"قباحت تو کوئی نہیں تھی، دراصل حکومت نے رشید بھائی کو بیوی اور صرف ایک بچہ لے جانے کی اجازت دی ہے۔ منصور کو جانتی ہو ضدی اور نٹ کھٹ لڑکا ہے۔ اڑ گیا کہ میں ضرور جاؤں گا۔ سو نازلی کو چھوڑنا پڑا۔ ویسے وہ بچی بہت سمجھدار ہے پھر آپ سے مانوس بھی۔ میرا خیال ہے آپ کے پاس خوش رہے گی۔"

"خوش تو رہے گی۔" ثریا بیگم کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ "لیکن ماں باپ کی بات ہی اور ہوتی ہے پھر کبھی ان لوگوں کے بغیر تنہا رہی بھی تو نہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" ان کو بھی یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑی۔

"لیکن آپ کی محبت اور پیار نادیہ کی دوستی اور کھیل کود میں اللہ نے چاہا تو بہل جائے گی۔"

"تو کیا نازلی اب ہمارے پاس رہیں گی بابا جانی؟" نادیہ نے آدھا بسکٹ واپس پلیٹ میں رکھ کر جلدی سے سوال کیا۔

"ہاں...... بیٹی وہ ہمارے ساتھ رہیں گی آپ کو تو مزہ آئے گا نا۔" نواب صاحب اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔" آپ کی پھوپھی حضور لندن جا رہی ہیں۔ اس لیے۔"

"بابا جان...... یہ لندن کہاں ہوتا ہے؟" معصومیت کا سوال تھا نواب صاحب نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"لندن یہاں سے بہت دور ہے۔ ہوائی جہاز پر جانا پڑتا ہے۔ اگلے سال گرمیوں میں ہم لوگ بھی لندن چلیں گے، پھر تم خود دیکھ لینا کتنا دور ہے اور کیسا ہے۔" نادیہ چپ رہی۔ چائے ختم کر کے پیالی واپس میز پر رکھتے ہوئے ثریا بیگم نے پوچھا۔

"آپ انہیں خدا حافظ کہنے ہوائی اڈے نہیں جائیں گے؟"

"ہاں......شاید یہ ممکن نہ ہو سکے۔ شاید میں نہ جا سکوں۔"

"آخر کیوں؟ یہ تو بہت بری بات ہوگی۔" ثریا بیگم حیران رہ گئیں۔

"اس کا تو مجھے بھی اندازہ ہے۔ آپا بیگم بھی اداس ہو جائیں گی لیکن کیا کروں ثریا آج کل سخت مصروفیت ہے۔ بڑی مشکل سے نامعلوم کس طرح وقت نکال کر آپ کے پاس آ جاتا ہوں۔ چلو میری جگہ تم چلی جانا۔" وہ ثریا بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔"نادیہ کو ضرور لے جانا کوشش کروں گا کہ آج کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر ان لوگوں سے ضرور مل لوں۔" وہ کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

ثریا بیگم نے بڑے غور سے ان کے متفکر چہرے کو دیکھا پھر خود بھی کھڑی ہو گئیں۔

"آپ جا رہے ہیں بابا؟" اپنی کرسی پر کھڑی ہو کر نادیہ نے دونوں ہاتھ باپ کی طرف پھیلا دیئے۔ نواب صاحب نے جھک کر اسے پیار کیا پھر بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولے۔

"بیٹے جان! رات کو آن کر گود میں لوں گا۔ بہت سارے پیار کروں گا اور بہت سی

باتیں بھی۔ ابھی اپنے بابا جان کو معاف کر دو۔"

"تم میرے پاس آؤ ننّدی۔ بابا کو پریشان نہیں کرتے۔" ثریا بیگم نے اسے گود میں لے کر کرسی سے اتار لیا۔ نواب صاحب نے مڑ کر ثریا بیگم کو خدا حافظ کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتے زنان خانے سے باہر چلے گئے۔

دوسرے دن عابدہ بیگم معہ اپنے شوہر اور منصور کے لندن کے لیے روانہ ہو گئیں۔ نازلی کو چھوڑتے ہوئے ان کا دل بہت دکھا تھا لیکن مجبوری تھی۔ دوسرے اسے بھائی بھاوج کے پاس چھوڑ رہی تھیں جس کے لیے انہیں یقین تھا کہ ان کی موجودگی میں نازلی ماں باپ کی کمی ہرگز محسوس نہیں کرے گی۔

"آخر وجاہت نہیں آیا نا؟" عابدہ بیگم بھائی کے لیے بے چین تھیں۔ "دراصل وہ آج کل بے حد مصروف ہیں آپا بیگم! ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ آپ کو خدا حافظ کہنے نہ آئیں۔"

"کل ہی رات تو جاتے جاتے مجھ سے وعدہ کر کے گیا ہے کہ میں ہوائی اڈے پر ضرور آؤں گا۔"

ثریا بیگم خاموش تھیں انہیں خود بھی نواب صاحب کا انتظار تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر مسافروں کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ عابدہ بیگم نے آخری بار بے چینی سے باہر کی طرف نظر دوڑائی پھر نادیہ کو گود میں سمیٹ کر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"ننّدی بیٹا! تمہارے لیے نازلی کو چھوڑے جا رہی ہوں۔ دونوں خوب دل لگا کر پڑھنا، خوب کھیلنا۔ لیکن لڑنا ہرگز نہیں۔"

"ممی! ہم دونوں کو نواب ماموں روز گھوڑے کی سواری بھی تو کرائیں گے۔ کل کہہ رہے تھے۔ مزہ آئے گا۔" نازلی ماموں کے پاس رہ جانے پر زیادہ خوشی محسوس کر رہی تھی۔

"اوہو...... بڑی خوشی ہو رہی ہے۔" قریب کھڑا ہوا منصور چڑاتے ہوئے بولا۔ "جس روز بھی گھوڑے سے گریں دونوں لنگڑی ہو جاؤ گی۔"

"بری بات منصور میاں! بہنوں کے لیے ایسی زبان استعمال نہیں کرتے۔" عابدہ نے پیار سے ڈانٹا۔

"منصور بھائی کو وہاں گھوڑا نہیں ملے گا نا۔ اسی لیے تو جل رہے ہیں۔" نادیہ کیوں چپ رہتی۔

"منہ دھو رکھو یہاں سے ہزار گنا اچھا گھوڑا ملے گا۔" منصور نے آنکھ بچا کر نادیہ کے چٹکی لی۔ اسی وقت مسافروں کے لیے دوسرا اعلان ہوا اور عابدہ بیگم اور رشید احمد نے جاتے ہوئے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا، پیار کیا اور اندر چلے گئے۔

☆

آج دو دن کی غیر حاضری کے بعد نواب صاحب زنانہ حصے میں آئے تھے۔ کھانے کے بعد آپا تینوں بچیوں کو سلانے کے لیے ان کے کمرے میں لے جا چکی تھی۔ ثریا بیگم اتنی رات گزر جانے کے باوجود اپنی خواب گاہ میں ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ اچانک جانے پہچانے قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہی نواب وجاہت علی پردہ ہٹا کر کمرے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ ثریا بیگم جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ ان کا چند لمحے قبل کا پژمردہ چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

"مزاج بخیر!"

"خدا کا شکر ہے۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔ رات کا ایک بج چکا ہے۔" یہ لباس تبدیل کیے بغیر ہی اپنی مخصوص آرام دہ کرسی پر لیٹ گئے۔

"بچیاں تو سو چکی ہوں گی۔"

"آپ کا انتظار کرتے کرتے ابھی گھنٹہ بھر پہلے ہی تو سونے گئی ہیں۔" وہ ان کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔ "کیا بات ہے وجاہت؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بہت تھکے تھکے نظر آ رہے ہیں۔" وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"آپ میرے لیے اتنی فکر مند نہ ہوا کریں۔ بس اپنا اور بچیوں کا خیال رکھیں میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ دراصل کل رات بھر کام کی مصروفیت کی وجہ سے سو نہیں سکا۔ اسی لیے چہرے پر تھکاوٹ ہے۔"

"اچھا اب باقی باتیں صبح ہوں گی آپ کپڑے تبدیل کر کے آرام سے سو جائیں۔"

"ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔" وہ اٹھ کر ڈریسنگ روم میں چلے گئے۔ لباس تبدیل کر کے جب واپس آئے تو حسب معمول ان کا چہرہ بشاش تھا۔ سونے کے بجائے بڑی دیر تک وہ ثریا بیگم سے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ نازلی، نادیہ اور فوزیہ کی پڑھائی کے بارے میں پوچھا۔ پھر کچھ رک کر آہستگی سے بولے۔

"آپا بیگم کو گئے ہوئے ابھی مشکل سے دو سال ہی ہوئے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے ان کو دیکھے ہوئے زمانے گزر گئے ہیں۔" ثریا بیگم کو ہنسی آ گئی۔

"آج کھانے پر نازلی بھی یہی کہہ رہی تھی۔ ماں باپ کو بے حد مس کرتی ہے لیکن اس میں بڑا حوصلہ اور قوت برداشت ہے۔"

"آخر کو میری بھانجی ہے نا۔" دونوں ہی ہنس پڑے۔ "ویسے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نازلی بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ وہی تمکنت، ویسی ہی قوت برداشت اور ان کے جیسا ہی بلند حوصلہ۔ محال ہے کہ کسی پر بھی اس کی کمزوری کا اظہار ہو۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ خدا ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔" نواب وجاہت چپ چاپ کچھ سوچتے رہے پھر مسکراتے ہوئے بولے۔

"ان دو سالوں میں منصور تو اور بڑا اور خوبصورت ہو گیا ہو گا۔"

"اللہ نظر بد سے بچائے۔" وہ جلدی سے بولیں۔ "رشید بھائی پر پڑا ہے نا۔" ویسے کتنا بڑا ہو گا؟ اپنی نادیہ آٹھ سال کی ہے اس سے چار سال ہی تو بڑا ہے۔"

"ہاں...... آں۔" ان کو نیند آ رہی تھی لیکن جیسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"میں آپ کو یہ بتانا ہی بھول گیا تھا کہ میں نے بچیوں کے لیے ہوسٹل میں رہنے کا بندوبست کر دیا ہے۔ آپ ان کو ذہنی طور پر آمادہ کر لیجیے گا۔ یہاں رہ کر ان کی پڑھائی بہتر طور پر ہو یہ ناممکن تھا۔ اسی ہفتے ان کو شفٹ کر جانا ہے۔" ثریا بیگم حیران رہ گئیں۔

"لیکن...... آپ نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟ بچیاں سن کر بڑی مایوس ہوں گی۔"

"کئی وجوہات ہیں ثریا بیگم! آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔" وہ پھر لیٹ گئے۔

"ہر ویک اینڈ پر گھر آ جایا کریں گی اس میں مایوسی اور فکر کی تو کوئی بات ہی نہیں۔" ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ "اب مجھے سو جانے دیجیے۔ علی الصبح ہی مجھے چلے جانا ہے۔ بچیوں سے بھی نہیں مل سکوں گا لیکن ان کو میرے بہت سے پیار دے دیجیے گا۔" ثریا بیگم نے اٹھ کر لائٹ آف کر دی اور خود بھی خاموشی سے لیٹ گئیں۔ اگرچہ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور بھاگ چکی تھی۔

سہ پہر چار بجے کے بعد نادیہ، نازلی اور فوزیہ آپا کے ساتھ شام کی سیر کے لیے

جانے کو تیار ہو رہی تھیں۔ثریا بیگم آرام کرسی پر نیم دراز فوزیہ کا سویٹر بننے میں مصروف تھیں کہ دفعتاً نواب صاحب کا خاص ملازم شامو بھاگتا ہوا آیا۔

"بیگم صاحبہ! نواب صاحب یہاں آئے ہیں؟"

"نہیں تو...... کیوں؟" ثریا بیگم گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

"جی...... بس یونہی دفتر میں موجود نہیں تھے میں سمجھا یہاں ہوں گے۔" شامو نے جلدی جلدی جواب دیا اور جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ثریا بیگم نے آواز دی۔

"شامو......کوئی خاص بات ہے؟ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ نواب صاحب خیر یت سے تو ہیں؟"

شاموس ہنس پڑا۔"خدا کا شکر ہے بیگم صاحبہ! آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہے۔" اور بیگم صاحبہ کا جواب سنے بغیر جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس چلا گیا۔

شامو کی بے وقت آمد، اس کی گھبراہٹ اور عجیب و غریب سوالات نے ثریا بیگم کو شدید الجھن اور پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ انہوں نے بیزاری سے ننگ کا سامان ٹوکری میں ڈال دیا۔ بچیاں جا چکی تھیں۔ دل بہلانے کے لیے رسالہ اٹھا لیا۔ اس میں بھی دل نہ لگا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑی دیر تک لان میں خاموش ٹہلتی رہیں۔

رات کھانے کے بعد پڑھنے کے لیے بچیاں اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ثریا بیگم بھی لیٹ گئیں۔ سونے کی کوشش کرتی رہیں، جب کسی صورت بھی نیند نہ آئی تو اٹھ کر بچیوں کے کمرے میں آ گئیں۔ نادیہ نے ہوم ورک کرتے کرتے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا پھر بڑے مزے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"امی حضور! یقیناً آپ یہ دیکھنے آئی ہیں کہ یہ لوگ پڑھ بھی رہے ہیں یا نہیں۔" جواب میں ثریا بیگم مسکرا دیں۔ آیا ان کے لیے کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی لیکن وہ دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے آیا سے بولیں۔

"آیا! نواب صاحب کا خیال ہے بچیوں کو ہوسٹل میں داخل کر دیا جائے۔"

"مگر کیوں؟ بیگم صاحبہ۔" آیا نے حیران ہو کر پوچھا۔ تینوں بچیوں نے بھی حیرانی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"ان کی مرضی۔ شاید بچیوں کی پڑھائی کے خیال سے ایسا کیا ہو کیونکہ سکول سے آنے

کے بعد زیادہ وقت یہ لوگ کھیل کود میں گزار دیتی ہیں۔"

"یہ عمریں تو کھیل کود کی ہی ہوتی ہیں بیگم صاحبہ پھر ان بچیوں کے لیے پڑھنا ایسا ضروری بھی تو نہیں۔ جتنا بھی پڑھ لیں بہت ہے اللہ ان کے سروں پر نواب صاحب کا سایہ سلامت رکھے۔"

"لیکن آیا۔ نواب صاحب کے نزدیک اعلیٰ تعلیم ہر حال میں ضروری ہے۔ پڑھائی کا تعلق امارت، غربت سے نہیں ہوتا اور وہ اس کی طرف سے کسی بھی غفلت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ میں نے آج صبح ہوسٹل انچارج سے بات کی تھی اس نے وعدہ کیا ہے کہ جلد سے جلد کمرہ صاف کروا کر سجا دیا جائے گا۔ فی الحال تینوں کے لیے ایک ہی کمرہ لیا ہے۔" وہ کھڑی ہو گئیں پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولیں۔

"تم کل کسی وقت بھی فون کر کے انچارج سے معلوم کر لینا کمرہ درست ہو چکا ہو تو بچیوں کو لے جانا ہو گا۔"

تینوں بچیوں کے چہرے پژمردہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے نہایت حیرانی سے یہ نیا حکم سنا اور چپ چاپ بیٹھی بنا کچھ بولے ان کو جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔ ان کے ناپختہ ذہن اس سنگین مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکے تھے۔ آخر بڑی دیر کی خاموشی کے بعد نازلی کی ڈوبی ڈوبی آواز ابھری۔

"کیوں آیا۔ ممانی صاحبہ ہمیں ہوسٹل کیوں بھیج رہی ہیں؟"

"اس لیے بی بی کہ وہاں رہ کر آپ لوگ اور اچھی طرح پڑھ سکیں گی۔"

"یہاں پر بھی تو...... دل لگا کر پڑھ لیتے ہیں۔ ہوم ورک کرنے سے پہلے سوتے بھی نہیں ہیں۔" فوزیہ کا چہرہ کملا گیا تھا۔ آیا نے فوزیہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"نا بی بی اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ہوسٹل میں تو بہت مزہ آتا ہے۔ بہت سی دوستیں ہوتی ہیں۔ اچھے اچھے کھیل کھلائے جاتے ہیں۔ پکنکیں ہوتی ہیں۔"

نادیہ نے سر اٹھا کر بڑے غور سے آیا کی طرف دیکھا۔ سب سے بڑی ہونے کے ناتے وہ افسردہ تو نہیں تھی لیکن ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ماں باپ کا یہ غیر متوقع عجیب و غریب فیصلہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ کاپی پنسل ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

"پھر ہم لوگ کب تک چلے جائیں گے؟"

"شاید کل یا پرسوں تک۔" آپا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دھیرے سے سمجھایا۔

"بے بی اتنی پریشان نہ ہو ہوسٹل میں تو بڑا مزہ آتا ہے۔ میں بھی کئی سال ہوسٹل میں رہی ہوں۔"

"سچ..... آپا بی..... آپ بھی ہوسٹل میں رہی ہیں؟ وہاں بہت مزہ آتا ہے۔"

"بہت زیادہ۔ وہاں نہ کوئی ڈانٹنے والا ہوتا ہے نہ کھیل کود سے روکنے والا۔" یکلخت تینوں کے پژمردہ چہروں پر خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔

"پھر تو...... بہت اچھا ہوا خوب مزے آئیں گے۔" فوزیہ تالی بجاتے ہوئے بولی۔

ناد، .اور نازلی بھی کچھ بولنے والی تھیں کہ آپا نے روک دیا۔

"باقی باتیں کل ہوں گی۔ اب آپ لوگ جلدی سے اپنا ہوم ورک مکمل کر لیں۔ رات زیادہ ہو گئی صبح سویرے سکول بھی جانا ہے۔"

دوسرے دن جب آپا نے ہوسٹل انچارج کو فون کیا تو معلوم ہوا کمرہ سجایا جا چکا ہے۔ لہٰذا اسی شام مختصر سے سامان کے ساتھ ثریا بیگم نے تینوں بچیوں کو ہوسٹل روانہ کر دیا۔ روانگی کے وقت تینوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تینوں ہی خاموش تھیں۔ ثریا بیگم میں خود بڑی قوت برداشت تھی۔ نواب صاحب کے اس فیصلے کو انہوں نے خود بھی دل سے قبول نہیں کیا تھا لیکن اس میں ان کی کیا مصلحت تھی وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھیں۔ چلتے وقت انہوں نے تینوں کو سینے سے لگا کر ڈھیر سارے پیار کیے، تسلی دی، کچھ نصیحتیں کیں۔ آپا بھی ان کے ساتھ ہوسٹل گئی تھی تا کہ ان کے سامان کو ترتیب سے رکھ دے۔ ہوسٹل سے واپسی پر اس رات وہ بھی اپنے گھر چلی گئی۔ بچیوں کے بناء اس گھر میں اب اس کا کام بھی کیا رہ گیا تھا۔

☆

ثریا بیگم نے غالباً چوتھا یا پانچواں رسالہ اٹھایا۔ پڑھنے کی کوشش کی لیکن پھر محض اوراق پلٹنے کے بعد بے دلی سے رسالہ میز پر رکھ دیا۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھیں کمرے کی دیواروں پر لگی خاندانی تصویروں اور خوبصورت سینریوں کو دیکھتی رہیں۔ لیکن جلد ہی اس مشغلے سے بھی اکتا گئیں، شال کندھوں پر ڈالی اور کھڑی ہو گئیں۔ نپے تلے قدم اٹھاتی رائٹنگ ٹیبل کے قریب آئیں۔ کیلنڈر پر سرسری نظر ڈال کر کچھ چونکیں۔ "بچیوں کو گئے ہوئے آٹھ دن ہو چکے ہیں۔" انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ خدا معلوم نواب صاحب نے ایسا کیوں کیا۔ کتنا

جان لیوا سناٹا ہے۔ پھر دفعتاً ہی ان کے کانوں میں فوزیہ کی مدھم سی آواز گونجی جو دو دن پہلے فون پر باتیں کرتے ہوئے اس نے کہی تھی۔

"امی حضور! ہمارا دل یہاں بالکل نہیں لگ رہا ہے۔ بابا جان سے کہیے ہمیں بلوا لیں۔"

اس کو تسلی دینے کے بعد وہ خود کتنی بے کل ہو گئی تھیں اس کا اندازہ کسی کو بھی تو نہیں تھا۔ بچیوں کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک ہی ان کا ذہن نواب وجاہت علی کی طرف چلا گیا۔ "آج دس دن ہو جائیں گے وہ گھر نہیں آئے۔ اتنے دن تو کبھی بھی باہر نہیں رہے۔" گھبرا کر انہوں نے پوری کی پوری آنکھیں کھول دیں۔ "اللہ ان کا نگہبان ہو۔ اس روز صبح ہی صبح جاتے ہوئے صرف اتنا ہی تو بتایا تھا کہ بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں زیادہ سے زیادہ تین چار دن لگیں گے اور آج....." وہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئیں ان کا دل دھڑک رہا تھا۔ کٹھن لمحات کے دیو کس آسانی اور دھیرج سے مسرتوں اور سکون کے لمحوں کو نگل جاتے ہیں اس کا احساس وقت کے سینے پر گھڑیال کی پڑتی ہوئی چوٹوں سے ہوتا ہے۔

نواب وجاہت علی کی شاندار حویلی، اونچے اونچے پھاٹک، طویل طویل فصیلیں اور لمبے ستون جن خوشیوں کے عادی ہو چکے تھے، ان کے لیے وقت کی طرف سے دی گئی ہلکی سی چوٹ بھی گہرا گھاؤ ثابت ہو سکتی تھی۔ ان ایوانوں اور ان دیوانوں نے تو صرف شہنائیوں کی آوازیں، پُرمسرت قہقہے اور بچوں کی معصوم صدائیں سنی تھیں۔ انہیں تو خواب میں بھی کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا ہو گا کہ ایک ایسی رات بھی حویلی میں آئے گی جب نواب صاحب کا خاص ملازم شامو بھاگتا ہوا آئے گا اور ثریا بیگم بڑے زبردست صبر و ضبط اور انتہائی حوصلے سے یہ سنیں گی کہ....." ریاست کے عوام باغی ہو چکے ہیں۔ انہوں نے نواب صاحب کو جب وہ گاؤں کے دورے سے واپس آ رہے تھے گرفتار کر لیا ہے۔"

یہ سب کچھ بتانے کے بعد شامو سر جھکائے ان کے قدموں کے نزدیک زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ بہہ کر زمین میں جذب ہو رہے تھے۔ ایک لمحے کے اندر ثریا بیگم محسوسات کی دنیا سے اتنی دور پہنچ گئیں جہاں سے ان کی واپسی ناممکن نظر آ رہی تھی بلکہ اس لمحے وہ واپس بھی نہیں آنا چاہتی تھیں۔ انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، سوائے اس آواز کے "انہیں گرفتار کر لیا ہے۔" شامو نے کھڑے ہو کر کانپتے ہاتھوں سے ایک لفافہ ان کے سامنے کر دیا۔

"بیگم صاحبہ! انہوں نے آپ کے لیے یہ دیا تھا۔" شامو کے ہاتھ میں پڑے ہوئے لفافے اور اس کی کپکپاتی آواز نے انہیں دوبارہ اس حقیقت کی دنیا میں لا پھینکا۔

"شامو۔ تمہارے صاحب خیریت سے تو ہیں؟" وہ اپنے اندر کی تمام شکستگی کو سمیٹ کر بڑے حوصلے سے بولیں۔

"جی...... جی...... ہاں بیگم صاحبہ!" شامو کی کانپتی ہوئی ٹانگیں زیادہ دیر تک اس کا بوجھ نہ سہار سکیں اور وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ثریا بیگم کے قدموں میں گر پڑا۔ انہوں نے جھک کر دونوں بازوؤں سے تھام کر اسے اٹھایا۔

"جو...... بھی...... سچ ہے...... شامو...... مجھے بتا دو۔"

"بیگم صاحبہ!" وہ بلک بلک کر رو پڑا۔ "میرے منہ میں خاک میں کیسے کہوں کہ ان لوگوں نے میرے نواب صاحب کو......" ثریا بیگم نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"بس...... چپ ہو جاؤ شامو...... آگے کچھ مت کہنا۔" انہوں نے لفافہ مٹھی میں بھینچ کر جلتی ہوئی آنکھیں بند کر لیں۔ ان کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ در و دیوار لرز رہے تھے۔ حویلی کی ایک ایک چیز لرز کر ٹوٹ رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ زندگی کا عظیم ترین دکھ۔

وقت کی سب سے بڑی ٹھوکر۔ ایک عورت جو وقت کی دی ہوئی ہزاروں چوٹیں ہنس کھیل کر سہار لیتی ہے یہ چوٹ جو اس کی مانگ سے افشاں اور سر پر سے سہاگ کا دوپٹہ چھین لے اس کا سہارنا اس کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہ وہ پہاڑ ہوتا ہے جس کے تلے دب کر اس کی ساری شخصیت ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی ہے اور یہ بکھرے ہوئے دانے ہواؤں کے دوش پر ہمیشہ بے سہارا ڈولتے رہتے ہیں۔ دفعتاً جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ مٹھی کھول کر لفافہ نکالا۔ جلدی میں لکھی ہوئی یہ ان کے شوہر کی آخری تحریر تھی۔ ان کی بقیہ زندگی کا قیمتی سرمایہ۔

"ثریا بیگم! تم حویلی چھوڑ کر...... کہیں بھی چلی جاؤ...... نازلی کو آپا بیگم کے پاس بھجوانے کا انتظام کر دیا ہے۔ بچیوں کا اللہ نگہبان ہے۔" (وجاہت)

انہوں نے پھٹی پھٹی ویران نظروں سے کئی بار ان دو لائنوں کے پرچے کو پڑھا۔ پھر

ٹوٹی پھوٹی آواز میں اپنے آپ ہی سے بولیں۔ "لیکن وجاہت...... آخر میں کہاں جاؤں؟"

"بیگم صاحبہ! غلام حاضر ہے۔ آپ دیر نہ کریں سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ آپ...... میرے ساتھ چلیں۔"

شامو کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"لیکن...... تم مجھے کہاں لے جاؤ گے مجھے یہیں رہنے دو۔ ممکن ہے نواب صاحب کا خون ہماری رعایا کو خوش اور مطمئن نہ کر سکا ہو...... اس لیے......"

"نہیں بیگم صاحبہ! ہرگز نہیں۔ بچیوں کو آپ کی ضرورت ہے۔" وہ چلا پڑا۔ "خدا کے لیے جلد چلیے۔ وقت بہت کم ہے۔ آپ کی طرف ان ظالموں کی بری نظریں اٹھیں میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ورنہ یاد رکھیے میرا خون آپ کے سر ہو گا۔"

ثریا بیگم نے پتھرائی پتھرائی آنکھوں سے شامو کی طرف دیکھا۔ پھر نامعلوم کیا سوچ کر نظریں جھکا دیں تھوڑی دیر بعد نواب وجاہت علی کی بیگم سیاہ شال میں اپنا چہرہ چھپائے مختصر سی چیزیں ساتھ لیے شامو کے ساتھ پچھلے گیٹ کے چور دروازے سے باہر نکل رہی تھیں۔

☆

"نادیہ بی بی! آپ سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔" نادیہ لیٹے لیٹے اس طرح اچھل پڑی جیسے ہاسٹل کی آیا نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو، آیا کو ہنسی آ گئی۔

"واہ بی بی آپ تو اس طرح گھبرا گئیں جیسے میں نے نا جانے کیا کہہ دیا ہو۔ ان صاحب نے ہی کہا تھا مجھے نادیہ وجاہت علی سے ملنا ہے۔"

"کون ہو سکتا ہے بھلا؟" اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بے ترتیب بالوں کو سمیٹا۔ دوپٹہ ٹھیک کیا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

نواب وجاہت علی کی موت کو چھ سال گزر چکے تھے۔ جس رات رعایا نے باغی ہو کر نواب صاحب کو قتل کر دیا تھا اس کے دوسرے ہی دن رشید احمد کا وکیل نہایت خاموشی سے آن کر نازلی کو ہوسٹل سے لے گیا تھا۔ نازلی اور نادیہ کے پوچھنے پر اس نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ آپ کے ابو نے بلایا ہے۔ آپ کی سیٹ ریزرو ہو چکی ہے۔

"صرف ان کی کیوں وکیل چاچا! میرے اور فوزی کے لیے بابا جانی نے کچھ نہیں

کہا؟'' نادیہ کا سوال وکیل صاحب کے لیے ایک تازیانہ تھا۔ بچیاں باہر کے حالات سے قطعاً لاعلم تھیں۔ وکیل صاحب بتانا بھی نہیں چاہتے تھے۔

''فکر نہ کرو بیٹا بس دو دن کی بات ہے پھر آپ لوگ بھی جا سکیں گی۔'' انہوں نے بہت بڑا جھوٹ بول کر بظاہر ان کی تسلی کر دی تھی لیکن نادیہ اس کی اس اچانک اور غیر متوقع روانگی پر بہت حیران تھی لیکن بچپن کی یہ حیرانیاں، خوشیاں بھی پانی کی لہریں ہوتی ہیں جو آن کی آن میں بنتی اور مٹتی رہتی ہیں۔

اس واقعے کے دوسرے دن جب دونوں بہنیں اپنے کمرے سے تیار ہو کر بیگ اٹھائے کلاس روم میں پہنچیں تو ساتھی طالب علموں کی عجیب عجیب نظروں اور کھسر پھسر نے ایک بار پھر نادیہ کو تذبذب میں ڈال دیا اور ممکن تھا کہ وہ اس ناروا سلوک پر دو ایک کی ٹھکائی کر دیتی کہ چپراسی نے اطلاع دی کہ پرنسپل نادیہ اور فوزیہ بی بی کو آفس میں بلا رہی ہیں۔ نادیہ نے جاتے جاتے پلٹ کر کھا جانے والی نظروں سے اپنی کلاس پر نظر ڈالی پھر بڑبڑاتی ہوئی آپا کے ساتھ ہو لی۔ آفس میں پرنسپل کے علاوہ بھی کئی لوگ بیٹھے تھے لیکن سب کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ہر چہرہ فکرمند نظر آ رہا تھا۔ یہاں بھی اسے اجنبیت، بیگانگی اور چبھتی ہوئی نظروں سے واسطہ پڑا۔ وہ بوکھلا سی گئی۔

''بیٹھ جاؤ'' پرنسپل نے بڑے پیار اور نرمی سے انہیں بیٹھ جانے کے لیے کہا۔

''نادیہ اور فوزیہ بی بی! میں جانتی ہوں آپ دونوں بہت ذہین بچیاں ہیں، اپنی پڑھائی کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ دیتی ہیں، ہر ماہ آپ کی رپورٹ بھی اچھی ہوتی ہے لیکن میرے خیال میں ذہانت کے ساتھ ساتھ بندے کو باہمت اور بلند حوصلہ بھی ہونا چاہیے اور نواب وجاہت علی کی اولاد ہونے کے ناتے تو آپ کو بہت زیادہ ہی بہادر ہونا چاہیے۔ بیٹا یہ سب میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ......'' وہ زرا دیر کو رکیں۔ ان کی نظریں نادیہ اور فوزیہ کے چہروں پر گڑ گئیں۔ جو انجانے خوف سے زرد پڑ گئے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آئیں۔ دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ''گھبراؤ نہیں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں دراصل ہمیں نواب صاحب کا حکم ملا ہے کہ کچھ روز کے لیے آپ دونوں کو گلزار نگر سے باہر بھیج دیا جائے۔ لہٰذا آج رات یہ ہمارے سیکرٹری صاحب آپ کو اپنے گاؤں لے جائیں گے۔ ان کا گاؤں بڑا خوبصورت ہے، وہاں خوب کھیلنا، تفریح کرنا،

درختوں سے توڑ توڑ کر پھل کھانا، گھبرانا بالکل نہیں۔ ایک ہفتے بعد آپ کو بلا لیا جائے گا۔''

''لیکن...... میڈم! امی حضور کی اجازت کے بغیر تو میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' نادیہ نے دھیرے سے بتایا۔ پرنسپل مسکرا دیں۔

''بیٹا! انہوں نے بھی اجازت دے دی ہے۔ بس اب جلدی سے جا کر اپنے کپڑے وغیرہ بیگ میں رکھ لو۔ فوراً جانا ہے اگر دیر ہو گئی تو آپ کے بابا جانی ناراض ہوں گے۔''

''بابا جانی بھی بس عجیب ہی ہیں۔ پہلے یہاں بھیجا، اب کہیں اور بھیج رہے ہیں۔''

ایک ہفتے کے بجائے پندرہ دن بعد جب وہ دونوں اپنے سکول واپس آئیں تو وقت بدل چکا تھا، حالات بدل چکے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود ان کی اپنی زندگی میں اتنی اہم تبدیلیاں آ چکی تھیں جس کا ان معصوموں کو سان و گمان بھی نہ تھا۔

واپسی کے دوسرے ہی روز جب فوزیہ نے گھر جانے کے لیے ضد کی تو مجبوراً پرنسپل کو وہ سب کچھ بتانا پڑا جس کو سن کر فوزیہ کا ننھا ذہن کچھ سمجھ سکا ہو یا نہیں لیکن نادیہ نے یہ ضرور محسوس کیا جیسے کسی نے اسے انتہائی اونچائی سے اٹھا کر نیچے گہرے کھڈ میں پھینک دیا ہو۔ اس کا سارا جسم آگ میں تپ اٹھا تھا۔ ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ بہائے بغیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے صرف پرنسپل کے پریشان چہرے اور دہکتے ہوئے ہونٹوں کو تکتی رہی تھی۔ آخر کچھ دیر بعد ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میڈم! تو کیا ان لوگوں نے ہماری امی حضور کو بھی مار ڈالا؟ ......پر......وہ تو نواب نہیں تھیں۔'' پرنسپل نے آنسوؤں کے ٹوٹتے ہوئے بند کو بہ مشکل روک کر دونوں کو اپنے سینے سے چمٹا کر پیار کر لیا۔

''میری بچیو۔ تمہاری امی حضور ٹھیک ہیں۔ حالات ٹھیک ہو جائیں تو انشاء اللہ جلد ہی آن کر مل لیں گی۔''

پھر یہ چھ طویل اور صبر آزما سال گزر گئے۔ ہر آنے والی صبح انہیں یقین دلاتی کہ آج امی حضور ضرور ملنے آئیں گی لیکن اس صبح کی شام ان کی ساری امیدیں ڈوبتے ہوئے سورج کے ساتھ ہی ڈوب جاتیں۔

اس تمام عرصے میں صرف ایک خط رشید احمد کا پرنسپل کے نام آیا تھا جس میں انہوں نے یہ استدعا کی تھی کہ بچیوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ تعلیمی اخراجات کی فکر نہ کریں، وہ

آپ کو آپ کے حسب منشاء وقت پر ملتے رہیں گے۔ حالات جونہی سازگار ہوئے اور موقع ملا تو ہم دونوں بچیوں کو اپنے پاس بلالیں گے۔ فی الحال نواب صاحب کے کسی بھی رشتے دار کا گلزار نگر آنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے ہم مجبور ہیں۔

وقت نے کب کسی کا انتظار کیا ہے اور کب کسی کے لیے رکا ہے۔ وہ اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نادیہ نے میٹرک پاس کر کے کالج جوائن کر لیا۔ فوزیہ میٹرک میں آ گئی تھی۔

گلزار نگر کی سڑکیں، گلیاں اور مکانات اسی طرح اپنی اپنی جگہ قائم تھے۔ لوگ پچھلے دلخراش دنوں کو بہت حد تک بھلا چکے تھے۔ جنہوں نے نہیں بھلایا تھا وہ بھول جانے کی کوشش میں مصروف تھے لیکن اس اتنے بڑے شہر کی اتنی گنجان آبادی میں دو بچیاں تھیں جو ابھی تک اس سوال کا جواب نہ پا سکی تھیں کہ۔

''بابا جان مار ڈالے گئے...... تو...... امی حضور کہاں گئیں؟ وہ ہم سے ملنے کیوں نہیں آتیں؟ کیا ان کو بھی......؟'' جملے کے آخر پر نادیہ کا دل ڈوب جاتا اس صورتحال کو ماننے کے لیے اس کا ذہن کسی صورت تیار نہیں ہوتا تھا پھر وہ بڑے خلوص سے دعا مانگتی۔ ''اللہ میاں میری امی حضور جیسی ہوں، جہاں کہیں بھی ہوں...... لیکن...... زندہ...... تو ہوں۔''

اور آج چھ سال بعد نادیہ وجاہت علی کا ملاقاتی آیا تھا۔

نادیہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی صوفے کے ایک کونے پر ٹکا ہوا اجنبی بڑی بے صبری سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ نادیہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظر نادیہ پر پڑی۔ وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟'' نادیہ نے بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ دھیرے سے سوال کیا۔

''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں...... تو......''

''جی ہاں میں ہی نادیہ وجاہت علی ہوں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میرا نام مراد خلیل ہے اور کل ہی انگلینڈ سے واپس آیا ہوں۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے پھر؟'' نادیہ کے انداز میں ضرورت سے زیادہ بیگانگی تھی۔

''وہاں پر میں آپ کی پھوپھی پھوپھا کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔''

نادیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا اور تیوریوں پر بل ڈال کر تیزی سے بولی۔

''معاف کیجیے گا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے کوئی پھوپھی پھوپھا نہیں ہیں۔''

مراد نے بڑی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بڑی آہستگی سے بولا۔

''آپ شاید بھول رہی ہیں۔ رشید احمد صاحب، ان کی بیگم عابدہ بیگم۔ ان کا ایک بیٹا منصور رشید ہے اور بیٹی نازلی جو آپ کے ساتھ ہی ہوسٹل میں رہا کرتی تھی۔ انہوں نے آپ کے نام یہ خط بھی دیا ہے۔'' وہ بڑے طنزیہ انداز سے مسکرائی۔ پھر مراد کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے لفافہ لے کر نہایت بیزاری سے مٹھی میں دبا لیا۔ مراد حیران و پریشان تھا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ کیا واقعی میں غلط جگہ پر آ گیا ہوں۔ یہ لڑکی وہ نہیں ہے جن کا وہ لوگ ذکر کرتے تھے لیکن وہ تو کہتے تھے نادیہ وجاہت علی ان کی سگی بھتیجی ہے اور یہ......

''آپ...... نادیہ وجاہت علی ہی ہیں نا؟ میرا مطلب نواب وجاہت علی کی بڑی بیٹی؟''

وہ غیر یقینی کی حالت سے نکل جانا چاہتا تھا۔

''جی ہاں...... اس میں کسی بھی شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔

مراد نے کچھ رک کر دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

''وہ...... لوگ...... آئندہ سال وطن واپس آ جائیں گے۔ اس لیے بھی کہ صاحبزادہ منصور بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر چکیں گے۔''

''ہوں...... اچھا۔'' وہ سامنے میز پر پڑے رسالے کے ورق پلٹتی رہی۔ ان خبروں میں نہ اس کو دلچسپی تھی نہ ہی ان میں کوئی اہمیت نظر آ رہی تھی۔

''آپ کو وہ لوگ یاد نہیں آتے حالانکہ وہ سب تو آپ کو اور آپ کی بہن کو بہت یاد کرتے ہیں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''آپ میرے اس برتاؤ پر فکر مند نہ ہوں۔ میں اس حد سے گزر چکی ہوں جہاں پر انسان اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں اور رشتے داروں کے بارے میں سن کر خوشی سے پاگل ہو اٹھتا ہے دراصل......'' وہ اس کی طرف جھک کر بڑے صاحبانہ انداز میں بولی۔ ''رشتے دار وہی تو ہوتے ہیں مراد صاحب جو ایک دوسرے کی تکلیف پر اپنا آپ بھلا کر تڑپ اٹھیں۔ بے تعلقی اور بیگانگی تو غیروں اور بیگانوں کا حصہ ہوتی ہے۔''

مراد کا اٹھا ہوا سر جھک گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کی باتوں کا جواب دے بھی تو کیا دے۔ غالباً اپنوں کی دی ہوئی تلخیاں انسان کو اتنا ہی تلخ بنا دیتی ہیں۔ ماں باپ کی موت تو ایک ناقابل برداشت بوجھ ہوتا ہے اگر اس بوجھ کو اپنے بھی شیئر نہ کریں تو بندہ کس سے شکایت کرنے جائے گا۔ تم اپنی جگہ ٹھیک ہی ہو نادیہ وجاہت علی واقعی چھ سال تک بنا کسی سرپرست کے جن بچیوں نے صرف استادوں کے سہارے زندگی گزار دی ہو ان کے لیے رشتے دار لفظ ہی پتھر ہے جو خون کر دینے کے لیے کافی ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بے ہنگم سوچوں میں گم تھا۔ آخر کچھ دیر کی ناقابل برداشت خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا۔

"آپ کی والدہ کا کچھ پتا چلا؟"

"جی نہیں۔" اس نے پتھر سا کھینچ مارا۔ پھر اپنے لہجے کی سختی کو خود ہی محسوس کر کے آہستہ سے بولی۔

"اگر وہ زندہ ہیں تو آپ دعا کیجیے گا کہ ایک بار میں ان کو ضرور دیکھ سکوں۔ اس لیے کہ ماں کا کوئی نعم البدل نہیں۔ لفظ ماں میں جو محبت چھپی ہوتی ہے وہ تو صرف خدا کے پاس ہوتی ہے میں اس کو محسوس کرنا چاہتی ہوں اسی کو پانا چاہتی ہوں۔"

ڈاکٹر مراد کا دل کانپ اٹھا۔ جس اطمینان، نرم لہجے اور مسکراتے ہونٹوں سے اس نے یہ جملے ادا کیے تھے وہ پتھر سے پتھر دل کو بھی پگھلا دینے کے لیے کافی تھے۔

"میری۔" وہ بے حد ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سب سے بڑی دعا یہی ہو گی مس وجاہت علی کہ آپ کی والدہ جہاں بھی ہوں نیک ہوں اور خدا کرے کہ آپ لوگ جلد ہی ان سے ملاقات کر سکیں۔"

"شکریہ۔" وہ نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ مراد نے نظریں اٹھا کر بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے بولا۔ "آپ یقین کریں آپ کی پھوپھی اور پھوپھا آپ دونوں کو بہت یاد کرتے ہیں لیکن مجبور ہیں۔"

نادیہ کے رخسار تمتما اٹھے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

"آپ انہیں اطلاع دے دیجیے گا کہ ہم دونوں خیریت سے ہیں۔"

"لیکن...... کیا آپ انہیں خط نہیں لکھیں گی؟"

وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ "چھ سال کا طویل راستہ طے کر کے ہمارے کسی رشتے دار کا یہ خط آج ہم تک پہنچا ہے۔ ممکن ہے ہمارے جواب کو بھی ان تک پہنچنے کے لیے اتنے ہی دنوں کا فاصلہ طے کرنا پڑے۔"

مراد کو ہنسی آ گئی۔ محرومیاں انسان کو کچھ ایسا ہی بنا دیتی ہیں اس نے سوچا۔ "آپ کا یہ رنج اور غصہ بجا ہے لیکن وثوق سے یہ تو نہیں کہہ سکتیں کہ اس عرصے میں ان لوگوں نے آپ کی کوئی خبر نہیں لی۔"

"حقیقت کبھی نہیں جاتی خود بخود سامنے آ جاتی ہے۔" وہ بولی۔

"مانتا ہوں لیکن اگر آپ میری بات پر اعتبار کریں تو یقین مانئے ان لوگوں نے ہمیشہ کسی نہ کسی ذریعے سے آپ لوگوں کی خیریت ضرور معلوم کی ہے۔ براہ راست آپ سے تعلق رکھنا انہوں نے آپ ہی کے حق میں بہتر نہیں سمجھا۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب، میں بھی کتنی بد اخلاق ہوں اتنی دیر سے آپ بیٹھے ہیں اور میں نے چائے اور شربت تک کے لیے آپ کو نہیں پوچھا۔"

"شکریہ مس وجاہت۔ میں چائے پیتا نہیں اور شربت کی کوئی خواہش نہیں ہے۔" وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ "معاف کیجیے گا میں نے آپ کا قیمتی وقت برباد کیا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں فری تھی ورنہ اتنی لمبی چوڑی گفتگو کبھی نہ کرتی۔"

وہ مسکرا دیا۔ "خیر میں آج کل گلزار نگر ہی میں ہوں۔ یہ رہا میرا کارڈ اور فون نمبر اگر کبھی آپ میری ضرورت محسوس کریں تو نمبر ڈائل کر لیجیے گا۔"

"شکریہ...... ڈاکٹر صاحب!" نادیہ نے ہاتھ بڑھا کر کارڈ لے لیا اور اسی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ سامنے سے فوزیہ ریکٹ ہاتھ میں لیے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی نادیہ کو پہلی بار کسی اجنبی کے ہمراہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"ادھر آؤ فوزی۔" نادیہ نے آواز دی۔

"یہ میری چھوٹی بہن فوزیہ وجاہت علی ہے۔" نادیہ نے مراد سے تعارف کرایا۔

"فوزی یہ ڈاکٹر مراد ہیں کل ہی انگلینڈ سے آئے ہیں۔"

"انگلینڈ سے؟" فوزیہ چونکی پھر قریب آ کر بڑی بے چینی سے سوال کیا۔ "تو کیا آپ میری پھوپھی حضور سے ملے ہیں؟ کیسی ہیں وہ؟" مراد نے نظریں اٹھا کر نادیہ کی طرف

دیکھا ایک ماں کی دو اولادیں اور دونوں میں کتنا تضاد تھا۔ اسے اچنبھا ہوا۔ جواب دینے والا تھا کہ نادیہ کی آواز آئی۔

"فوزیہ! کمرے میں جاؤ غسل لے کر لائبریری میں آجانا میں وہیں ہوں گی۔" جاتے جاتے پلٹ کر فوزیہ نے استفسارانہ انداز میں مراد کی طرف دیکھا۔ پھر بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"خدا حافظ مس وجاہت۔"

"خدا حافظ۔" جواب میں ہاتھ ہلا کر وہ بھی اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

وقت کا تند و تیز دھارا اپنے ساتھ کتنے حادثات، کتنے واقعات اور کتنی زندگیوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اس کا اندازہ حال کی پُرسکون موجوں سے لگانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ سمندر بظاہر بڑا پُرسکون نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر کتنے طوفان چھپے ہوتے ہیں اس کا پتا اس وقت چلتا ہے جب ہوا کے تھپیڑے اس کی سطح پر تازیانے لگاتے ہیں۔ بپھری ہوئی لہریں راستہ کی ہر رکاوٹ بہا کر لے جاتی ہیں۔ ہر شے تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ محض کھنڈر رہ جاتے ہیں۔ انسان بھی عجیب چیز ہے وہ یا تو ماضی کی یادوں سے چمٹا رہتا ہے یا یکسر بھلا دیتا ہے۔ حال کو کون اہمیت دیتا ہے۔ بس مستقبل کے حسین خوابوں کی ڈور تھامے اسے پا لینے کی دھن میں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ کچھ اس جدوجہد میں ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں کچھ کو فالتو سمجھ کر توڑ دیا جاتا ہے اور کچھ وہ سب پا لیتے ہیں۔ جس کی انہیں امید بھی نہیں ہوتی۔

گلزار نگر کی اس چھوٹی سی ریاست کے نواب اب اشرف علی خان تھے۔ وہی اشرف علی جو ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے ترقی کر کے نواب وجاہت علی کی فوج کے کمانڈر انچیف بنے۔ عوام کی بغاوت، قتل و غارت گری پھر نواب وجاہت علی کا زوال اور خاتمہ یہ سب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ نواب صاحب کو بچانے کے لیے انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی لیکن لہریں جب بپھر جائیں، عوام بے سوچے سمجھے ہی سبھی ہاتھوں میں ہتھیار لے کر نکل آئیں اس لمحہ کوئی طاقت ان کا راستہ نہیں روک سکتی ہر شے تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ محض کھنڈر رہ جاتے ہیں۔ اس وقت ان کھنڈروں کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر انہوں نے قسم کھائی تھی کہ ظالموں سے بدلہ ضرور لیا جائے گا۔ اب چھ سال بعد وہ اس ریاست کے نواب تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے آقا اور اپنے

عزیز دوست کے اقتدار کے عالیشان مینارے کو گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لہٰذا چھ سال کے اذیت ناک لمحات کے بعد یہ بدلہ لے لیا گیا۔ باغیوں کو شدید ترین سزائیں دی گئیں، بے گناہ لوگوں کو پناہ دی گئی۔ آخر دھیرے دھیرے گلزار نگر کی سیاسی پیچیدگیاں سلجھتی چلی گئیں۔

ریاست میں وہی پرانا کھویا ہوا سکون اور اطمینان واپس آ گیا۔

اشرف علی خان کے ایماء پر اور حالات کے بہتر ہوتے ہی عابدہ بیگم اور رشید احمد انگلینڈ سے واپس آ گئے۔ انہیں اب یہاں کی سیاست سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ انہیں اس کی بھی فکر نہیں تھی کہ ان کے آبائی عالیشان محل میں کون ہے؟ آیا اس کا وجود ہے بھی یا نہیں؟ وہ لوگ تو گلزار نگر محض اس لیے آئے تھے کہ وہاں کے ہوسٹل میں نادیہ اور فوزیہ تھیں۔ جن کو نواب صاحب کی اولاد ہونے کی یہ سزا ملی تھی کہ چھ سال سے اپنے تمام رشتہ داروں سے لاتعلق تھیں۔ کسی نے بھی اس عرصے میں براہ راست ان سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب عابدہ بیگم محض اس خیال سے آ گئی تھیں کہ بھائی کی ان نشانیوں کو اپنے ساتھ لے جائیں اور ریاست کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔

ثریا بیگم کے متعلق کوئی بھی ایسی اطلاع کوشش کے باوجود نہیں مل سکی تھی۔ وہاں کا کوئی بھی فرد وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آیا وہ زندہ بھی ہیں یا باغیوں نے ان کو بھی......

گھر کے سارے ملازم یا تو بھاگ چکے تھے یا مار دیئے گئے۔

ہوسٹل پہنچ کر عابدہ بیگم نے جب نادیہ سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو وہ خوش ہونے کے بجائے خاموش ہو گئی۔ عابدہ بیگم کو اس کی خاموشی اور چہرے پر پھیلی ہوئی بیزاری کو دیکھ کر تعجب تو ہوا لیکن حالات کے تحت نظر انداز کر گئیں۔

''نادیہ کیا سوچنے لگیں بیٹا؟'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں پھوپھی حضور!''

''میں نے تمہاری پرنسپل سے بات کر لی ہے۔ لندن میں تم لوگوں کے داخلہ کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔ اپنا سامان پیک کر لو۔ کل شام کی فلائٹ سے ہم لوگ روانہ ہو جائیں گے۔''

''لیکن...... پھوپھی حضور۔'' چند منٹ بعد نادیہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ''میں گلزار نگر چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ آپ لوگ جائیں۔ ہم اپنی تعلیم

مکمل کر کے خود ہی آ جائیں گے۔'' اس صاف جواب پر عابدہ بیگم حیران رہ گئیں۔

''ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا نادیہ! چھ سال تک تو مجبوراً ہم لوگ صبر کرتے رہے کہ مجبور تھے اب تم لوگوں کو ہوسٹل میں نہیں چھوڑ سکتی۔'' نادیہ کو ہنسی آ گئی۔

''اس میں حرج ہی کیا ہے پھوپھی حضور! پہلے آپ لوگ مجبور تھے اب ہم مجبور ہیں۔ جہاں اتنے سالوں صبر کرتی رہیں تھوڑا اور کر لیجیے چند اور سالوں کی تو بات ہے۔'' برداشت کے باوجود اس انداز گفتگو پر عابدہ بیگم کو غصہ آ گیا۔

''یہ میرا حکم ہے نادیہ! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اب اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔''

فوزیہ جو بڑی دیر سے خاموش کھڑی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ پھوپھی کی تیوریوں پر بل دیکھ کر جلدی سے بولی۔

''پھوپھی حضور کا کہنا مان لیجیے آپی! وہ ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔''

نادیہ نے پلٹ کر حیران حیران نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔ اسے تعجب بھی ہوا اور شدید دکھ بھی وہ فوزیہ جو کل تک خاندان والوں سے بیزار تھی۔ جن کی سخت دلی کی شکایتیں کرتی تھی آج ہوسٹل کی پابندیوں اور تکلیفوں سے اکتا کر چلا جانا چاہتی ہے۔ انسان بھی کتنا نادان اور عیش پسند ہوتا ہے۔ کتنی جلدی اپنوں کے دیئے ہوئے زخموں کی ٹیسوں کو بھول جاتا ہے اس اچانک دکھ نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

''فوزی ڈیئر اگر تمہارا دل چاہتا ہے تو میری وجہ سے نہ رکو، تم خوشی سے جا سکتی ہو۔'' نادیہ نے گردن جھکا کر دھیرے سے کہا۔

فوزیہ بے چین ہو گئی۔ ''اور آپ...... آپ نہیں جائیں گی؟''

''نہیں۔'' اس کے ایک ایک لفظ میں بڑا عزم تھا۔ ارادہ کی پختگی تھی۔

عابدہ بیگم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ چند منٹ تک خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہیں یا شاید اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ وجاہت کی بیٹی میرا حکم اس آسانی سے ٹال دے گی۔''

''پھوپھی حضور!'' نادیہ ان کی خفگی کی پروا کیے بغیر بڑے رسان سے بولی۔

''میں جانتی ہوں میرے انکار نے آپ کو دکھ پہنچایا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بابا جانی نے زندگی بھر کبھی آپ کا کوئی حکم نہیں ٹالا لیکن میں بہت مجبور ہوں۔ جب تک میری

امی حضور کا پتا نہیں چل جاتا اس وقت تک میں کسی بھی حالت میں اس سرزمین کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تم سے زیادہ ہمیں تمہاری ماں کی فکر ہے نادیہ بیگم! بھائی کے بعد اب بھاوج ہی ہماری عزت اور دولت ہے۔"

"پھر بھی۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ آپ مجھے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کریں۔" نادیہ نے بے چین ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پھوپھی کی گردن میں ڈال دیئے۔

"آپ ناراض مت ہوں۔ میں اپنا کالج، اپنا وطن چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی۔ کہیں نہیں جا سکتی۔ یہاں رہ کر، یہاں کی سڑکوں پر پھرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری امی حضور میرے ساتھ ساتھ ہیں۔ یہاں کی ہر چیز سے مجھے ان کی خوشبو آتی ہے پھوپھی حضور!" اس نے انتہائی ضبط کی کوشش میں آنکھیں بند کر کے اپنا سر پھوپھی کے کندھے پر رکھ دیا۔ "آپ..... فوزیہ کو اپنے ساتھ ضرور لے جائیں۔" عابدہ بیگم کی اپنی پلکیں نم آلود ہو گئی تھیں۔ انہوں نے بڑی آہستگی سے اس کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا۔ چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیشانی چوم لی۔ پھر اسے نظر انداز کرتے ہوئے فوزیہ سے مخاطب ہوئیں۔

"تم اپنا سامان پیک کر لو گھنٹہ بھر بعد میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ اس لیے کہ کل شام کی فلائٹ سے جانا ہے۔"

"میں تمہاری پرنسپل سے مل کر آتی ہوں اب انہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ صرف تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔" اور دونوں میں سے کسی کے بھی جواب کا انتظار کیے بغیر ہی وہ تیزی سے باہر چلی گئیں۔

"آپی۔" ان کے جاتے ہی فوزیہ نے بہن کے نزدیک آ کر بڑے پیار سے پکارا۔

"ہوں۔ کہو۔" نادیہ نے پلٹ کر غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ بھی چلیں نا۔" اس نے منت کی۔

"کیوں بھلا؟" نادیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ..... آپ کے بغیر میں کیسے رہوں گی۔ میرا دل نہیں لگے گا اور اگر نہیں جاؤں گی تو..... پھوپھی حضور اور ناراض ہوں گی۔"

فوزیہ کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو تیر رہے تھے۔ نادیہ نے اسے گلے سے لگا کر

آنکھیں چوم لیں۔

"میری جان!..... اتنی پریشان مت ہو۔ خوشی خوشی جاؤ وہاں پھوپھی حضور ہیں نازلی ہے سب تمہارا بے حد خیال رکھیں گے۔"

"لیکن..... آپ یہاں اکیلی کیسے رہیں گی؟" وہ سچ مچ ہی رو پڑی۔

"پگلی اکیلی کب ہوں۔ یہاں اتنے سارے لوگ موجود ہیں۔ یہ سب ہمارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ کتنی محبت کرتے ہیں۔ پھر میں ان نام نہاد سہاروں کے بغیر زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ بس تم آرام سے اور خوشی خوشی پھوپھی حضور کے ساتھ جاؤ۔ ہاں اپنی پڑھائی کا خیال رکھنا اس لیے کہ بابا جانی اور امی حضور کو سب سے زیادہ ہماری پڑھائی کی فکر رہتی تھی۔"

فوزیہ نے آہستگی سے اپنے کندھے پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ ہٹایا اور خاموشی سے اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا یہ نادیہ وجاہت علی ہے جو ایک بار کوئی بات کہہ دے تو اس سے پھر جانا جیسے خود اس کے اپنے بس میں بھی نہیں رہتا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بابا جانی کی موت اور امی حضور کی گمشدگی کے بعد عزیزوں کی لاتعلقی نے اسے کسی حد تک خود سر، ضدی اور غصہ ور بنا دیا ہے۔ اسے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ تھا جو اتنی غصہ ور، ضدی اور خود سر ہے جو بظاہر کسی بھی سہارے کی پروا نہیں کرتی۔ وہ کبھی کبھی کسی بہت اپنے عزیز کے لیے تاریک راتوں میں اس سے اور خود اپنے آپ سے چھپ کر اتنا روتی ہے۔ اتنا کہ..... فوزیہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نادیہ کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگائے خاموش کھڑی باہر تکے جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس کا دل چاہا وہ ابھی جا کر پھوپھی حضور سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی آپی کو چھوڑ کر ان کے ساتھ نہیں جا سکتی لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہناتی عابدہ بیگم تیزی سے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"فوزیہ..... سامان پیک کر لیا؟"

"جی۔" اس نے سہم کر پھوپھی کی طرف دیکھا پھر ایک التجا آمیز نظر نادیہ پر ڈالی جیسے کہنا چاہ رہی ہو۔ "خدا کے لیے آپی آپ کہہ دیں میں فوزیہ کو نہیں جانے دوں گی۔"

لیکن نادیہ ان دونوں سے بے نیاز کھڑکی سے ٹیک لگائے باہر کھیلتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھے جا رہی تھی۔

"پھوپھی حضور!" آخر فوزیہ جیسی کم ہمت لڑکی نے بھی ہمت باندھی لیکن جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی عابدہ بیگم کی آواز نے اس کی رہی سہی ہمت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے وہ کہہ رہی تھیں۔

"ڈرائیور اندر آ کر بی بی کا سامان اٹھالو۔"

فوزیہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پھوپھی کی طرف دیکھا۔ عجیب سی بے بسی تھی اس کی نظروں میں لیکن وہ اس کے احساسات اور جذبات سے بے نیاز ہو کر یکطرفہ فیصلے کیے جا رہی تھیں۔

"پھوپھی حضور! میں آپی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔"

کسی مشینی قوت کے تحت الفاظ کھٹا کھٹ اس کے منہ سے نکلتے چلے گئے۔

"فوزیہ!" عابدہ بیگم کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ غصے سے چلا پڑیں۔

"بس آگے ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔ نادیہ نے جس ناسمجھی کا ثبوت دیا ہے وہی حماقت تم بھی کرنا چاہتی ہو۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔"

پھوپھی کی تیز آواز نے نادیہ کو چونکا دیا وہ جلدی سے مڑ کر ان کے نزدیک آ گئی۔

"کیا ہوا۔ پھوپھی حضور؟" اس نے اس قدر معصومیت سے یہ سوال کیا کہ عابدہ بیگم ایک لمحے کے لیے اپنا سارا غصہ بھول گئیں۔ پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

"یہ مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ کیا ہوا؟ یہ سوال تو تمہیں اپنے آپ سے کرنا چاہیے تھا۔ ٹھیک ہے اگر فوزیہ بھی میرے ساتھ جانا نہیں چاہتی تو نہ جائے لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وجاہت کی اولادیں اتنی نافرمان ہوں گی۔"

نادیہ مسکرا دی۔ بڑے پیار سے پھوپھی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

"آپ تو بہت ناراض ہوگئیں پھوپھی حضور! فوزیہ بہت جذباتی ہے۔ شاید اسے میرا خیال آ گیا ہوگا۔ ورنہ یقین مانیں وہ تو بہت خوشی سے آپ کے ساتھ جا رہی ہے۔ فوزی تم جاؤ۔ میں بھی کچھ دن بعد آ جاؤں گی۔"

فوزیہ نے مجبور ہو کر خاموشی سے گردن جھکا لی اب وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔

"آپی..... آپ جلدی آئیں گی نا؟" وہ دونوں ہاتھ اس کے گلے میں ڈال کر لپٹ گئی۔

"ہاں فوزی! بہت جلدی تم بالکل پریشان نہ ہونا۔" نادیہ نے اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی اور بالوں کو بہت سارے پیار کر ڈالے۔ عابدہ بیگم بہت ناراض تھیں لیکن جانے سے پہلے نادیہ کو گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"آج میرا کہا نہ مان کر تم نے بڑا دل دکھایا ہے نادیہ! پھر بھی جس وقت اور جب بھی دل چاہے پھوپھی کے پاس آ جانا، میں انتظار کرتی رہوں گی۔"

جواب میں نادیہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ کچھ کہہ کر وہ پھوپھی کو مزید ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

☆

دن بھر لگاتار کلاسز اٹینڈ کرنے کے بعد چار بجے کے قریب وہ تھکی تھکائی اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ گیلری کی سیڑھیوں پر آیا نے اسے روکا۔

"بی بی! ایک صاحب آپ سے ملنے آئے تھے۔ وہ یہ کارڈ دے گئے ہیں۔"

"اچھا۔" نادیہ نے کارڈ لے کر نام پڑھا۔ پھر آیا سے بولی۔ "تم نے انہیں بٹھایا کیوں نہیں؟"

"میں نے کہا تھا لیکن وہ صاحب مانے ہی نہیں۔ اس وقت آپ کلاس میں تھیں۔"

"اچھا خیر۔" وہ ہونٹ سکیڑ کر مسکرا دی اور جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر پہنچ گئی۔ کمرے میں جاتے ہی کتابیں میز پر پٹخ کر اس نے ایک بار پھر کارڈ پر نظر ڈالی۔ پشت پر لکھا تھا۔ "میں گلزار نگر چھوڑنے سے پہلے آپ سے ملنے آیا تھا۔ لیکن پتا چلا آپ کلاس اٹینڈ کر رہی ہیں۔ اس لیے ملاقات نہ ہوسکی۔ پھر سہی۔ خدا حافظ۔ مراد۔"

"لو..... بھلا پھر میں کیا کروں؟" اسے مراد کی حماقت پر ہنسی آ گئی۔ کارڈ میز پر ڈال کر کپڑے تبدیل کیے بغیر ہی وہ مسہری پر اوندھی لیٹ گئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی اسے فوزیہ کا خیال آ گیا۔ اللہ جانے کیسی ہوگی، خوش یا افسردہ؟ گئے ہوئے بھی تو مہینہ بھر سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اس عرصے میں اس کا صرف ایک ہی خط آیا ہے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھوپھی حضور۔ تنہائی میں اپنے آپ ہی مسکرا دی۔ وہ تو اپنی خفگی میں وجاہت کی بیٹی کو بالکل ہی بھول گئیں۔ اسی لمحے پردہ ہٹا اور اس کی دوست اور روم میٹ مریم اندر داخل ہوئی۔

"نادیہ بیگم! پانچ بج چکے ہیں۔ ہال میں چائے پر سب انتظار کر رہے ہیں۔"

اس نے چونک کر کروٹ بدلی اور مریم کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔

"اور نادیہ بیگم اس وقت یہ سوچ رہی ہیں کہ چائے بھی اگر اس وقت تمہارے ہی ساتھ چلتی ہوئی یہاں آ جاتی تو...... کتنا اچھا ہوتا۔"

"خدا کی پناہ آخر تم روز بروز اتنی کاہل اور سست کیوں ہوتی جا رہی ہو؟" مریم نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹ کر اٹھا دیا۔ "چلو...... جلدی سے اٹھو اور اپنا یہ چوکھٹا ٹھیک کرو۔"

"چھوڑو بھی مریم۔ چوکھٹا ٹھیک ٹھاک ہے۔" اس نے نہایت بیزاری سے بال پیچھے کیے اور کھڑی ہوگئی۔ "چائے ہی تو پینے جانا ہے کوئی تمہارا بیاہ تو اٹینڈ نہیں کرنا ہے۔" مریم کو ہنسی آ گئی۔

"لیکن...... چائے پینے کے لیے اگر اجاڑ صورت کو زیادہ بہتر بنا لیا جائے تو گناہ تو نہیں۔"

"میں بہت تھک گئی ہوں مریم! آج کے دن کا ٹائم ٹیبل بیزار کر دیتا ہے۔"

"تمہاری مرضی...... لڑکیاں سوچیں گی۔ ڈانٹ کھا کر آ رہی ہے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔"

دونوں باتیں کرتی ہوئی ڈائننگ ہال میں آ گئیں۔ چائے کا وقت تقریباً ختم ہونے والا تھا۔ لیٹ ہونے پر میٹرن کی گول گول آنکھوں نے انہیں گھورا۔

"ان گولیوں نے تو جیتے جی مار ڈالا۔" نادیہ جلدی سے مریم کے پیچھے ہو گئی۔ مریم نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کچھ فاصلے پر کھڑی میٹرن پر نظر پڑتے ہی اس کا سر بھی جھک گیا۔ قریب ہی پڑی خالی کرسیوں پر دونوں دھنس گئیں۔ دونوں نے نہایت خاموشی سے چائے ختم کی۔ دو چار بسکٹ کھائے اور آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

"نادیہ! کل کے میچ کی تیاری بھی کی یا نہیں؟" اچانک مریم نے سوال کیا۔

"شکست دینا ہے نا سو دے دی جائے گی۔ فکر کیوں کرتی ہو۔" نادیہ نے اس قدر اطمینان سے جواب دیا کہ مریم جل گئی۔

"جناب کو بڑی خوش فہمی ہے۔ اکثر یوں اترانے والے ہار ہی جاتے ہیں۔"

نادیہ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پیالی جلدی سے پرچ پر رکھ دی۔ "دیکھو مریم اگر یہ

پیالی ہوسٹل کی نہ ہوتی اور سامنے یہ گول گول دیدے والی میٹرن بھی نہ ہوتی تو یقیناً یہ تمہارے سر پر ٹوٹتی۔" مریم زور سے ہنس پڑی۔

"آ گیا نا جلال۔ اچھا نادیہ وجاہت علی صاحبہ گستاخی معاف۔ آپ کو بھلا کون ہرا سکتا ہے۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ چائے ختم ہو چکی تھی۔ ہال بھی تقریباً خالی ہو چکا تھا لہٰذا وہ دونوں بھی اٹھ کر باہر آ گئیں۔

باہر دور دور تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے لان اور خوشنما رنگ برنگے پھول۔ شام کی ہلکی زرد دھوپ میں نہا رہے تھے۔ سینکڑوں چڑیاں اپنے اپنے اہل خانہ کے ساتھ بسیرے کے لیے آشیانوں کی طرف اڑی چلی جا رہی تھیں۔ نادیہ نے مریم کا ہاتھ تھاما اور لان کے آخری سرے پر آ کر گھاس پر لیٹ گئی۔

"نہ جانے وہ کون کمبخت تھا۔ جس نے امتحانوں کا جان لیوا طریقہ ایجاد کر کے ہم سب کی مصیبت کر دی۔"

"لیکن امتحانوں کے بعد جو سکون اور خوشی محسوس ہوتی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ نادیہ وجاہت علی صاحبہ!"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن انسان کو ہمیشہ حال کی فکر کرنا چاہیے۔ مستقبل تو خود بخود سنور جاتا ہے۔" مریم کو ہنسی آ گئی۔

"حقیقت سے فرار کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہے کہ بندہ فلسفہ بگھارنے لگے۔"

"یہ تو ہماری اپنی زندگیوں کا فلسفہ ہے مائی ڈیئر اس سے تو کوئی بھی منکر نہیں ہو سکتا۔"

"کون کافر انکار کر رہا ہے لیکن اس وقت گفتگو تو کسی اور موضوع پر ہو رہی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے موضوع امتحانات تھے۔ اچھا اب چھوڑو ان امتحانوں کو یہ بتاؤ غالباً کیا یقیناً فوزیہ کا اتنے دنوں سے کوئی خط نہیں آیا؟"

"آں...... ہاں...... مصروف ہو گی۔" نادیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ یادیں بڑی ظالم ہوتی ہیں اس وقت مریم کے کہنے پر اسے زبردست طریقے سے فوزیہ کی یاد آ گئی تھی۔

"فوزیہ کے علاوہ اب اس دنیا میں میرا ہے بھی کون۔" اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔

"میری بات مانو۔" مریم نے کندھے پکڑ کر اسے جھنجھوڑ دیا۔

"امتحانوں کے بعد تم پھوپھی حضور کے پاس چلی جاؤ۔ وہ دونوں خوش ہو جائیں گی

اور تمہاری یہ قنوطیت بھی ختم ہو جائے گی۔"

"سوچوں گی۔ ضروری نہیں ہے۔" نادیہ کے لہجے میں بڑا تناؤ تھا۔

"ہر بات میں بچوں کی طرح ضد نہیں کرتے۔ اب تم ایک سمجھدار اور باشعور لڑکی ہو۔" مریم نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا۔ "کبھی کبھی مجبوراً ہی سہی ہمیں اپنے محبت کرنے والوں کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اس عمل میں تھوڑی بہت ٹوٹ پھوٹ تو ہوتی ہے میری جان! لیکن یاد رکھو کسی مخلص دل کو توڑنا کعبہ کو ڈھانے کے مترادف ہوتا ہے۔"

نادیہ نے جلدی سے اوندھی ہو کر ہتھیلیوں کے کٹورے میں اپنے ٹھوڑی ٹکا کر بڑے غور سے مریم کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر بڑی شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔

"یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ تم ہو۔ اتنے خوبصورت جملے، اتنے عظیم خیالات، نظر نہ لگ جائے کہیں میری دوست کو۔"

"اچھا زیادہ نہ اتراؤ۔" مریم بھی اس کے برابر ہی میں لیٹ گئی۔ "جو کچھ بھی بک رہی ہوں نہایت سنجیدگی سے بک رہی ہوں۔ مذاق نہیں ہے۔ اس دفعہ تمہیں جانا ہی پڑے گا۔"

نادیہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "اچھا تو بقول مریم بیگم محبت کرنے والوں کے سامنے جھکنا ہی پڑے گا لیکن یاد رکھو یہ گیلی لکڑی نہیں ہے جھکنے والے کبھی کبھی ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" مریم نے ڈانٹ پلائی۔

"گستاخی معاف بندہ پرور!" نادیہ نے جلدی سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"لیکن حضور عالی! آپ یہ جانتی ہیں کہ انٹر کے بعد مجھے میڈیکل میں داخلہ لینا ہے اگر پھوپھی حضور کے پاس چلی گئی تو وہ مزید مخالفت کریں گی۔ مجھے کبھی میڈیکل میں داخلے کی اجازت نہیں ملے گی۔ بابا جانی یا امی حضور ہوتیں تو اور بات تھی۔"

"لیکن...... نادیہ اس مخالفت کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی۔" نادیہ نے نظریں اٹھا کر مریم کی طرف دیکھا۔

"ہاں...... ہے ایک جس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"شادی وادی کا چکر ہے۔" مریم نے اس کے اور نزدیک ہو کر بڑی آہستگی سے پوچھا۔

"ہاں۔ بلائیں اور آفتیں دعوت نامہ دے کر تو نہیں بلائی جاتیں۔ اچانک ہی نازل ہوتی ہیں۔ سنا ہے کہ بچپن ہی میں پھوپھی حضور نے بابا جانی سے مجھے منصور کے لیے مانگ

لیا تھا۔ وہ دونوں ہوتے تو مجھ میں کچھ کہنے کا حوصلہ بھی ہوتا۔ ڈرتی ہوں پھوپھی حضور کے شاہانہ حکم کے سامنے کہیں مجھے اپنے ڈاکٹر بننے کے شوق کی قربانی نہ دینی پڑ جائے۔"

"ارے نہیں نادیہ! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ اتنی زیادتی تو نہیں کر سکتیں۔" حالانکہ اندر سے اس کا دل بھی ڈر گیا۔ نادیہ دوبارہ گھاس پر لیٹ گئی۔ سامنے صاف ستھرے نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر آہستہ آہستہ بولتی گئی۔

"دراصل مجھ جیسی لڑکی کے لیے شادی بہت بڑا پرابلم ہے۔ مجھے نہیں معلوم منصور کس مزاج کا مالک ہے۔ کیا عادتیں ہیں لیکن میں تو اپنے مزاج اپنی عادتوں سے بخوبی واقف ہوں ممکن ہے یہ چیزیں دوسرے کے لیے بارگراں ثابت ہوں۔ ایسی صورت میں غلط سمجھوتے تو نہیں کر سکتی۔ میں بے حد شدت پسند ہوں مریم! محبت میں بھی اور نفرت میں بھی۔ پھر حالات اور اپنوں کی لاتعلقی نے مجھے تلخ بھی بنا دیا ہے۔ مجھے ہر حال میں ڈاکٹر بننا ہے، خواہ اس کے لیے مجھے کتنی ہی قربانیاں دینی پڑیں۔" مریم بھی اس کے نزدیک ہی گھاس پر اوندھی لیٹ گئی۔

"مجھے تمہارے خیالات معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی نادیہ! کبھی غلط سمجھوتے مت کرنا کبھی کسی کمزوری کا اظہار نہ کرنا۔ کبھی بھی اپنے تابناک مستقبل کی بنیادوں پر ڈگمگاتا ہوا حال تعمیر نہ کرنا۔ ہم لڑکیوں کے ساتھ یہ عجیب ٹریجڈی ہے کہ اپنا آپ، اپنے خواب اپنی آرزوؤں کو مٹا کر دوسروں کی محبت حاصل کرتے ہیں تو اس کی بھی گارنٹی نہیں ہوتی۔ اس ڈگمگاتی ہوئی ناؤ پر کون کب تک سفر کر سکتا ہے؟ میں اکثر سوچتی ہوں ایسا کیوں ہوتا ہے، کیا جھکنا اور جھکتے جھکتے ٹوٹ جانا صرف ہم لڑکیوں ہی کے حصے میں آیا ہے۔" مریم کی آواز شدت جذبات میں ڈوبتی گئی۔ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ نادیہ نے ذرا سا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو حیران رہ گئی وہ چپکے چپکے، چوری چوری آنسو بہا رہی تھی۔ نادیہ لپک کر اٹھی اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔

"تم...... تمہیں یہ کیا ہوا؟ تم رونے کیوں لگیں؟ ارے پگلی میں تو یونہی اپنی قابلیت کا سکہ بٹھانے کے لیے یہ تقریر کرنے لگ گئی تھی۔" مریم کے ہونٹوں پر آنسوؤں میں ڈوبی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"لیکن نادیہ!...... یہ سب کچھ اگر واقعی اسٹیج پر کی گئی تقریر ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا پر یہاں

تو......'' اس نے اوندھے ہو کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''مریم! خدا کے لیے یہ کیا حرکت ہے...... کچھ تو بتاؤ۔'' نادیہ نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

مریم نے جلدی جلدی آنسو پونچھ ڈالے۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہنستے ہوئے بولی۔

''توبہ......توبہ...... میں بھی کیا حرکت کر بیٹھی۔ اچھا اٹھو چلو کمرے میں چلتے ہیں۔''

''نہیں۔'' نادیہ نے اسے اٹھنے سے پہلے ہی زبردستی بٹھا دیا۔ ''پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم روئیں کیوں؟ کیا ان آنسوؤں اور اس طویل بامعنی گفتگو کے پیچھے...... کوئی......؟'' مریم نے اپنا ہاتھ نادیہ کے منہ پر رکھ دیا۔

''آگے کچھ مت پوچھنا۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ اگر کسی پر بھرپور اعتماد ہو اور وہ اچانک ہی پاش پاش ہو جائے تو زندگی کرچیوں کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ میں سالوں سے ان کرچیوں کو چن چن کر اپنے آپ سے نکال رہی ہوں لیکن چبھن ہے کہ جاتی ہی نہیں۔'' وہ بے تحاشا ہنسے جا رہی تھی اور نادیہ منہ کھولے حیران حیران نظروں سے اسے تکے جا رہی تھی۔

مریم نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اٹھا لیا۔ پھر موضوع بدلنے کی خاطر جلدی سے بولی۔

''اچھا، یہ تو بتاؤ، منصور تمہیں پسند ہے نا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' نادیہ نے بغیر کسی جذبے کے نہایت سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

وہ تو ابھی تک مریم کی بھیگی پلکوں، اداس اور مسکراتے ہوئے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تلخ حقائق کو اس آسانی سے خوش مزاجی کے پردے میں چھپایا جا سکتا ہے۔

''نادیہ! کہاں کھو گئیں؟'' اسے نامعلوم خیالوں میں گم پا کر مریم نے سوال کیا۔

''آں...... میں......نہیں تو چلو اٹھو بہت دیر ہو گئی ہے۔'' وہ مریم کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کافی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ دونوں خاموش اپنے اپنے خیالوں میں گم، دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کمرے میں آ گئیں۔ کپڑے تبدیل کر کے چپ چاپ اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئیں۔ مریم کی آنکھیں بند تھیں لیکن نادیہ کی کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے مریم کا روتا ہوا چہرہ تھا۔ اس لڑکی کا چہرہ تھا جو اتنی پیاری اتنی ہنس مکھ، اتنی سلیقہ مند اور اتنی دولت مند ہونے کے باوجود قسمت کی ٹھوکر سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکی تھی۔ یا پھر اپنوں کا وہ پیار نہیں ملا ہو گا جس نے اس جیسی باہمت لڑکی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

''مریم!'' نادیہ نے دھیرے سے آواز دی۔

''کیا ہے۔ نیند نہیں آ رہی ہے؟''

''نہیں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا مجھے اتنا حق دو گی کہ میں تم سے تمہارے دکھ کی حقیقت جان سکوں۔''

مریم ہنس دی۔

''ارے میری جان! چھوڑو بھی۔ تم بھی کہاں اس چکر میں پھنس گئیں اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔''

''نہیں۔ تمہیں بتانا پڑے گا کہ تمہاری پیاری سی شخصیت کو کس نے پاش پاش کیا ہے۔'' وہ اپنی مسہری سے اتر کر مریم ہی کے پاس آ گئی۔

''دیکھو نادیہ......'' مریم اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ ''تمہارے لیے تمہارے اپنے دکھ اور مسائل کچھ کم ہیں کہ اس میں تم میری کہانی کا بھی اضافہ کرنا چاہتی ہو۔''

''کسی بہت اپنے کو جس پر بھروسہ ہو بتا دینے سے دکھوں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' نادیہ نے سمجھایا۔

''اور اگر میں اسے ہلکا نہ کرنا چاہوں تو؟''

''تو...... میں یہ سمجھوں گی کہ میرے خلوص اور اپنائیت میں کہیں نہ کہیں کھوٹ ضرور ہے۔''

مریم نے مسکرا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی سوچتی رہی جیسے کوئی فیصلہ کر رہی ہو پھر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''دیکھو نادیہ، میرا اس پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ام الکتاب میں جو کچھ بندے کے لیے لکھ دیا ہے اسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ ہاں ہماری اور ہمارے ماں باپ کی دعائیں اس بدبختی اور کم بختی کی شدت کو کم ضرور کر دیتی ہے اور یہی سب میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ عمر میرا کزن اور بچپن کا ساتھی تھا۔ خالہ امی نے میری پیدائش ہی پر مجھے امی ابو سے مانگ لیا تھا۔ خالہ اور میری امی میں بہت محبت تھی۔ ہم دونوں میں بھی بڑی اچھی ہم آہنگی تھی۔ وہ میرا اتنا خیال رکھتا تھا کہ اس کی اتنی محبت پا کر میں تھوڑی سی مغرور ہو گئی تھی۔ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ بی اے کے بعد عمر ایم بی اے کے لیے امریکہ چلا گیا۔ اسے تو امریکہ جانے کا شوق پاگل پن کی حد تک تھا۔ پانچ سال بعد واپس آ گیا اور ہماری شادی ہو گئی۔ میں عمر کے

ساتھ ہی امریکہ چلی گئی کہ اسے پاکستان میں رہنا اور یہاں نوکری کرنا قطعاً پسند نہیں تھا۔ بقول اس کے اس ملک میں دھرا کیا ہے۔ سوائے مشکلات کے وہاں تو ہمارا تابناک مستقبل ہے، آسائشیں ہیں، آسانیاں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پیسہ ہی پیسہ ہے۔ ان سب کے علاوہ بندے کو اور چاہیے بھی کیا۔ امی ابو خوش اور مطمئن تھے۔ میں بھی خوش تھی یہ سمجھ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا تھا کہ اس دور کے تو زیادہ تر نوجوان اپنے ملک کے حالات سے بیزار اور امریکہ کے ثناء خوان ہیں۔ امریکہ میں عمرو کا بہت خوبصورت سجا سجایا فلیٹ تھا۔ ہر چیز موجود تھی۔ عمر بھی ضرورت سے زیادہ میرا خیال رکھتے لیکن ہر آسائش کے باوجود میرے دل میں نامعلوم سا خوف رہتا۔ شاید تنہائی کا خوف تھا یا شاید ماں باپ سے دور ہو جانے کا خوف۔ اپنے آپ کو تسلی دے لیتی۔ مہینہ بھر بعد ہی اس کے معمولات بدلنے لگے۔ صبح جاتا تو شام بلکہ رات گئے واپس آتا۔ میں اپنی پریشانی بیان کرتی، شکایت کرتی تو ایک دم ناراض ہو جاتا ایک دن میں نے اسے بتایا میں یہاں کالج میں داخلہ لینا چاہتی ہوں تاکہ اپنی تعلیم مکمل کر سکوں۔ ویسے بھی تمام دن بیکار ہی پڑی رہتی ہوں کالج جاؤں گی تو تھوڑی کمپنی ہو جائے گی۔ میں حیران رہ گئی یہ دیکھ کر کہ اچانک ہی اس کا پارہ آسمان پر چڑھ گیا خوب چیخا چلایا اور صبح جاتے ہوئے باہر سے مکان کو تالا لگا گیا۔ میں ششدر رہ گئی پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ کئی روز تک میں خاموش اور حوصلہ سے یہ برداشت کرتی رہی لیکن کب تک...... ایک دن میں بھی بپھر گئی۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی عمر کہ تم اپنی حدوں سے اتنا گر چکے ہو۔ تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے یا اپنا قیدی بنا کر رکھنا چاہتے ہو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں واپس پاکستان جانا چاہتی ہوں۔ ان حالات میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" اتنا سننا تھا کہ اس نے میرے اوپر ہاتھ اٹھا لیا۔ میں خاموشی سے پٹتی رہی۔ میرے بدن پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے۔ اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی شاید اس کے دل کو سکون نہ ملا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے باہر نکال دیا۔

"جاؤ۔ پاکستان جانا چاہتی ہو۔ چلی جاؤ مجھے بھی تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تم سے شادی صرف امی کی زبردستی سے کی تھی ورنہ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں شادی کر چکا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے یہاں رہنے کے لیے گرین کارڈ کی ضرورت تھی۔ میرے دو بچے

بھی ہیں۔ پھر بھی وہ بہن اور بھانجی کی محبت میں نہیں مانیں تو مجبوراً میں تمہیں بیاہ کر لے آیا۔"

نادیہ کا سارا جسم سن ہو چکا تھا۔ بولنے کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ نظریں مریم کے چہرے پر تھیں جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

"سو نادیہ بی بی! اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو بے سہارا تو نہیں چھوڑتا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح پاکستان آ گئی۔ امی میں میرا جیسا حوصلہ اور ہمت نہیں تھی اس لیے کہ وہ ماں تھیں۔ اسی لیے ایک دن بہن کی خود غرضی اور بھانجے کی زیادتی کی شکایت کرنے خود ہی اللہ میاں کے پاس چلی گئیں۔ میں نے اس کالج میں آ کر ہوسٹل میں داخلہ لے لیا اب مجھے ہر مرد سے نفرت ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں کیوں لیکن اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ جو مرد اعتماد اور بھروسے کی دیوار کو اس آسانی سے گرا دیں ان کو کوئی بھی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو مریم۔" نادیہ واپس اپنے بستر پر آ گئی۔ وہ ابھی بھی گم صم تھی۔

"محبت ناپنے کا تو کوئی پیمانہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔" وہ چپ چاپ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ نیند غائب ہو چکی تھی اور انٹ شنٹ سوچوں نے ذہن پر قبضہ جما لیا تھا۔

"کون جانے گزرتے وقت کے ساتھ منصور بھی نہ عمر بن جائے اور......" اس نے اپنے اندر کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے بڑے خلوص سے دعا کی۔

"اللہ میاں میں جو بڑی بدقسمت ہوں شدت پسند بھی ہوں۔ مجھے حوصلہ دینا کہ بھٹک نہ جاؤں۔ ٹوٹ نہ جاؤں اور......" اور نہ جانے کب ڈوبتے ڈوبتے گہری نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

☆

سردیاں اپنے شباب پر تھیں۔ ٹھنڈی یخ بستہ ہوائیں کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں سے اس طرح ٹکرا رہی تھیں جیسے اندر کی گرمی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہوں لیکن اس غضب کی سردی میں بھی اسلام پور کے زندہ دل لوگ کوٹوں اور شالوں میں لپٹے لپٹائے رات گئے تک گھومنے پھرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ چائے خانے آباد رہتے، ہوٹلوں میں گہما گہمی رہتی اور سڑکیں آدھی رات گزر جانے کے باوجود بارونق رہتیں۔ شہر سے چند میل دور چھاؤنی کے پُرسکون اور خوبصورت علاقے میں اتنی رات گزر جانے کے باوجود منصور محل بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ بڑے سے لان میں مہمانوں کے کھنک دار قہقہے گونج رہے

تھے۔ نوکروں کی چہل پہل اور مستعدی سے فرائض کی ادائیگی جاری تھی۔ اس تمام جوش خروش اور چہل پہل کی اصل وجہ برسوں بعد رشید احمد کے خاندان کی انگلینڈ سے واپسی تھی۔ پھر ان کے اکلوتے صاحبزادے منصور احمد بھی بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آ چکے تھے۔ رشید احمد اور عابدہ بیگم کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی۔ اسی خوشی میں انہوں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو دعوت پر مدعو کیا تھا۔ رات کا آدھا پہر گزر جانے کے بعد مہمان دھیرے دھیرے رخصت ہونا شروع ہو گئے تھے۔ آخری مہمان سے بھی نمٹ چکنے کے بعد منصور نے خدا کا شکر ادا کیا اور تھک کر ڈرائنگ روم میں آتشدان کے قریب ہی صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ چند منٹ بعد ہی رشید احمد اور عابدہ بیگم بھی نازلی اور فوزیہ کے ہمراہ گرم گرم کافی کی ایک ایک پیالی پینے کے لیے وہیں آ گئے۔

”کیوں بیٹے! کیا بہت تھک گئے؟“ عابدہ بیگم نے بڑے دلار سے اپنے ہونہار بیٹے کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ منصور نے جھٹ آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا اور ہنس کر بولا۔

”ارے نہیں امی جان! میں تو کافی کے انتظار میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔“ پھر نازلی اور فوزیہ پر نظر پڑتے ہی جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”اچھا تو آپ دونوں بھی یہاں موجود ہیں۔ توبہ توبہ، ندیدے پن کی انتہا ہے کافی پیے بغیر نیند نہیں آتی کیا؟“

”واہ...... ہم کیوں ہوتے ندیدے...... وہ تو ابا میاں زبردستی لے آئے ورنہ...... ہم لوگ تو سونے جا رہے تھے۔“ نازلی نے فوراً جواب دیا۔

”اب جانے بھی دو لوگ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے ایسے ہی عذر پیش کرتے ہیں۔“

”کاہے کی شرمندگی، کون سی شرمندگی ہم تو اب ایک نہیں دو دو پیالیاں پئیں گے۔ لوگ جلتے ہیں تو جلتے رہیں۔“ فوزیہ ڈپٹ کر بولی۔

عابدہ بیگم اور رشید احمد تینوں کی اس نوک جھونک کو دور بیٹھے دیکھ کر مسکرائے جا رہے تھے۔

”یہ دونوں خوبیاں تو ماشاء اللہ چہرہ شریف سے ظاہر ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دس بارہ پیالیاں پہلے ہی اتر چکی ہیں۔“

”چلیے درست مانا لیکن ہم لوگ تو جیسے ہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں نا۔ ان لوگوں کے بارے میں بیرسٹر صاحب کا کیا خیال ہے جو ہوتے کچھ ہیں اور نظر کچھ اور آتے ہیں۔“ فوزیہ نے چوٹ کی ”اور یہ بازیگر کھلا دھوکہ دیتے ہیں۔“ نازلی نے ساتھ دیا۔

منصور کے ساتھ ساتھ رشید احمد اور عابدہ بیگم بھی زور سے ہنس پڑے۔ اسی وقت نوکر کافی کی ٹرے لیے اندر آیا۔ رشید احمد جلدی سے اپنا سفید رومال ہوا میں لہراتے ہوئے بولے۔

”جھگڑا، لڑائی بند۔ صلح کا پرچم بلند ہو چکا ہے۔ اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ کافی کون بنائے گا؟“

”ہماری بیٹی فوزیہ بنائے گی۔ بہت اچھی کافی بناتی ہے۔“ عابدہ بیگم کے لہجے میں بڑا پیار تھا منصور ہنس پڑا۔

”اس میں بلاوجہ ہنسنے کی کون سی بات ہے؟“ فوزیہ جلبلا کر بولی۔

”اس لیے کہ امی جان نے مکھن اچھا لگایا۔“ فوزیہ نے منصور کو گھورا اور خاموشی سے اٹھ کر کافی بنانے لگی۔ رشید احمد نے مڑ کر فوزیہ کی طرف دیکھا کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر بڑی آہستگی سے عابدہ بیگم سے بولے۔ ”وجاہت کی دونوں اولادوں میں کتنا فرق ہے۔“

”ہاں۔“ عابدہ بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر فوزیہ کی طرف دیکھا۔

”وہی فرق جو وجاہت، اور ثریا دلہن میں تھا۔“ فوزیہ ان کی باتوں سے بے خبر کافی بنانے میں مشغول تھی۔

”امی جان!“ اس گمبھیر خاموشی کو نازلی کی آواز نے توڑ دیا۔ ”آپ نے نادیہ کو بلایا تھا وہ پھر بھی نہیں آئیں۔“ نادیہ کے نام پر منصور نے چونک کر نازلی کی طرف دیکھا۔ بڑی دیر سے وہ خود بھی یہی سوال کرنا چاہتا تھا لیکن بسا اوقات انسان جو کچھ پوچھنا چاہے وہ بھی نہیں پوچھ سکتا۔ اب اس کی سوالیہ نظریں ماں کے چہرے پر تھیں۔

”جو نہ آنا چاہے اسے زبردستی تو نہیں لایا جا سکتا ویسے تم نے دعوت نامہ تو بھجوا دیا تھا نا؟“

”جی ہاں۔ اسی دن بھجوا دیا۔ جواب میں اس نے فون بھی نہیں کیا۔“ نازلی کے لہجے میں شکایت تھی۔

”اس کی مرضی بیٹا! ہم زبردستی تو نہیں کر سکتے۔“ عابدہ بیگم افسردگی سے بولیں۔

”کمال ہے۔ جب وہ آپ لوگوں کے پاس آنا ہی نہیں چاہتی تو بار بار بلوا کر اپنی

بات کھونے سے کیا فائدہ۔" بڑی دیر بعد منصور نے اس گفتگو میں حصہ لیا۔ شدید دکھ اور غصے میں اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"کچھ بھی ہو یہ تو ہمارا فرض تھا۔ اس میں ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔" رشید احمد نے آہستگی سے سمجھایا۔

"تم نہیں جانتے۔ وہ مجھے کتنی عزیز ہے۔ لوگ اسے منہ پھٹ اور ضدی کہتے ہیں لیکن یقین مانو بیٹا وہ زبان کی کھری اور دل کی بہت نیک ہے۔ یہ دونوں خوبیاں بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں اور جن میں ہوتی ہیں ان کو اکثریت برا ہی سمجھتی ہے۔"

"میں اسے نہیں مانتی۔" عابدہ بیگم کافی پیتے ہوئے بولیں۔ "اتنی خود سری بھی ٹھیک نہیں کہ اپنی ضد کے آگے بڑوں کی بات کی کوئی اہمیت ہی نہ رہے۔ وجاہت اور ثریا دلہن نے بھی مجھے یوں دوٹوک جواب نہیں دیا تھا جس طرح نادیہ نے صاف انکار کر کے میرا دل توڑ دیا۔"

رشید احمد نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ سب چپ تھے۔ سبھی کچھ سوچ رہے تھے۔ آخر اس تکلیف دہ خاموشی کو رشید احمد ہی نے توڑا۔

"ہاں تو منصور میاں! تمہارا کیا پروگرام ہے؟ کب سے پریکٹس شروع کرو گے؟" انہوں نے براہ راست منصور سے سوال کیا۔ منصور جو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا چونک پڑا۔

"جی...... جی ہاں ابا میاں فی الحال تو کوئی پروگرام نہیں۔ ابھی کچھ لوگوں سے ملنا ہے مل لوں۔ پھر سوچوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی جلدی بھی کیا ہے۔ ہفتہ دو ہفتہ آرام کرو لوگوں سے ملو جلو پھر اطمینان سے کام شروع کرنا۔"

"جی ہاں...... میرا بھی یہی خیال ہے۔" منصور خاموش ہو گیا۔ نازلی نے موقع غنیمت جانا۔ دھیرے سے بولی۔

"ابا میاں! جب تک منصور بھائی پریکٹس شروع نہیں کرتے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ یعنی میں اور فوزیہ ان کے ساتھ گلزار نگر ہو آئیں۔"

"آپ کیا کریں گی گلزار نگر جا کر؟ میں تو نہیں جا سکتا۔ میرے پاس وقت نہیں

ہے۔" رشید احمد کے بولنے سے پہلے ہی منصور بول پڑا۔ دراصل اسے نادیہ کے نہ آنے پر شدید غصہ تھا۔

"تفریح کریں گے۔ نادیہ سے ملیں گے اور کیا کرنا ہے؟" نازلی نے جان بوجھ کر سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"بڑی بے شرم ہو۔ وہ تو ملنا نہیں چاہتی اور آپ ہیں کہ ملنے کے لیے بیقرار ہو رہی ہیں۔"

فوزیہ کا چہرہ ایک لمحے کے لیے سرخ پڑ گیا۔ یہ درست کہ وہ پھوپھی کے گھر میں بڑے آرام اور پیار و محبت کے ماحول میں رہ رہی تھی لیکن اس کے باوجود نادیہ کی یاد کسی لمحے بھی اس کے دل سے فراموش نہیں ہو سکی تھی۔ ماں باپ کو کھو دینے کے بعد ایک بہن ہی تو تھی جو اس کا واحد سہارا تھی۔ وہ کسی حال میں بھی نادیہ کو چھوڑ کر عابدہ بیگم کے ساتھ نہ آتی اگر یہ ڈر نہ ہوتا کہ اس کے انکار پر پھوپھی حضور نادیہ سے بالکل ہی بیزار نہ ہو جائیں۔ وہ بری بھلی جیسی بھی تھی اس کی چہیتی بہن تھی۔ اس وقت منصور کے طنزیہ جملے پر اس کے رخسار تپ اٹھے۔ دھیرے سے بولی۔

"وہ میری بہن ہے۔ منصور بھائی ہم بے شرم بن کر ہی اس سے ملنے چلے جائیں گے۔ آپ نہ جائیں۔ ہم لوگ ڈرائیور کے ساتھ چلے جائیں گے۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ منصور زور سے ہنس پڑا۔ رشید احمد نے پلٹ کر فوزیہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے اٹھے اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"فکر کیوں کرتی ہو بیٹی! میں تو خود تم کو لے کر اس کے پاس جانے والا تھا۔ خدا کرے وہ بخیریت ہو ورنہ آتی ضرور۔"

عابدہ بیگم بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر فوزیہ کے قریب آئیں۔ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ "کل صبح ہی تم دونوں گلزار نگر، نادیہ کے پاس چلی جانا۔ اس کے نہ آنے سے میں بھی بہت پریشان ہوں بیٹا۔" پھوپھی کے پیار نے ضبط کے اس بندھن کو توڑ دیا جو وہ توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"پھوپھی حضور! منصور بھائی کو منع کر دیجیے۔ وہ آپی کو کچھ نہ کہا کریں وہ بہت اچھی ہیں۔ وہ بہت دکھی ہیں امی حضور کو کھو کر۔" عابدہ بیگم کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ رشید احمد

نہایت سنجیدہ تھے اور منصور بے حد شرمسار۔ چند منٹ بعد رشید احمد جاتے ہوئے بولے۔

''نازلی اور فوزیہ بٹی! کل صبح ہی صبح تم لوگ تیار ہو جانا۔ میں خود تمہیں لے کر گلزار نگر جاؤں گا۔''

''بہتر ابا میاں!'' نازلی نے دھیرے سے جواب دیا اور رشید احمد کے ساتھ ہی عابدہ بیگم بھی کمرے سے چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی منصور جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتا ہوا فوزیہ کے نزدیک آیا۔

''چلو اپنے منصور بھائی کو معاف کر دو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اتنے بڑے دل والے باپ کی بٹی کا دل اتنا چھوٹا ہے۔''

''میرا دل بہت بڑا ہے منصور بھائی! لیکن......'' اس سے قبل کہ وہ دوبارہ رو پڑے منصور نے جھٹ موضوع بدل دیا۔

''اچھا......تو کل صبح صبح آپ دونوں خواتین گلزار نگر جا رہی ہیں؟''

''آپ سے مطلب......آپ کے ساتھ تو نہیں جا رہے ہیں۔'' نازلی جل کر بولی۔

''تو یہاں بھی کون مرا جا رہا ہے آپ کے ساتھ جانے کے لیے۔'' پھر اتنی سی بات پوچھنے کے لیے اتنی دور چل کر آنے کی زحمت کیوں کی؟''

''زحمت تو صرف ان فوزیہ بی بی کو دیکھنے کے لیے کی تھی کہ واقعی یہ رو رہی ہیں یا صرف ایکٹنگ ہے۔''

''صرف ایکٹنگ تھی۔ یقین آ گیا نا۔'' فوزیہ نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

منصور ہنس پڑا۔ ''چلو غلطی ہوئی دوسری بار معافی۔'' اس نے جھٹ سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے پھر اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''نادیہ سے ملنے کا تو بہانہ ہے آپ لوگ تو تفریحاً گلزار نگر جانا چاہتی ہیں حالانکہ وہ بھی کوئی تفریح کی جگہ ہے لاحول ولاقوۃ۔''

''جی ہاں......تفریح کی جگہ تو صرف آپ کا لندن اور امریکہ ہے۔''

''واہ کیا بات کہی ہے آپ نے نازلی بیگم! دل خوش کر دیا۔''

''پھر آپ یہاں تشریف کیوں لائے۔ وہیں رک جاتے۔ وہیں پریکٹس کرتے۔'' فوزیہ شال لپیٹتے ہوئے جل کر بولی۔

''پریکٹس تو وہیں کروں گا۔ یہاں تو محض ابا میاں اور امی جان کی تسلی کے لیے آ گیا ہوں۔ دوسرے تم پاکستانی لڑکیوں کا رنگ ڈھنگ بھی دیکھنا چاہتا تھا۔''

''چلو......اٹھو فوزیہ نیند آ رہی ہے۔'' نازلی جلبلا کر اٹھ گئی۔

منصور نے زوردار قہقہہ بلند کیا لیکن وہ دونوں اس کو نظر انداز کر کے بڑبڑاتی ہوئی باہر آ گئیں۔ اس کے بعد منصور بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆

''نادیہ!...... ارے نادیہ بیگم!...... اب خدا کے لیے اٹھ بھی چکو۔ تمہیں جگانے کے لیے تو لاؤڈ اسپیکر چاہئیں۔'' مریم نے جھنجلا کر کہا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بارہویں بار آواز لگائی تھی۔

''اوں...... ہوں...... اٹھتے ہیں بھئی تنگ نہ کرو مریم!'' نادیہ نے کسمسا کر دوسری کروٹ بدل لی۔ مریم نے جل کر رضائی کھینچ لی۔ ''حد ہے بھئی۔ گھڑی دیکھی ہے؟ نو بج چکے ہیں۔'' نادیہ نے سردی سے سکڑتے ہوئے تھوڑی سی آنکھ کھول کر مریم کی طرف دیکھا لیکن اس کی صورت پر نظر پڑتے ہی زور سے ہنس پڑی۔

''آدھا گھنٹہ اور سو لینے دیتیں تو کون سا قہر ٹوٹ جاتا۔'' وہ بادل نخواستہ اٹھ کر گاؤن پہنتے ہوئے بولی۔

''قہر ہی ٹوٹتا۔ آپ کو معلوم ہے آج کیا دن ہے۔ دس بجے ہم لوگوں کو فیلڈ پر پہنچ جانا ہے۔''

''فکر نہ کرو بس پانچ منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔ دس بجے ہم لوگ فیلڈ پر ہی ہوں گے۔'' وہ منہ دھونے غسل خانے میں چلی گئی۔ آدھے گھنٹے کے اندر تیار ہو کر ان دونوں نے جیسے تیسے ناشتہ حلق سے اتارا اور بھاگم بھاگ فیلڈ میں پہنچ گئیں۔

انٹر کالجیٹ ٹورنامنٹ تھے گلزار نگر کے تقریباً تمام گرلز کالجز نے حصہ لیا تھا۔ اپنے کالج کی ٹیم کی کپتان ہونے کی حیثیت سے نادیہ کو گھنٹہ بھر پہلے ہی فیلڈ پر پہنچنا تھا لیکن جس وقت وہ پہنچی تمام لڑکیاں اور لیکچررز آ چکی تھیں۔ کھیلوں کی انچارج سے نظریں بچا کر وہ جلدی جلدی اپنی ٹیم کو ترتیب دینے لگی۔ ڈیڑھ بجے لنچ ٹائم پر ڈائننگ ہال میں جاتے ہوئے چپراسی نے دروازے پر اسے روکا۔

''بی بی...... آپ کے کچھ مہمان ملاقاتی کمرے میں منتظر ہیں۔''

''میرے...... مہمان......'' نادیہ نے تعجب سے پوچھا۔ ''کون ہوسکتا ہے بھلا؟''

''جی......انہوں نے آپ ہی کا نام لیا تھا۔''

''ٹھیک ہے انہیں بٹھاؤ'' مریم نے جلدی سے چپراسی کو ٹالا اور اسے گھسیٹتے ہوئے بولی۔

''پہلے کھانا کھالو۔ وقت بہت کم ہے۔''

''لیکن...... اس وقت...... کون آیا ہوگا؟'' ہال کے اندر جاتے جاتے رک کر اس نے سوچا پھر مریم کو مخاطب کر کے جلدی سے بولی۔

''مریم! کہیں اپنی فوزی نہ ہو۔ تم کھانا کھاؤ میں صرف جھانکی مار کر آتی ہوں اگر اِدھر اُدھر کا کوئی ہوا تو واپس پلٹ آؤں گی۔'' اس سے قبل کہ مریم کچھ بولے وہ جان چھڑا کر ملاقاتی کمرے کی طرف ہو لی۔ کمرے کے باہر ہی فوزیہ کھڑی تھی اسے دیکھتے ہی وہ اچھل پڑی۔ فوزیہ نے دوڑ کر دونوں بانہیں بہن کی گردن میں ڈال دیں۔ نادیہ نے اس کے رخسار پیشانی پر بے شمار پیار کر ڈالے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنے سامنے کرتی ہوئی بولی۔

''اللہ کتنے دنوں بعد تمہیں اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں فوزیہ جان!'' پھر برابر میں کھڑی نازلی پر نظر پڑتے ہی اس نے فوزیہ کو چھوڑ کر اس کو لپٹا کر پیشانی چوم لی۔

''تم دونوں کتنی نالائق ہو مجھے بھول ہی گئی تھیں۔'' نادیہ نے شکایت کی۔

''ہم لوگ خود تم سے خفا ہیں نادیہ ملنے تو آ گئے ہیں لیکن بولیں گے تھوڑا ہی۔'' نازلی کی اس انوکھی خفگی پر وہ مسکرا دی۔

''پھر تو میں دعا کروں گی کہ تم ہمیشہ اسی طرح خفا ہوا کرو۔''

جب امی جان نے تم کو بلایا تھا تو کیوں نہیں آئیں؟''

''خطا معاف......'' نادیہ نے منانے کے لیے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔

''واقعی میری نالائقی تھی کہ پھوپھی حضور کے بلانے کے باوجود نہ جا سکی لیکن یقین مانو میں بہت مجبور ہوگئی تھی۔''

''آپ کی یہ معافی اس وقت قابل قبول ہوگی جب آپ ہمارے ساتھ ہی اسلام پور چلیں گی۔ پھوپھا حضور نے ہمیں خاص طور سے اسی کام کے لیے بھیجا ہے۔'' فوزیہ نے اطلاع دی نادیہ گڑبڑا گئی۔ سنبھل کر بولی۔

''اچھا یہ بتاؤ وہ لوگ ٹھیک تو ہیں؟''

''بالکل ٹھیک ہیں۔ لیکن آپ سے بہت خفا ہیں۔''

''اوہ...... ہاں۔'' اسے اس بلاوے والی بات پر منصور یاد آیا۔

''تو یوں کہو منصور بھائی کے اعزاز میں بڑی شاندار دعوت ہوئی ہے۔ وہ نہیں آئے۔'' نادیہ نے کچھ جھجک کر اور رک کر پوچھا۔

''منصور بھائی! ادھر تو آئیں۔'' نازلی نے ہال کے دروازے پر آ کر منصور کو آواز دی۔ نادیہ چونک اٹھی۔

''اچھا...... تو منصور بھائی اندر بیٹھے ہیں۔'' اور تینوں کمرے کے اندر آ گئیں۔ منصور بڑے بے پرواہ انداز میں دونوں ہاتھ پیچھے کیے ٹہل ٹہل کر دیوار پر لگی تصویریں دیکھنے میں مصروف تھے۔ نادیہ نے بڑے مودبانہ انداز میں سلام کیا۔ منصور مڑا سر سے پاؤں تک بڑے غور سے اس کو دیکھا۔ پھر نہایت آہستگی سے بولا۔

''جیتی رہیے۔''

نادیہ کو ہنسی آ گئی۔

''یہ آپ ہی ہیں نا۔ یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''اور یہ تم نادیہ ہی ہو نا۔ مجھے اعتبار نہیں ہے۔''

''مجسم نادیہ وجاہت علی ہوں۔ اس میں شک کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے؟''

''اس لیے کہ...... میرا خیال ہے بچپن میں تم بہت خوبصورت ہوا کرتی تھیں۔'' منصور نے آگے بڑھ کر آہستہ سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیئے۔ سوال بڑا عجیب تھا۔ نادیہ نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں۔ پھر اسی آہستگی سے بولی۔

''میرا یہ خیال ہے کہ...... اب بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔'' اور منصور کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیئے۔ پھر پلٹ کر نازلی اور فوزیہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''تم لوگ شام تک تو یہیں رہو گے نا؟''

''خیال تو شام تک ہی جانے کا ہے لیکن...... ساتھ میں تمہارا ہونا بھی ضروری ہے۔'' نازلی نے وضاحت کی۔ نادیہ مسکرا دی۔

''لیکن...... نازلی ڈیئر آج تو...... میں......'' وہ ذرا رکی۔

"میں جانتا تھا تم یہی کہو گی کہ آج تو میں کسی صورت نہیں جا سکتی۔" منصور نے قریب آ کر نہایت سنجیدگی سے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں منصور بھائی! میں ضرور چلتی لیکن مجبوری صرف یہ ہے کہ آج کل ہمارے یہاں انٹر کالجز ٹورنامنٹ ہو رہے ہیں اور میں اپنے کالج کی ٹیم کی کپتان ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ صفائی پیش نہ کرو۔ ہم تمہیں مجبور تھوڑا ہی کر رہے ہیں۔ ویسے امی جان کا خیال غلط تو نہیں تھا کہ نادیہ بی بی کو ہم لوگوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

"پھوپھی حضور مجھ سے بہت ناراض ہیں کیا؟" اس نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

"ایسی ویسی...... صورت سے بیزار۔" منصور نے اس کے بہت قریب آ کر بتایا۔

"آپ کا کیا اعتبار...... آپ کا تو پیشہ ہی جھوٹ بولنے کا ہے۔ تم بتاؤ نازلی۔"

"ہاں نادیہ! ناراضگی تو نہیں۔ ہاں انہیں افسوس بہت ہے کہ ان کے اکلوتے بیٹے کی پہلی تقریب میں تم شریک نہیں ہوئیں اور ابا میاں نے تو خاص طور سے تمہیں بلوانے کے لیے ہی ہمیں بھیجا ہے۔"

نادیہ پریشان ہو گئی۔

"آج...... لیکن آج میں کیسے جا سکتی ہوں نازلی؟" اس کے لہجے میں بڑی بے بسی تھی۔ "یقین مانو آج اگر یہ ٹورنامنٹ نہ ہوتا تو ضرور چلتی میرا دل خود بے چین ہے پھوپھا اور پھوپھی حضور کو دیکھے مدتیں گزر گئی ہیں لیکن...... میں......"

اس نے ان تینوں پر ایک نظر ڈالی۔ نازلی اور فوزیہ ایک طرف چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ منصور نے سامنے پڑے رسالوں کی ورق گردانی شروع کر دی تھی۔ نادیہ کا جملہ ختم ہوتے ہی منصور نہایت تلخی سے بولا۔

"ہمیں آپ کی مجبوریوں کا بخوبی اندازہ ہے نادیہ وجاہت علی! مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہمیں اجازت دیجیے شام سے پہلے پہلے اسلام پور پہنچنا ہے۔"

اسی لمحہ مریم گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی تینوں کو خاموش بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر نادیہ کے نزدیک جا کر سرگوشی میں بولی۔

"جلدی چلو نادیہ...... لنچ ٹائم ختم ہوئے بھی پندرہ منٹ گزر چکے ہیں فیلڈ میں سب تمہارے منتظر ہیں۔" نادیہ نے چونک کر مریم کی طرف دیکھا پھر ان تینوں کی طرف دیکھتے

ہوئے بولی۔

"اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم لوگ بھی میرے ساتھ فیلڈ پر چلو۔ تھوڑی تفریح رہے گی۔" فوزیہ فوراً رضامند ہو گئی۔ نازلی نے بڑے تذبذب میں منصور کی طرف دیکھا وہ بیزار سا ایک طرف کھڑا تھا۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی نادیہ ہنس پڑی۔ قریب جا کر بولی۔

"بیرسٹر صاحب! میرا کھیل دیکھنے نہیں چلیں گے۔"

"جی...... نہیں...... بہت بہت شکریہ۔" منصور نے تھپڑ سا کھینچ مارا۔ "ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ مجبوری ہے۔" اور دروازے کی طرف بڑھ گیا نادیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے اس جواب کی امید نہیں تھی۔

"کوئی بات نہیں میں بھی مجبور نہیں کروں گی۔" لہجہ خاصا سخت تھا۔ "اچھا پھر خدا حافظ نازلی...... بائی بائی فوزی۔" اس نے آگے بڑھ کر فوزیہ کی پیشانی چومی اور اس قدر تیزی سے کمرے سے نکل گئی کہ منصور بھی ہکا بکا رہ گیا۔ پھر وہ دونوں بھی خاموش خاموش سر جھکا کے منصور کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئیں۔ گیٹ کے قریب رک کر انہوں نے دور فیلڈ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی سامنے ہی اور ٹیموں کے ساتھ اس کے کالج کی ٹیم بھی کھڑی تھی اور ان سب سے آگے اس ٹیم کی کپتان تھی جس کی سفید رنگت دھوپ اور گرمی کی تمازت سے سنولا گئی تھی جس کے بال اسکارف میں بندھے ہونے کے باوجود ہوا سے منتشر تھے اور جس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں نامعلوم سوچوں کے عمیق سمندر میں غرق تھیں۔ فوزیہ کو بڑی مدت بعد ابا حضور یاد آ گئے۔ وہی قد...... وہی رنگت اور بالکل ان ہی جیسی سوچوں میں ڈوبی ہوئی خمار آلود آنکھیں۔ اس کا بے اختیار دل چاہا بھاگ کر اپنی اتنی پیاری سی بہن کی گردن میں بازو ڈال کر لپٹ جائے۔ بلا سے اگر منصور بھائی بگڑیں یا پھوپھی حضور خفا ہوں۔ اب ایسا بھی کیا کہ وہ ان سب کے لیے اپنی نادیہ ہی کو چھوڑ دے۔ وہ جلدی سے فیصلہ کن انداز میں مڑی اور منصور کا بازو تھام کر بولی۔

"منصور بھائی پلیز میں نادیہ کا کھیل دیکھوں گی گھنٹہ دو گھنٹہ بعد چلے جائیں گے۔"

"بے وقوف مت بنو۔" منصور نے اس کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹ کر موٹر میں ڈال دیا۔

"اسے تمہاری پرواہ بھی نہیں ہے اور تم ہو کہ اس کی محبت میں مری جا رہی ہو۔"

"ایسی بات نہیں منصور بھائی! ایسے میں وہ جا بھی کیسے سکتی تھیں۔" فوزیہ رو پڑی نازلی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے لیکن منصور نے ان کی پرواہ کیے بغیر کار اسٹارٹ کی اور فل اسپیڈ پر ڈال دی۔

☆

"نادیہ..... نادیہ وجاہت۔ ارے میں نے کہا نادیہ وجاہت علی۔" مریم عاجز آ کر چلا پڑی۔ نادیہ نے کاہلوں کی طرح انگڑائی لے کر کروٹ بدل لی۔

"میں کب سے تمہیں آوازیں دیئے جا رہی ہوں اور تم ہو کہ جواب ہی نہیں دیتیں۔" آخر کار مریم نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"خدا کی پناہ..... مریم! کون سی آفت نازل ہو گئی ہے۔" وہ آنکھیں بند کیے کیے ہی بڑبڑائی۔ "تمہاری نیندیں تو اڑ چکی ہیں لیکن دوسروں کی نیندیں خراب کر کے کیوں پریشان کرتی ہو۔ اف کتنا چیختی ہے یہ لڑکی۔"

"ابھی دس منٹ پہلے کون کتاب پڑھ رہا تھا۔"

نادیہ کو ہنسی آ گئی۔

"تو دس منٹ بعد نیند آ گئی۔ کیا نہیں آ سکتی ہے۔"

"اچھا تو جاؤ سوؤ۔ نخرے ہی کیے جا رہی ہیں بے چاری۔"

"ناراض تو نہ ہو۔ واقعی نیند آ گئی تھی۔ چلو اب بتاؤ کیا کہنے جا رہی تھیں دیکھو پوری کی پوری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔" نادیہ نے تکیہ پر سے سر اٹھا کر اس کے سامنے آنکھیں پھاڑ دیں۔ مریم کو بھی ہنسی آ گئی۔

"میں دراصل یہ پوچھنا چاہ رہی تھی نادیہ کہ کل سے جو یہ آٹھ روز کی چھٹیاں ہو رہی ہیں ان میں کیوں نہ کوئی بھڑکتا سا پروگرام بنا ڈالا جائے۔"

نادیہ نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا پھر سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر آہستہ سے بولی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میں تو سمجھی کہ نامعلوم کون سا اہم مسئلہ آن کر اٹک گیا ہے۔ ارے میری جان! یہ اس وقت رات کے بارہ بج کر دس منٹ پر کسی سوئی ہوئی شریف لڑکی کو جگا کر محض اتنی سی بات پوچھنا تھی۔" مریم ہنسے جا رہی تھی۔

"بنو مت۔ اچھی خاصی تو جاگ رہی تھیں۔ پھر یہ اتنی سی بات بھی نہیں ہے۔ اہم مسئلہ ہے۔"

"میں تو تقریباً سو چکی تھی مریم بیگم صاحبہ!" اس نے جھٹ سے ریشمی لحاف میں اپنا چہرہ چھپا لیا لیکن فوراً ہی لحاف میں سے چہرہ نکال کر بولی۔

"اطلاعاً عرض ہے کہ میں ان چھٹیوں میں اسلام پور جانا چاہتی ہوں اس سے قبل کہ وہ سب کے سب دوبارہ یہاں آن کر مجھے جان ہی سے مار دیں۔"

"تو یوں کہو۔ منصور بھائی یاد آ رہے ہیں۔ ہاں بھئی چیز ہی ایسی ہیں۔"

"ایسی کوئی اہم چیز بھی نہیں ہیں۔ بیرسٹری تو کر لی ہے لیکن حرکتوں سے تو کوتوال شہر معلوم دیتے ہیں۔ دراصل سوچتی ہوں اگر اب بھی نہ گئی تو پھوپھی حضور عاق ہی کر دیں گی۔"

"اور ساتھ ہی یہ بھی ڈر ہو گا کہ اگر انہوں نے عاق کر دیا تو..... منصور بھائی کیسے ملیں گے۔" مریم ستانے پر اتر آئی تھی۔

"تھپڑ مار دوں گی۔ بہت بولنے لگی ہو۔"

"اس میں بھلا تھپڑ مارنے والی کون سی بات ہے۔ اچھے لوگ سب ہی کو یاد آتے ہیں۔ اب اگر تم منصور بھائی کو یاد کرو تو....." نادیہ نے ہاتھ بڑھا کر مریم کا کمبل کھینچ کر دور پھینک دیا۔

"لو اب سکڑو سردی میں۔" مریم ہنستی ہوئی اٹھی کمبل اٹھایا اور اپنے اردگرد لپیٹ کر بولی۔

"خیر آپ مانیں یا نہ مانیں بات تو سولہ آنے سچ ہے۔ ویسے میرا بھی یہی خیال تھا کہ اس دفعہ خیریت اسی میں ہے کہ تم وہاں چلی جاؤ۔"

"مشورے کا شکریہ۔" نادیہ نے دوسری کروٹ بدل لی اور پھر نامعلوم کب سو گئی۔

☆

"نازلی! کیا سو گئیں؟" فوزیہ نے دھیرے سے آواز دی۔

"نہیں تو..... کیوں۔ کوئی خاص بات؟" اس نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں یہ سوچ رہی تھی۔ کل اتوار ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھوپھا حضور ہم دونوں کو گلزار نگر بھیج دیں۔"

"نادیہ یاد آ رہی ہے؟" نازلی نے چھیڑا۔

''نہیں...تو...... ہاں......بس کتنے دن ہو گئے آپی سے ملے ہوئے۔ اس دن گئے بھی تو ایک گھنٹہ بعد ہی واپس آ گئے۔ اس کے بعد سے ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ شاید...... وہ......'' فوزیہ رک گئی۔

''ہاں...... ہاں...... کہو'' نازلی نے پوچھا۔ ''رک کیوں گئیں۔''

''شاید وہ منصور بھائی کی باتوں کی وجہ سے ہم سب سے ہی ناراض ہو گئی ہیں۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ فضول خیالات سے اپنے ذہن کو کیوں الجھاتی ہو۔ نادیہ کا غصہ بھی وقتی ہوتا ہے۔ بعد میں سب بھول بھال جاتی ہے۔ ویسے صبح ابا میاں سے کہوں گی وہ ضرور بھیج دیں گے۔''

''مگر نازلی!......'' فوزیہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''منصور بھائی سے ڈر لگتا ہے۔ عین وقت پر کوئی گڑبڑ نہ کر دیں۔''

''ان کی طرف سے تو مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ اس روز زبردستی ہی ساتھ جانے کے لیے پیچھے لگ گئے۔ اگر نہ جاتے تو ہم لوگ مزے سے سارا دن نادیہ کے ساتھ گزار کر شام کو واپس آ جاتے۔ اگر بالفرض منصور بھائی نے کوئی گڑبڑ کی یا ہمیں وہاں جانے سے روکا تو...... میں سب سنبھال لوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔''

فوزیہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''انہیں کیا معلوم کہ امی اور ابا حضور کو کھو کر ہم لوگ کتنے تنہا رہ گئے ہیں۔ چھ سات سال کا وہ طویل عرصہ جب گلزار نگر میں ہمارا اپنا کوئی بھی نہیں رہا تھا بلکہ ہمیں اپنا کہتے ہوئے بھی لوگ ڈرتے تھے۔ ایسے میں آپی نے کس حوصلہ اور ہمت سے وہ کٹھن وقت گزارا ہے۔ میں نے کبھی انہیں پریشان یا روتے بسورتے نہیں دیکھا۔ انہیں تو سب سے زیادہ فکر میری رہتی تھی، مجھے تسلیاں دیتیں یہ باور کراتیں کہ امی حضور زندہ ہیں باغیوں کے خوف سے کہیں چھپ گئی ہیں۔ ایک نہ ایک دن ضرور وہ آ کر ہمیں ملیں گی ذرا حالات ٹھیک ہو لیں۔ پھر میں تو تمہارے پاس ہوں میرے ہوتے ہوئے تم نہ پریشان ہوا کرو نہ رویا کرو۔ ورنہ یاد رکھو فوزی میں ہمت ہار بیٹھوں گی اور اب کتنے عرصے میں یہاں تم سب کے پاس ہوں اور آپی...... وہ وہاں بالکل اکیلی ہیں۔'' وہ رضائی میں منہ چھپا کر رو پڑی۔ نازلی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہ اپنی مسہری سے اتر کر فوزیہ کی مسہری پر آ گئی۔

''فوزیہ!'' نازلی نے اپنا ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔ ''بری بات روتے نہیں۔ ہم کل ہی نادیہ کے پاس چلیں گے۔ منصور بھائی کی کیا مجال کہ ہم لوگوں کو وہاں جانے سے روکیں۔'' جواب میں فوزیہ نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ نازلی کے ہاتھ پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

صبح ناشتے کی میز پر فوزیہ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نازلی بھی خاموش تھی۔ عابدہ بیگم نے بڑے غور سے دونوں کی طرف دیکھا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے فوزیہ بیٹی؟'' وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

''جی...... میں تو بالکل ٹھیک ہوں پھوپھی حضور!'' چونک کر فوزیہ نے نظریں اٹھائیں تب ہی چائے پیتے پیتے منصور نے بھی اس کی طرف دیکھا۔

''سفید جھوٹ، یقیناً تم روتی رہی ہو۔''

''نہیں...... نہیں تو منصور بھائی! خوامخواہ ہی...... آپ......'' وہ گھبرا رہی تھی۔ اپنی اس گھبراہٹ کو چھپانے کے لیے اس نے سر جھکا کر جلدی سے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگا لی۔

''ابا میاں آج آپ کی گاڑی ہمیں مل سکتی ہے؟'' نازلی اس کو بچانے کی خاطر فوراً بول پڑی۔

''کیوں خیریت کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' رشید احمد نے سوال کیا۔

''میں اور فوزیہ گلزار نگر جانا چاہتی ہیں۔'' نازلی نے بڑی ہمت کر کے مدعا بیان ہی کر دیا۔

''نادیہ کے پاس۔''

''جی ہاں......ابا میاں۔''

عابدہ بیگم نے سر اٹھا کر فوزیہ کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے بولیں۔ ''یہ غریب نادیہ کے لیے کتنی بے چین رہتی ہے لیکن اس لڑکی کو کسی سے بھی محبت نہیں۔ کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔''

فوزیہ چپ چاپ سر جھکائے چائے کے گھونٹوں کے ساتھ آنسو بھی پیتی رہی۔

''آپی کو سب ہی برا کیوں کہتے ہیں؟'' اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔

منصور نے جھک کر بڑے معنی خیز انداز میں فوزیہ کی سوجی سوجی سرخ آنکھوں کی طرف دیکھا پھر ہنستے ہوئے بولا۔

''گلزار نگر جانا تھا تو کہہ دیا ہوتا۔ رو رو کر اتنی اچھی آنکھیں تباہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آئینہ دیکھا ہے۔ بٹن لگ رہی ہیں۔''

فوزیہ مسکرا دی۔

''یہ ساری رات روتی رہی ہے منصور بھائی!'' نازلی نے بتایا۔

''اللہ اس غریب پر رحم کرے۔ ارے بی بی کسی ایسی ہستی کے لیے یہ قیمتی آنسو بہائے ہوتے جو قدر کرتی۔ تمہاری بہن کے نزدیک ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔''

''آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں منصور بھائی ورنہ...... میں ان کے پاس واپس چلی جاؤں گی۔'' فوزیہ نے یہ جملہ بڑی آہستگی سے صرف منصور کو سنانے کے لیے کہا تھا۔ عابدہ بیگم تو نازلی کے اس جملے پر کہ ساری رات روتی رہی چونک اٹھی تھیں۔ شکایت آمیز لہجے میں بولیں۔

''بیٹی! کتنی بری بات ہے۔ مجھے اس وقت کتنی تکلیف ہوئی ہے یہ سن کر کہ تم ساری رات روتی رہیں۔ میں نے تو کبھی بھی تمہیں نادیہ کے پاس جانے سے نہیں روکا۔ دیکھو تو کیسا چہرہ اتر گیا ہے۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں پھوپھی حضور'' وہ جلدی جلدی آنسو ضبط کر کے مسکرا دی۔

''ہاں...... تو ابا میاں۔'' پیالی پرچ میں رکھتے ہوئے منصور بولا۔ ''آج دوپہر کھانے کے بعد ان دونوں کو روانہ کر دیا جائے گا۔''

''تنہا کیسے روانہ کر دو گے۔ بچیوں کے ساتھ تم کو بھی جانا ہوگا۔ واپسی پر دیر بھی ہو سکتی ہے۔'' میز پر سے اٹھتے ہوئے رشید احمد نے فیصلہ سنایا۔

''لیکن......ابا میاں۔'' منصور نے گڑبڑا کر کچھ کہنا چاہا پر وہ جا چکے تھے۔

''اچھا بیٹی جاؤ تیار ہو جاؤ'' انہوں نے فوزیہ کو لپٹا کر پیار کر لیا۔ ''ایک بجے تک روانہ ہو جانا تا کہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے گھر لوٹ سکو۔'' عابدہ بیگم بھی کھڑی ہو گئیں۔ پھر جاتے جاتے رک کر بولیں۔

''ہاں...... اگر نادیہ کی مرضی ہو اور وہ آنا چاہے تو ساتھ لیتی آنا۔ کتنے دن ہو گئے

ہیں اس لڑکی کو دیکھے ہوئے۔'' ان کی آواز میں موہوم سی لرزش تھی۔ ''اسے کیا معلوم کہ اسے دیکھ کر اس سے بات کر کے مجھے کتنا سکون ملتا ہے۔ یہ احساس ہی کیا کم ہے کہ جیسے میں وجاہت سے مل لی ہوں۔ اس سے باتیں کر لی ہوں...... اور......'' وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔

منصور نے بڑے تمسخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے نازلی اور فوزیہ کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن فوزیہ کے اجڑے اجڑے پریشان چہرے پر کچھ ترس آ گیا۔ پھر بھی طنزیہ انداز میں بولا۔

''امی جان بھی کیسے کیسے لوگوں سے غلط توقعات وابستہ کر لیتی ہیں۔''

''کچھ غلط بھی نہیں کرتی ہیں۔'' نازلی نے پٹ سے جواب دیا۔

''کچھ صحیح بھی نہیں کرتی ہیں۔'' اس کا جواب تھا۔

''آپ...... آپی سے اتنے خفا کیوں رہتے ہیں منصور بھائی!'' بڑی دیر بعد فوزیہ نے گفتگو میں حصہ لیا، منصور کو ہنسی آ گئی۔

''یہی تو مصیبت ہے فوزیہ بی بی! اس لڑکی سے خفا ہونا چاہوں بھی تو نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس کی ضد اور خود سری پر غصہ ضرور آتا ہے۔ انسان کو اتنا منہ پھٹ بھی نہیں ہونا چاہیے لحاظ بھی کوئی چیز ہے۔''

''آپ کو کیا معلوم آپ تو انگلینڈ میں تھے۔ ان پچھلے سالوں میں انہوں نے کتنے دکھ جھیلے ہیں۔ کتنی تنہا رہی ہیں۔ آپ میں سے کسی نے بھی تو ہماری خبر نہیں لی تھی۔ اپنی ہی جانیں بچا کر شہر چھوڑ گئے تھے۔ اپنوں کی اس خود غرضی سے لاتعلقی ہی نے ان کے مزاج اور زبان میں تلخی پیدا کر دی ہے۔ انہیں کسی بھی رشتے پر اعتماد نہیں رہا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو لیکن تم لوگ کیا جانو کہ ہم لوگ کتنے مجبور ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود ابا میاں کسی نہ کسی ذریعے سے تم لوگوں کی خیریت دریافت کرتے رہتے۔ پرنسپل کو ہدایات بھی بھجواتے رہتے تھے۔''

فوزیہ خاموش رہی۔

وہ بھی کچھ دیر تک چپ چاپ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر بڑی خاموشی سے بنا کچھ کہے سنے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے ہی نازلی اور فوزیہ بھی کمرے سے باہر آ گئیں۔

ایک گھنٹے بعد جب منصور تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر آیا تو حسب معمول پرانے موڈ میں تھا کچھ دیر پہلے ناشتے کی میز پر جس افسردگی اور خفگی کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا اب دور دور تک اس کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ نوکر سے نازلی اور فوزیہ کو باہر آنے کا کہہ کر خود پورچ میں کھڑی گاڑی اسٹارٹ کی اور کار کو تیزی سے گیٹ کی طرف لے جانا چاہ رہا تھا کہ اچانک سامنے آ جانے والی ٹیکسی کو بچانے کی خاطر اس کے پاؤں بریک پر پڑے اور گاڑی زبردست چیخ کے ساتھ رک گئی۔

ٹیکسی رکنے سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور نادیہ کود کر باہر آ گئی۔ منصور نے کھڑکی میں سے سر نکال کر ڈرائیور کو گھورا تھا کہ نادیہ پر نظر پڑتے ہی ششدر رہ گیا۔

''خدا کی پناہ یہ آپ تھے منصور بھائی۔'' اس پر نظر پڑتے ہی نادیہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''وہ تو غنیمت ہوا میں تو اناڑی ڈرائیور سمجھ کر ڈانٹنے ہی والی تھی۔''

''تو یہ آندھی طوفان کی طرح آپ تشریف لا رہی تھیں۔'' منصور نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ نادیہ نے مسکراتے ہوئے اپنا ننھا سا سفید ہاتھ زور سے اس کے ہاتھ پر پٹخ دیا۔

''خدا سے ڈریئے۔ آندھی طوفان خود بنے ہوئے تھے۔ کیا کسی سے لڑ کر جا رہے تھے۔''

''اپنی طرح ہر ایک کو لڑاکا سمجھتی ہو۔'' وہ زور سے ہنس پڑا۔

''پہلے یہ تو بتاؤ یہ تم کہاں سے آ ٹپکیں۔ میں تو سمجھا تھا کب کی مر کھپ چکی ہو گی۔''

''دشمنوں کی خواہشات کبھی نیک نہیں ہوتیں۔''

منصور کو ہنسی آ گئی۔ فوراً ہی دونوں کو ٹیکسی والے کا دھیان آیا پھر نادیہ کو اپنے سامان کا۔

''حد ہے بھئی۔'' مہمان کا سامان تک تو ابھی اترا نہیں اور آپ نے لڑنا شروع کر دیا۔

''اچھا تو گویا آپ معہ ساز و سامان کے تشریف لائی ہیں۔''

''آپ کی جان کیوں نکل گئی۔ اپنی پھوپھی کے گھر آئی ہوں۔'' پرس میں سے پیسے نکالتے ہوئے بولی۔ ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا اس دلچسپ گفتگو سے خاصا لطف اندوز ہو رہا تھا۔ منصور نے جھٹ جیب سے ایک نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''شکریہ۔'' نادیہ شرارت سے ہنسی پھر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

''اب ذرا ڈکی سے سامان بھی اتروا لیجیے گا۔ میں پھوپھی حضور اور فوزی سے ملنے اندر

جا رہی ہوں۔''

''سامان خود اتاریئے جناب! میں کسی کا قلی نہیں ہوں۔'' منصور چلایا لیکن وہ دوپٹہ سنبھالتی تقریباً بھاگتی ہوئی گیلری میں غائب ہو چکی تھی۔

نادیہ کیا آئی کہ منٹوں میں گھر بھر میں طوفان اٹھ پڑا۔ فوزیہ اور نازلی کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا لیکن عابدہ بیگم بھی کچھ کم خوش نہ تھیں۔ پہلے تو اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر یقین ہی نہ کر پائیں کہ واقعی یہ نادیہ ہو سکتی ہے۔ پھر یقین آتے ہی اسے لپٹا کر بے شمار پیار کر ڈالے۔ ساتھ ہی ساتھ ڈانٹتی بھی جاتی تھیں۔ آخر نادیہ نے ان کے رخسار چوم کر بڑی معصومیت سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مجھے معاف کر دیں۔ آپ تو سچ مچ بہت خفا ہیں پھوپھی حضور!'' عابدہ بیگم کو ہنسی آ گئی۔ اپنے قریب ہی بٹھاتے ہوئے بولیں۔

''یقین مانئے پڑھائی پھر امتحانات ان سب نے اتنا مجبور کر دیا تھا کہ آپ کے پاس آ ہی نہ سکی۔''

''میں اور نازلی بس آپ کو لینے کے لیے نکلنے ہی والے تھے۔'' فوزیہ نے بتایا۔

''اور میں ہر چھٹی پر تم لوگوں کا انتظار کرتی تھی۔''

''انتظار کرتی تھیں، یہ توفیق نہیں ہوتی تھی کہ خود چلی آتیں۔'' ایک بار پھر ڈانٹ پڑی اور وہ تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''آپ کا سامان کہاں ہے آپی؟'' فوزیہ کے پوچھنے پر اسے کچھ یاد آیا۔

''وہ...... وہ تو باہر ہی ہے ٹیکسی میں، منصور بھائی کے حوالے کر کے آئی ہوں۔''

''اچھا تو منصور میاں سے باہر ہی ملاقات ہو گئی۔'' عابدہ بیگم نے پوچھا۔

''کچھ ایسی ویسی...... نہایت خوفناک قسم کی۔ شکر کیجیے آپ کا بیٹا بچ گیا۔ ورنہ ان بی بی نے ٹکر مارنے میں تو کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔'' کمرے میں آتے ہی منصور نے چھوٹا سا اٹیچی نادیہ کے سامنے پٹخ دیا۔ عابدہ بیگم گھبرا گئیں۔

''خیر تو ہے، کیا ہوا تھا؟'' نادیہ ہنس پڑی۔ منصور ماں کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''یہ تو اپنے پیشے کا بھرم رکھ رہے ہیں۔ ویسے پھوپھی حضور یہ اتنے اناڑی پن سے گاڑی چلاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔'' نادیہ نے واقعہ کی نزاکت بیان کرنا چاہی۔

"میری ٹیکسی ان کی گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی ہے۔"

"خدا سے ڈرو۔ تم خود ہی تو آندھی طوفان کی طرح ٹیکسی لیے مجھ پر جھپٹ پڑی تھیں۔ سچ کہتا ہوں امی جان اگر ایک سیکنڈ میں بریک نہ لگاتا تو...... میری لاش......"

"کیوں خوامخواہ جھوٹ بول کر پھوپھی حضور پر رعب ڈالنا چاہتے ہو۔" نادیہ نے عابدہ بیگم کی پریشانی بھانپ کر جلدی سے اسے روکا۔

"ہماری گاڑیاں کافی فاصلے پر رک گئی تھیں اور یہ خوامخواہ اپنی اہمیت جتانے کے لیے داستان گھڑے جا رہے ہیں۔" نادیہ نے ہنستے ہوئے سارا واقعہ عابدہ بیگم کو سنا دیا۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس نے دونوں کو بچا لیا۔" انہوں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

"دونوں کو نہیں امی جان صرف آپ کے بیٹے کو۔"

"اچھا بس چپ رہو۔ ہر وقت بری بری باتیں زبان سے نہ نکالا کرو۔" عابدہ بیگم نے ڈانٹ پلائی۔

"امی جان!" تھوڑی دیر بعد منصور نہایت سنجیدہ شکل بنا کر بولا۔

"آپ تو اپنی ان بھتیجی صاحبہ سے بہت خفا تھیں۔"

وہ مسکرا دیں۔

"جس سے بہت زیادہ محبت ہو اسی پر غصہ بھی زیادہ آتا ہے سمجھے۔" انہوں نے بتایا۔

"حالانکہ بے چاری کو اچھی خاصی ڈانٹ پڑ چکی ہے۔" نازلی نے تسلی کے لیے اضافہ کیا۔

"صرف ڈانٹ؟ پر مجھے تو اس کا بھی کوئی اثر نظر نہیں آ رہا۔" وہ نازیہ کے ہنستے مسکراتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تو...... اور چاہتا کیا تھا لڑکے۔ میں پیار کی ڈانٹ ہی دے سکتی ہوں۔"

"پھوپھی حضور!" نادیہ ان کے کندھے سے سر ٹکا کر بولی۔ "یہ ہوتے نا تو مار کر گھر ہی سے نکال دیتے۔ ویسے گاڑی کو ٹکرا ہی رہے تھے۔"

"یہ تو پگلا ہے۔" عابدہ بیگم نے بڑے پیار سے نادیہ کے مسکراتے ہوئے چہرے پر بکھرے بالوں اور چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر وہ لمحوں میں حال سے بھٹک کر ماضی میں پہنچ گئیں۔ تلخ یادیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں اس کا احساس تو انہیں پہلے ہی سے تھا لیکن اس وقت ان کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ انہیں وہ دن یاد

آ گیا تھا جب نادیہ پیدا ہوئی تھی اور ماں کی موت کے باعث نواب وجاہت علی نے زنان خانے کا راستہ ہی چھوڑ دیا تھا۔ انہیں اپنی نومولود بچی کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہیں تھا تب ہی عابدہ بیگم نے ان کے پاس جا کر التجا کی تھی کہ ماں کی موت کی سزا اس معصوم کو یوں نہ دینا وجاہت! کہ وہ باپ کی نفرتوں کے سائے میں پروان چڑھے۔"

"ارے آپ کہاں گم ہو گئیں پھوپھی حضور! کیا منصور بھائی کی ان اونٹ پٹانگ باتوں نے آپ کو پریشان کر دیا۔" نادیہ نے انہیں کندھے سے پکڑ کر ہلا دیا۔ وہ ہنس پڑیں۔

"کچھ نہیں میری جان! دراصل مدتوں بعد تم سب کو اس گھر میں جمع ہنستے بولتے دیکھ کر کھو سی گئی تھی اچھا چلو اٹھو تو۔" وہ اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے بولیں۔ "اب جا کر غسل کر کے لباس تبدیل کر لو۔ ہاں نازلی! بہن کے لیے کمرہ ٹھیک کروا دینا۔ میرے خیال میں فوزیہ کے برابر والا کمرہ ٹھیک رہے گا۔"

"نہیں پھوپھی حضور۔" نادیہ ان دونوں کے ساتھ ہی کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"میں تو فوزی کے کمرے میں رہوں گی۔ بھلا میرے لیے الگ کمرے کی کیا ضرورت ہے۔"

"کمرہ تو موجود ہے بیٹی! ایک کمرے میں رہ کر تم دونوں ہی کو تکلیف ہو گی۔" نادیہ نے مڑ کر فوزیہ کی طرف دیکھا شاید اس کا منشا بھی یہی تھا کہ وہ دونوں جو اتنے دنوں بعد ملی ہیں ایک ہی کمرے میں رہیں پھر بھی مروتاً بولی۔

"ٹھیک تو ہے آپی! اگر آپ کو تکلیف ہو تو؟" نادیہ ہنس پڑی جملہ پورا ہونے سے قبل ہی وہ آگے بڑھی اور فوزیہ کو پیار سے لپٹا کر پیشانی چوم لی۔

"فوزیہ جان! اتنے سارے دنوں بعد تو تمہارے پاس لیٹ کر گپیں مارنے اور تمہیں ستانے کا موقع ملا ہے اور تم کہتی ہو آپ کو تکلیف ہو گی۔ پھوپھی حضور آپ میری فکر نہ کریں میں اسی کمرے میں رہوں گی۔" عابدہ بیگم بھی مسکرا دیں۔

"جیسی تم لوگوں کی مرضی...... اچھا غسل کر کے لباس تو تبدیل کر لو۔"

وہ تینوں کمرے سے باہر نکل آئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے منصور بھی باہر آ گیا۔ فوزیہ کے نزدیک آن کر سرگوشی میں بولا۔

"چ...... چ...... بے چاری بچی کتنی جلدی اور کتنی آسانی سے بے وقوف بن گئی۔"

"کیوں بے وقوف کیوں بنی؟" فوزیہ نے جل کر پوچھا۔ نازلی زور سے ہنس پڑی۔

"ارے فوزی یہ حضرت بڑے حضرت ہیں۔ یہ تم کو نادیہ کے خلاف بھڑکانا چاہ رہے ہیں۔"

"اور جیسے میں ان کے بھڑکانے میں آ ہی جاؤں گی۔ اس خوش فہمی میں نہ رہیں۔"

"اگر یہ دھندا نہ کریں تو بے چاروں کی بیرسٹری کس طرح چلے گی۔" نادیہ نے جملہ کسا۔

"کیوں منصور بھائی! کیا بیرسٹری میں یہ سب بھی ہوتا ہے۔ مطلب ایک دوسرے کو لڑوانا، لگائی بجھائی کرنا، جھوٹ بولنا وغیرہ وغیرہ۔" فوزیہ نے معصومیت سے اتنے سارے سوالات کر ڈالے۔ منصور کو ہنسی آ گئی۔

"ارے بی بی تم کیا جانو۔ کیا کیا ہوتا ہے۔ ویسے آپ فرمایئے نادیہ بیگم پرچے کیسے ہوئے؟ آئندہ کیا پروگرام ہے؟" اس نے براہ راست نادیہ سے سوال کیا۔

"خدا کا شکر ہے۔ پرچے بہت اچھے ہوئے ہیں۔ فرسٹ ڈویژن تو کہیں نہیں گئی۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے آئندہ سال یہ خاکسار یعنی نادیہ وجاہت علی میڈیکل کالج میں داخلہ لے رہی ہے۔"

منصور نے بڑے تمسخرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "یعنی آپ ڈاکٹر بنیں گی۔ سبحان اللہ لوگوں کو مارنے کی کوئی اور ترکیب نہیں سوجھی تھی۔"

"آپ کو مارنے نہیں آؤں گی۔ اس فکر میں دبلے نہ ہو جایئے گا۔" اس نے نہایت بے پرواہی سے جواب دیا۔

"خدا مجھے ہر آفت سے محفوظ رکھے۔"

"آمین۔" نادیہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"تمہیں یقین ہے گلزار نگر کے میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے گا؟" منصور نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"بالکل یقین ہے بلکہ......" وہ ایکدم رکی جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ "یاد آیا آپ کے ایک دوست ڈاکٹر عامر ہیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میڈیکل کالج میں داخلہ آسانی سے دلوا دیں گے۔ ویسے میرا رزلٹ اتنا اچھا ہوگا کہ کسی سفارش کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"اچھا...... تم اس سے کب ملی تھیں؟" منصور نے حیرانی سے پوچھا۔

"کئی بار مل چکی ہوں لیکن ابھی پچھلے ہی مہینے داخلہ ہی کے سلسلے میں ان کو فون بھی کیا تھا۔"

"ہوں...... اچھا پھر اس نے وعدہ کر لیا؟" منصور سنجیدہ ہو گیا۔ "ویری گڈ لیکن بالفرض تم تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئیں۔ تو بھی یہ ڈاکٹر عامر داخلہ دلوا دیں گے؟"

"بند کریں اپنی کالی زبان۔" وہ چڑ گئی۔ "خدا کا شکر ہے اور یہ یقین بھی کہ اگر پوزیشن نہ لی تو...... فرسٹ کلاس تو آ ہی جاؤں گی۔"

"بہت خوب...... خوش فہمی کچھ زیادہ ہی ہے۔" نادیہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"آپ سے زیادہ ذہین ہوں۔ بھول گئے۔ میٹرک میں آپ سیکنڈ ڈویژن تھے اور میں فرسٹ ڈویژن لائی تھی۔" منصور کو ہنسی آ گئی۔

"مانتا ہوں لیکن تمہیں یہ تو یاد ہوگا کہ وہ امتحان میں نے بغیر پڑھے ہی دیا تھا۔"

"اوہ، اب جانے بھی دیجیے۔ جب تو پھوپھا حضور نے بیٹے کی عزت رکھنے کے لیے رشوت دی ہوگی۔" اور اس کا جواب سنے بغیر ہی تیزی سے کمرے کے اندر چلی گئی۔

☆

وقت کتنی برق رفتاری سے اپنی مسافت طے کر جاتا ہے اس کا احساس انسان کو روزمرہ کے معمولات میں قطعی نہیں ہوتا۔ نادیہ کو بھی وقت کی قدر اسلام پور آنے کے بعد ہی ہوئی ورنہ ہوسٹل میں تو گھڑی دیکھ دیکھ کر وقت گزارا جاتا تھا اور یہاں پلک جھپکتے میں پندرہ دن گزر گئے۔ دعوتیں، پارٹیاں، نت نئے تفریحی پروگرام جو ہر روز نادیہ کے اعزاز میں بنائے جاتے تھے۔ اب وہ سوچ رہی تھی گلزار نگر جانے کے بعد کتنی شدت سے یاد آئیں گے، یہ دن کتنی تنہائی محسوس ہوگی۔ امتحان کا نتیجہ نہیں آیا تھا لیکن عامر کے توسط سے میڈیکل کالج میں داخلے کا تقریباً بندوبست ہو چکا تھا۔ جس دن کی صبح اسے گلزار نگر واپس جانا تھا اس رات کتنی دیر تک وہ عابدہ بیگم کے کمرے میں ان کی گود میں سر رکھے دنیا جہاں کی باتیں کرتی رہی تھی۔ عابدہ بیگم پرانے قصے سنا رہی تھیں اور وہ خاموش آنکھیں پھاڑے پھاڑے غور اور دلچسپی سے ابا حضور اور امی حضور کے قصے سننے میں مصروف تھی۔ ایک خاندان ایک ہی کنبہ کے لوگ بھی اخلاقی طور پر ایک دوسرے سے کتنے دور ہوتے ہیں۔ نازلی اور فوزیہ

بھی پاس موجود تھیں لیکن عابدہ بیگم ان دونوں کو نظر انداز کیے صرف نادیہ سے مخاطب تھیں۔

''ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ ''وجاہت کو خاندان کے بعض افراد سے سخت پرخاش تھی وہ ان سے ملنا قطعی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے برعکس ثریا بیگم رشتوں کو جوڑے رکھنے کے حق میں تھیں۔ سو اتنی معمولی سی بات پر ہی اکثر دونوں میں تکرار ہو جاتی۔ ورنہ یقین مانو نادیہ بیٹی ان جیسا نفیس اور محبت کرنے والا جوڑا میں نے اپنی اس زندگی میں تو نہیں دیکھا۔''

نادیہ اور فوزیہ کے چہرے پر دھواں سا پھیل گیا۔ عابدہ بیگم خاموش ہو گئیں۔

''امی جان!'' بڑی دیر بعد نازلی آہستہ سے بولی۔ ''اتنی دیر سے سارے قصے ساری باتیں آپ نادیہ ہی کو سنائے جا رہی ہیں ہم دونوں بھی تو اس کمرے میں موجود ہیں۔'' نادیہ نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے بولی۔

''چلو بہن...... چپ چاپ بیٹھی رہو تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ میں کل جا رہی ہوں۔''

''اور......اس کے بعد نادیہ وجاہت علی ایک سال تک پلٹ کر نہیں آئیں گی۔'' فوزیہ نے لقمہ دیا۔

''اور اگر اس درمیان کوئی بدقسمت بلانے جائے گا تو مار کھائے گا۔'' نازلی کیوں چپ رہتی۔

''سن رہی ہیں آپ پھوپھی حضور! ان نالائقوں کی باتیں۔ کس قدر بدنام کیا ہے ان سب نے مل کر۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

عابدہ بیگم اس نوک جھونک پر مسکرائے جا رہی تھیں۔

''تو کیا یہ جھوٹ ہے آپی! اب تو آپ میڈیکل کی سٹوڈنٹ ہوں گی۔ پھر کاہے کو کسی کو خاطر میں لائیں گی۔''

''ہاں...... بات تو صحیح ہے۔'' نادیہ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ویسے فکر نہ کرو تم لڑکیوں کا سلام لے لیا کروں گی۔'' نازلی اور فوزیہ کے ساتھ ہی عابدہ بیگم بھی زور سے ہنس پڑیں۔ پھر نادیہ کے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولیں۔

''ویسے بات تو ٹھیک ہے نادیہ! تم اب کی گئیں پھر خدا جانے کب آؤ گی۔'' نادیہ نے شکایت آمیز نظروں سے پھوپھی کی طرف دیکھا۔

''آپ بھی پھوپھی حضور! دراصل نازلی، فوزیہ اور منصور بھائی نے آپ کی اس بھتیجی کو

زیادہ ہی بدنام کر دیا ہے۔''

''ایسی بات نہیں میری جان! مجھے تو اپنی اس بھتیجی پر فخر ہے۔''

''صرف اس پر؟'' فوزیہ سے برداشت نہ ہو سکا۔

''نہیں بھئی دونوں پر۔ تم دونوں میرے بہت پیارے بھائی، بھاوج کی اولاد جو ہوئیں۔''

نادیہ نے غور سے پھوپھی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کتنی مشابہت ہے ان میں ابا حضور کی۔ محبت کا وہی انداز اور لہجہ تو بالکل ویسا ہی ہے۔ وہ بھی تو یونہی کہا کرتے تھے۔

''مجھے اپنی دونوں بیٹیوں پر فخر ہے۔'' اس نے بے چین ہو کر دوبارہ اپنا چہرہ ان کی گود میں چھپا لیا۔ پھر نہایت دھیرے پن سے بولی۔

''پھوپھی حضور! میں اکثر گھنٹوں سوچتی رہتی ہوں نہ جانے میری امی حضور کہاں ہوں گی؟ کون جانے ہوں گی بھی یا ظالموں نے ان کو بھی......''

عابدہ بیگم کا دل رو اٹھا لیکن بچیوں کے سامنے آنسو بہائے بغیر بڑے ضبط اور حوصلہ سے بولیں۔

''خدا پر بھروسہ رکھو میری جان! اس نے چاہا تو ایک نہ ایک دن اپنی ماں سے ضرور ملو گی۔ مایوس نہیں ہوتے۔''

ماں کے ذکر کے ساتھ ہی فوزیہ کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ نازلی کا چہرہ شدت ضبط میں سرخ تھا۔ نادیہ نے کن انکھیوں سے دونوں کی طرف دیکھا۔ عابدہ بیگم کا چہرہ جو تھوڑی دیر پہلے مسرت و خوشی سے دمک رہا تھا اب ضرورت سے زیادہ پژمردہ اور نڈھال نظر آ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''اف خدایا! پھوپھی حضور، گھڑی تو دیکھیں رات کے دو بج چکے ہیں۔'' عابدہ بیگم چونکیں۔

''ارے واقعی دیکھو تو باتوں میں وقت کا دھیان ہی نہ رہا۔ بس اب تم لوگ جا کر سو جاؤ صبح جلدی اٹھنا ہے۔''

''لیکن اب تو نیند بھی نہیں آ رہی ہے اماں حضور۔'' نازلی آہستہ سے بولی۔

''پھر بھی لیٹو تو جا کر۔ نیند آ ہی جائے گی۔'' عابدہ بیگم نے سمجھایا۔

نادیہ کے ساتھ فوزیہ اور نازلی بھی اٹھ گئیں۔ عابدہ بیگم نے باری باری تینوں بچیوں کی

پیشانی چومی، دعائیں پڑھ کر پھونکیں، پھر نازلی سے مخاطب ہو کر بولیں۔

''نازلی بیٹا خانساماں سے کہنا صبح ناشتہ پر نادیہ بی بی کے لیے انڈوں کا حلوہ اتنا بنائے کہ ان کے ساتھ بھی کر دیا جائے۔ ہوسٹل میں غریب بچی کو کھانا بھی کتنا ناس مارا ملتا ہوگا۔''

نادیہ مسکرا دی۔ ''ارے نہیں پھوپھی حضور! اچھا خاصا ہی مل جاتا ہے پھر آپ تو جانتی ہیں مجھے جو بھی مل جائے مزے سے کھا لیتی ہوں۔''

''اچھی عادت ہے بیٹا۔ وجاہت بھی اس معاملے میں بڑا قناعت پسند تھا۔ ویسے بھی بچپن سے ہوسٹل میں رہ کر گھر کے کھانوں کا مزہ ہی بھول گئی ہوگی۔''

''شاید ایسا ہی ہو۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''ویسے یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ گزارہ مشکل تھا۔''

''واقعی بہت ہی اچھا ہوا۔'' نازلی نے ہنستے ہوئے تائید کی۔ ''عادت اچھی پڑ گئی۔''

''بقول بزرگوں کے اچھی لڑکیاں سسرال جا کر سڑا بسا جیسا بھی ملے خاموشی سے کھا لیتی ہیں۔'' سب ہنس پڑے۔

''اتنی بھی سیدھی نہیں ہوں۔'' نادیہ اکڑ کر بولی۔

''ویسے اب ہر چھٹی پر جب آپ کے پاس آؤں گی آپی تو کوئی نہ کوئی اچھی سی ڈش بنا کر لے آؤں گی۔'' فوزیہ کو بہن پر بے تحاشہ پیار آ گیا تھا۔ نادیہ نے اسے لپٹا کر پیار کر لیا۔

''پھر تو میں دعا کروں گی کہ ہفتہ میں دو تین چھٹیاں ہوں تاکہ فوزی کے ہاتھ کے بنائے ہوئے مزیدار کھانے کھانے کو ملیں۔''

''ویسے ایک بات ہے نادیہ!'' پھوپھی بولیں۔ ''اپنی فوزیہ کھانا بہت اچھا پکا لیتی ہے۔''

''اتنا بھی اچھا نہیں پھوپھی حضور مجھ سے اچھا تو نازلی پکا لیتی ہیں۔''

''حد ہے بھئی۔'' نادیہ نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔ ''مجھے تو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے کہ آملیٹ تک بنانا نہیں آتا۔

''یہ بھی اچھا ہے۔ کام کاج سے بچی رہوگی۔'' نازلی نے چوٹ کی۔ عابدہ بیگم ہنس پڑیں۔

''اچھا بس باتیں بند۔ اب جا کر سو جاؤ کافی رات ہوگئی ہے۔'' عابدہ بیگم نے یاد دلایا اور وہ تینوں رات کا سلام کر کے ان کے کمرے سے نکل آئیں۔

اسلام پور کی گہما گہمی اور رونقوں کو چھوڑ کر یہاں آنے کے بعد نادیہ کچھ زیادہ ہی خاموش اور سنجیدہ ہوگئی تھی۔ دراصل بیکاری کے دن انسان کو ذہنی طور پر مفلوج سا کر دیتے ہیں۔ پھر اس پر رزلٹ کا خوف اور تنہائی کا عذاب سب نے مل کر اسے ہر چیز سے حد یہ کہ اپنے آپ سے بھی بیزار کر دیا تھا۔ کمرے میں پڑے پڑے سارے دن یا تو کتابیں پڑھتی رہتی یا ماضی میں بھٹکنے کے لیے نکل جاتی۔ بڑا سکون تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا۔ مریم سے چھپ کر بنا سوچے سمجھے خاموشی سے وہ اپنی پرانی حویلی کی طرف نکل جاتی۔ جہاں بچپن کی یادیں تھیں۔ جہاں ابا حضور اور امی احضور کی خوشبو تھی اور جہاں...... حویلی کے چاروں طرف یوں چکر لگاتی جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈ رہی ہو۔ آخر تھک ہار کر کسی پتھر پر ٹک جاتی۔

''آپ کہاں ہیں امی حضور...... میں آپ کو ڈھونڈنے کہاں جاؤں۔'' اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایسی ہوک اٹھتی جو ناقابل برداشت ہوتی لیکن حوصلہ ہارنا تو نادیہ وجاہت علی نے سیکھا ہی نہیں تھا وہ بڑے عزم سے واپس پلٹ آتی۔ ارادے اٹل ہوں، یقین کامل ہو اور حوصلے بلند ہوں تو کامیابی ناگزیر ہے۔

اس درمیان نادیہ کا رزلٹ آ گیا وہ اعلیٰ نمبروں سے فرسٹ کلاس حاصل کر کے کامیاب ہوگئی تھی۔ اسلام پور میں سب نے اس کا نتیجہ دیکھا۔ لہٰذا ناشتہ کے بعد یہ طے ہوا کہ فوراً سب لوگ گلزار نگر کے لیے روانہ ہو جائیں۔ اتنی جلدی...... بالکل غیر متوقع طور پر ان سب کو خاص کر پھوپھی حضور کو اپنے سامنے پا کر وہ خوشی سے پاگل ہوگئی تھی۔ نادیہ، فوزیہ، عابدہ بیگم سب نے اسے ہاروں سے لاد دیا۔ رشید احمد نے اسے بے شمار پیار کر ڈالے پھر بڑے چپکے سے سو سو کے کئی نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر آہستہ سے بولے۔

''چپکے سے رکھ لو...... کوئی دیکھنے نہ پائے۔'' نادیہ ہنس پڑی۔ پھر اتنی ہی آہستگی سے بولی۔

''پھوپھا حضور! یہ اتنے سارے روپوں کا میں کیا کروں گی؟ بس ان میں سے ایک نوٹ رکھ لیتی ہوں ٹھیک ہے نا۔''

''بڑے جب کچھ دیتے ہیں تو واپس نہیں کیا جاتا۔ بدتہذیبی ہوتی ہے۔ بس خاموشی سے رکھ لو۔''

منصور دور کھڑا بڑی خاموشی اور سنجیدگی سے اس سارے ہنگامے کو دیکھ رہا تھا۔ بلکہ مزے لے رہا تھا۔ نادیہ نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور آواز دے کر بولی۔

''ارے منصور بھائی! آپ اتنے رنجیدہ رنجیدہ کیوں نظر آرہے ہیں؟ قریب آجایئے نا۔''

منصور بہت دھیرے سے مسکرایا اور قریب آن کر بولا۔ ''مبارک ہو نادیہ وجاہت صاحب! ویسے اب بورڈ والوں کی کارکردگی کچھ مشکوک ہوگئی ہے۔ لگتا ہے کوئی اسٹینڈرڈ نہیں رہا ان کا۔''

''جی ہاں آپ نے بجا فرمایا۔ آدمی کا ظرف ہونا چاہیے جو دوسروں کی کامیابیوں پر دل سے خوش ہو سکے اور...... میرے خیال میں بس اسی چیز کی کمی ہے۔'' وہ دانت کٹکٹا کر بولی۔

''اجی جاؤ...... میں تو یہ سوچ رہا تھا بلکہ مجھے تو یہ صدمہ کھائے جا رہا تھا کہ اس شہر میں اب ایک اور نااہل ڈاکٹر کا اضافہ ہو جائے گا۔''

''ہاں جس طرح اس شہر میں ایک اور ناقابل بیرسٹر کا اضافہ ہوا ہے۔''

''ارے منصور! بری بات ہے، اس خوشی کے موقع پر بھی تم دونوں لڑنے لگے ہو۔'' دور کھڑی عابدہ بیگم نے ان کی گفتگو سن کر آواز دی۔

''لڑائی تھوڑی ہو رہی ہے پھوپھی حضور! یہ آپ کے اکلوتے بیٹے ایک بار اور مٹھائی کا ڈبہ مانگ رہے ہیں۔ میں نے کہا ایک کیا آپ سب ہی لے جائیں میں کیا کروں گی۔ کسی کلائنٹ کو دے دیجیے گا، جھوٹا مقدمہ جیتنے پر وہ پھولوں سے لاد دے گا۔''

رشید احمد قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ''بہت خوب منصور میاں! نادیہ نے بڑی زبردست چوٹ کی ہے۔''

منصور مسکرا دیا۔ ''ابا حضور دشمن کمزور ہو تو ایسی ہی چوٹیں کرتا ہے۔ اچھا چلو اب اتار دو ان ہاروں کو...... بالکل قوال لگ رہی ہو۔''

''کیوں اتار دے۔ پہنے رہو بیٹی! اتنی پیاری لگ رہی ہے اللہ نظر بد سے بچائے۔'' عابدہ بیگم کی ممتا پھڑک اٹھی۔ منصور برا سا منہ بنا کر دوسری طرف مڑ گیا۔

ایک گھنٹہ بعد ہی وہ سب واپس اسلام پور آ گئے۔ اور نادیہ کالج کے ہنگاموں میں گم ہو کر رہ گئی۔ دوسرے روز شام چار بجے جب وہ مریم کے ساتھ اپنی دوست کے یہاں چائے کی دعوت پر جا رہی تھی کہ میٹرن نے آن کر بتایا۔

''آپ کا فون ہے۔''

''اچھا...... مریم میں ابھی آئی۔'' اور بھاگتی ہوئی ملاقاتی کمرے میں پہنچی۔ عامر بول رہا تھا۔

''کامیابی مبارک ہو مس نادیہ صاحب!''

''اوہ آپ ہیں...... شکریہ ڈاکٹر صاحب لیکن ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے یہ فون کی مبارکباد سمجھ میں نہیں آئی۔''

''اوہ......'' وہ رکا۔ ''معاف کیجیے گا۔ دراصل میں نے سوچا ان دنوں آپ اس قدر مصروف ہوں گی کہ مشکل ہی سے ملاقات ہو سکے گی۔ اب دیکھئے نا۔ فون پر بھی کئی بار کوشش کی تب کہیں جا کر آپ تک رسائی ہوئی ہے۔''

وہ ہنس پڑی۔

''بہت افسوس ہوا آپ کو زحمت ہوئی۔ ویسے آپ آجاتے تو مٹھائی بھی کھانے کو مل جاتی۔ منوں جمع ہو گئی ہے۔''

''اوہ بہت اچھے...... کہیں دکان نہ کھول لیجیے گا۔ ویسے مٹھائی کھانے تو ضرور آؤں گا، آپ پر قرض رہے گی۔''

''ضرور، ضرور ویسے اسی کو سکھا کر کیوں نہ رکھ لوں۔''

عامر زور سے ہنسا۔ ''چلیے وہ بھی کھا لوں گا کچھ تو ملے نا۔''

''اتنے مایوس نہ ہوں، تازہ مٹھائی کھلاؤں گی...... ہاں تو ڈاکٹر صاحب یہ تو بتایئے فارم داخل کروانے کب آؤں؟''

''کل پرسوں کسی دن بھی۔''

''اور مارک شیٹ کی بھی ضرورت ہوگی۔''

"ابھی نہیں...... وہ بعد میں جب ملے گی دے دیجیے گا۔"

"ویسے ڈاکٹر عامر اب تو میڈیکل میں میرا داخلہ یقینی ہے نا؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ارے محترمہ! اب تو سو فیصد یقینی ہے۔ شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ بے فکر رہیں۔"

"انشاء اللہ۔"

"انشاء اللہ ضرور ضرور۔"

"اچھا اللہ حافظ ڈاکٹر صاحب! دراصل میں اپنی دوست کے ہمراہ کہیں چائے کی دعوت پر جا رہی تھی۔ وہ میری دوست تو انتظار کرتے کرتے سوکھ گئی ہوگی۔ پھر تشریف ضرور لائیے گا میں انتظار کروں گی۔" نادیہ نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔ مڑی تو مریم سر پر سوار تھی۔

"خدا کی پناہ، اتنی سی مبارکباد 25 منٹ میں ختم ہوئی ہے۔" نادیہ ہنس پڑی۔

"ارے لڑکی داخلہ بھی تو وہی دلا رہے ہیں نا...... مسکہ لگانے میں اتنی دیر تو لگنا ہی تھی۔"

"ہاں بی بی...... ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے۔" مریم نے ستایا۔ "ایک سے بڑھ کر ایک خدمت گزار، فرمانبردار، تابعدار۔"

"اچھا بک بک بند...... بس چلو کافی دیر بھی ہو گئی ہے۔" وہ اسے پکڑ کر کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔

کہتے ہیں قسمتوں کے فیصلے عالم بالا پر ہوتے ہیں اور جوڑے آسمان پر سے اترتے ہیں لیکن اس کے باوجود دنیا والے رشتوں کے جوڑنے اور جوڑے بنانے میں اپنی تمام تر توانائی صرف کر دیتے ہیں کبھی تو تکا لگ جاتا ہے اور بظاہر دو زندگیاں خوش و خرم زندگی گزارتی نظر آنے لگتی ہیں لیکن عالم بالا پر کیا فیصلہ ہوا ہے، قسمت میں کیا لکھا جا چکا ہے۔ جو انمٹ ہے۔ یہ تو بہت بعد میں معلوم پڑتا ہے۔ اس وقت جب گاڑی پٹڑی سے اتر چکی ہوتی ہے۔ ہار جیت کے اس کھیل میں جیت کس کی ہوتی ہے یہ تو وہی بتا سکتے ہیں جنہوں نے آنکھیں بند کر کے دلدل میں چھلانگ لگائی اور ہاتھ پیر مارنے کے باوجود باہر نہ آ سکے۔ سو یہی وہ فیصلہ تھا جو عالم بالا پر ہوا تھا۔

عابدہ بیگم اور رشید احمد کتنے ہی روز سے کسی اہم فیصلے کو نمٹانے کی کوشش میں مصروف تھے لیکن کسی بھی نتیجہ پر پہنچنا ناممکن سا نظر آ رہا تھا۔ آخر ایک دن نہایت سنجیدگی سے رشید احمد

نے بار بار کیے گئے سوال کو ایک بار پھر دہرایا۔

"عابدہ بیگم! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا، میں کتنی بار آپ سے پوچھ چکا ہوں، یہ اتنا گمبھیر مسئلہ بھی نہیں ہے کہ آپ کو سوچنے کے لیے مہینے درکار ہوں۔"

عابدہ بیگم نے جو وقت گزارنے کے لیے ناپسندیدہ قسم کا ناول پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھیں گردن اٹھا کر ان کو دیکھا۔ کتاب ایک طرف رکھی۔ نہایت دھیمے پن سے بولیں۔

"میری بھی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ خان بہادر صاحب کو اتنی جلدی کیا ہے۔ مجھے ہر روز ہی ان کا قاصد دروازے پر نظر آ جاتا ہے۔ انہیں یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ نازلی اور منصور کے علاوہ اب نادیہ اور فوزیہ بھی میری ذمہ داری ہیں۔"

"اس حقیقت سے تو کوئی بھی منکر نہیں ہو سکتا عابدہ بیگم لیکن کچھ وقت کے بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ نادیہ کے لیے تو ابھی ہمیں چار سال انتظار کرنا ہے۔ اس درمیان اگر نازلی کے لیے کوئی مناسب رشتہ آ جاتا ہے تو اسے بلاوجہ چھوڑ دینا تو نادانی ہوگی۔" رشید احمد وقت کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتے تھے۔

"میں نے تو یہ کبھی نہیں کہا آپ انکار کر دیں لیکن یہ ضرور چاہتی ہوں کہ نازلی کی شادی سے پہلے نادیہ کے مستقبل کا بھی فیصلہ ہو جائے تاکہ اس نسبت کا باقاعدہ طور پر اعلان کیا جا سکے۔"

"تو...... آپ نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے، کیا فیصلہ کیا ہے؟" انہوں نے آہستگی سے پوچھا۔

"آپ کو یاد ہوگا نادیہ کی پہلی سالگرہ پر میں نے وجاہت سے کیا وعدہ لیا تھا اور اس نے اسی لمحہ کتنی گرمجوشی اور مسرت سے اس بات کا باقاعدہ اعلان کر دیا تھا۔"

"مجھے بالکل یاد ہے۔ وہ ساری گفتگو بھی یاد ہے جو بھائی بہن کے درمیان ہوئی تھی...... لیکن......" وہ رکے، کچھ دیر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد دھیرے سے بولے۔ "بیگم! اکثر بچپن کی مانگیں اور بزرگوں کے جذباتی فیصلے ناکام بھی ثابت ہوتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں لڑکے اور لڑکیاں اپنے مستقبل کے فیصلے خود کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کی بلکہ ماں باپ تک کی پسند بھی اگر ان کے معیار کے مطابق نہ ہو تو ناقابل قبول ہوتی ہے۔ اس میں کسی بھی جھجک، شرم اور بے ادبی کا دخل نہیں ہوتا۔ اسی لیے کہ بقول ان

کے، زندگی ہمیں گزارنی ہے ہمارے بزرگوں یا ماں باپ کو نہیں۔ اس لیے میری آپ سے گزارش ہے کہ کسی بھی قطعی فیصلہ تک پہنچنے سے پہلے منصور اور نادیہ کی مرضی معلوم کیجیے...... پھر اگلا قدم اٹھایئے گا۔"

"مجھے بھی اس کا احساس ہے لیکن سوچتی ہوں یہ بات قبل از وقت ہو گی۔"

ان کے چہرے سے بھی کسی گہری فکر کے آثار نمایاں تھے۔

"منصور کی طرف سے تو مجھے فکر نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے اس کی پریکٹس بھی اچھی چل رہی ہے۔ نادیہ کو وہ کسی حد تک میرے خیال میں پسند بھی کرتا ہے۔ اگر اس کے سامنے یہ رشتہ پیش کیا گیا تو انکار نہیں کرے گا۔ لیکن نادیہ کے بارے میں کوئی بات بھی قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ ماں باپ کے بعد سے اور جن حالات میں وہ اتنے برسوں رہی ہے ان سب نے اس کو رشتہ داروں سے بڑی حد تک بیزار کر دیا ہے۔ پھر میڈیکل کی پڑھائی کے درمیان تو ایسی کوئی بات سننا بھی پسند نہ کرے۔"

"پھر...... اس تمام جھگڑے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" رشید احمد نے بیوی کو سمجھانا چاہا۔

"صرف اس وجہ سے کہ نازلی کا رشتہ ہم لوگ طے کر رہے ہیں۔ فاروق ہر لحاظ سے بہترین لڑکا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی سے پہلے میں نادیہ کا رشتہ بھی طے کر دینا چاہتی ہوں کیونکہ یہ میری بہت بڑی ذمہ داری ہے۔" کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہوئیں۔ پھر جیسے کسی نتیجہ پر پہنچ کر بولیں۔

"کیا...... ایسا نہیں ہو سکتا کہ نازلی کی شادی سے پہلے نادیہ اور منصور کی مرضی معلوم کر کے کم از کم ان کی منگنی کا اعلان کر دیا جائے۔ بلا سے شادی تین چار سال بعد ہو۔"

رشید احمد مسکرا دیئے۔ "بڑی دیر بعد...... اور بڑی مشکل سے آپ صحیح راستہ پر آئی ہیں۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ آپ نادیہ اور منصور کی مرضی معلوم کر لیں۔ لیکن...... کیا نادیہ مان جائے گی؟"

"ہاں...... مجھے پورا پورا یقین ہے۔" عابدہ بیگم جلال سے بولیں۔ "اس لیے کہ جب اسے معلوم ہو گا کہ یہی وجاہت کی مرضی تھی تو قطعی انکار نہیں کرے گی۔ آپ تو جانتے ہیں اس کی پیدائش پر اماں حضور کے انتقال کی وجہ سے وجاہت نے اس بچی سے کتنی نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا تھا لیکن بعد میں...... یہی بیٹی ان کی کتنی چہیتی اور پیاری بیٹی ہو گئی تھی۔"

"میں ان لمحات کو بالکل نہیں بھولا ہوں عابدہ بیگم! مجھے سب یاد ہے۔" وہ چپ ہو گئے۔

عابدہ بیگم بھی خاموش تھیں۔ غالباً دونوں ہی حال سے گزر کر ماضی کی کرب انگیز و ناخوشگوار یادوں میں کھو گئے تھے۔ بڑی بہن ہونے کے ناطے عابدہ بیگم کو چھوٹے بھائی سے کتنی انمٹ اور شدید محبت تھی کہ اس کا اندازہ لگانے کے لیے بھی کسی ایسے دل کی ضرورت ہوتی ہے جس میں واقعی پیار کا اتنا انمول خزانہ موجود ہو۔ اماں حضور کے بعد سے تو چھوٹے بھائی کے لیے بڑی بہن، ماں کی جگہ تھیں۔ جو سکون و آرام انہیں اماں حضور کے قریب لیٹ کر ملتا تھا اب...... اس سکون کی خاطر وہ جہاں کہیں بھی ہوتے کسی الجھن و پریشانی میں مبتلا ہوتے سیدھے عابدہ بیگم کے پاس پہنچ جاتے۔ ایک روز بھی ملاقات نہ ہوتی تو بے چین ہو جاتے۔ وہ اکثر کہا کرتے۔ "آپا بیگم! خون کے یہ رشتے بڑے ظالم ہوتے ہیں چین سے جینے بھی نہیں دیتے۔" پر اب تو ایسے دل ارزاں ہو گئے ہیں اور جذبے ناپید۔ اس مشینی دور میں سچی محبت کی جگہ ظاہرداری اور بناوٹ نے لے لی تھی اور خلوص...... دولت کے ترازو میں تلنے لگا ہے۔ پھر بھلا...... کون کس سے...... کیا امید رکھے۔

رشید احمد کافی دیر سے بڑے غور سے اپنی بیگم کے چہرے کا مطالعہ کر رہے تھے۔ آخر نہ رہا گیا تو پوچھ ہی بیٹھے۔

"چہرے کا یہ زیر و بم بتا رہا ہے کہ خیالوں میں کھو کر آپ بہت دور نکل گئی ہیں۔"

"میں...... نہیں تو......" وہ مسکرا دیں اور سالوں کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے کر کے پھر حال میں آن موجود ہوئیں۔ "آپ ایسا کریں۔ خان بہادر صاحب کو اپنی رضامندی کا خط لکھ کر کل ہی بھجوا دیں ویسے میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ منصور کے لیے نادیہ کے رشتہ کے اعلان سے نجمہ بی کو ہم سے بڑی شکایت ہو جائے گی۔ وہ برا مان جائیں گی۔"

"مگر...... کیوں؟" رشید نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ انہوں نے اپنے ریاض کے لیے نادیہ کا رشتہ مانگا تھا۔ حالانکہ اس وقت میری اور وجاہت کی بات ہو چکی تھی پھر بھی اس وقت نامعلوم کیوں کس مصلحت کی بنا پر وجاہت نے انکار نہیں کیا تھا خاموش ہو گئے تھے۔ اب انہیں معلوم ہو گا تو...... یقیناً ناراض ہوں گی۔"

''باقاعدگی سے کوئی بات طے تو نہیں ہوئی تھی نا...... ہاں اگر اس وقت وجاہت، منصور کے لیے بتا دیتے تو بہتر تھا...... بہر حال...... جو ہو گا دیکھا جائے گا...... اگر وہ شکایت کریں تو میرا نام لے دینا میں سب ٹھیک کر لوں گا۔'' وہ ذرا رک کے پھر عابدہ بیگم کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''تعجب ہے وجاہت نے نجمہ بی کے لڑکے کے لیے کیوں خاموشی اختیار کر لی تھی؟ انہیں تو فوراً نارضامندی کا اظہار کر دینا چاہیے تھا۔ جس لڑکے کے باپ نے ہمیشہ ان کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کی۔ کبھی بھی رشتہ داری اور دوستی کا پاس نہ کیا۔ اس باپ کی اولاد کیا ان کی لاڈلی بیٹی کو خوش رکھ سکے گی۔ وجاہت میں بس یہی کمزوری تھی۔ کوئی سوال اس کے سامنے آئے کسی بھی نوعیت کا ہو...... اسے پسند ہو یا نہ پسند ہو...... صاف انکار نہیں کر سکتا تھا۔'' عابدہ بیگم نے بڑے دکھ سے جواب دیا۔ رشید احمد بڑے معنی خیز انداز میں ہنسے پھر ان کی طرف جھک کر دھیرے سے بولے۔

''بے جا مروت اور کسی کا دل نہ دکھانا۔ اچھی عادت ہے لیکن یاد رکھیے بیگم صاحبہ بیٹے اور بیٹی کا رشتہ طے کرتے وقت ان دونوں چیزوں کو اٹھا کر کونے میں رکھ دینا پڑتا ہے۔ اس وقت صرف نیک نیتی اور صفائی قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی لڑکی کو بیاہ کر گھر لے آنا بڑا آسان ہے لیکن گھر لا کر اسے اس کے اپنے گھر کا سا پیار، محبت اور اپنائیت دینا بڑا مشکل ہے۔ کیا نجمہ بی نادیہ کو یہ سب دے سکیں گی۔ ان کے نزدیک وہ بڑی منحوس تھی۔ پھر ان کے بیٹے کے لیے کیسے مبارک ہو جائے گی۔ آپ بھول گئیں وہ دن جب فوزیہ کی پیدائش پر وہ ثریا بہن کے پاس آن کر رہ رہی تھیں۔ کہنے کو تو وہ بھاوج کی خدمت کے لیے آئی تھیں لیکن سارا سارا دن گزر جاتا اور وہ بھولے سے بھی بھاوج کے کمرے میں آ کر اسے پوچھتی تک نہیں تھیں۔ وجاہت نے ان کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ بھائی کی محبت اور اس کی خدمات کے جواب میں بھاوج کو تھوڑا سا اپنا پن بھی نہ دے سکیں۔ ایسی عورت سے کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بھتیجی کو بہو بنا کر سینے سے لگا لیں گی؟ مجھے تو تعجب ہے اور افسوس بھی کہ وجاہت نے سب جانتے ہوئے بھی ان کو اس لحہ صاف جواب کیوں نہیں دے دیا۔ یہ رشتے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ آئینہ میں ایک بار بال پڑ جائے تو سدا کے لیے داغدار ہو جاتا ہے۔'' رشید احمد کو جوش آ گیا تھا۔ ان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا اس وقت ماضی کی

تلخ یادوں نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس پر وجاہت علی کی اس کمزوری پر بھی غصہ تھا جو انہوں نے جانتے بوجھتے بھی بہن کی خوشی کی خاطر فیصلہ کن بات نہیں کی تھی۔

''میری اس تلخ کلامی کو معاف کیجیے گا بیگم صاحبہ!'' وہ آرام دہ کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''یہ جانتا ہوں سب سے چھوٹی بہن ہونے کی وجہ سے آپ کو وہ بہت عزیز ہیں۔ وجاہت علی ان کا بہت خیال رکھتے تھے ان کی کسی بھی بات کو رد کرنا تو گویا ان کے نزدیک کفر کے مترادف تھا۔ لیکن نادیہ کے معاملہ میں انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ اس بہن کی بات کا مان رکھ رہے ہیں جس نے نادیہ کی پیدائش پر اماں حضور کی موت...... پھر وجاہت کا خیال اور اس کی شہادت ان سب کو انہوں نے، معاف کیجیے گا اپنی جہالت کی وجہ سے اس بچی کی ذات کی نحوست سے منسوب کر دیا تھا۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے، سمجھدار اور اتنے قریبی رشتہ دار بھی جب اس قسم کی لغو توہمات میں مبتلا ہو جائیں تو...... سوائے افسوس کرنے اور شرمسار ہونے کے کچھ نہیں کیا جا سکتا پھر اب......''

''مجھے آپ سے زیادہ ان حالات اور ان باتوں کا علم ہے جو اس زمانے میں کی جاتی رہی ہیں۔'' عابدہ بیگم نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''لیکن...... ہم ہر کسی کی زبان تو نہیں روک سکتے۔ کسی کی سوچوں کو تو نہیں بدل سکتے۔ ہر فرد کی اپنی ایک ذہنیت ہوتی ہے۔ اپنا مزاج ہوتا ہے، اپنے اظہار رائے کے لیے ہر شخص خود مختار ہے۔ ہم دونوں بہنوں میں ایک ہی ماں کی اولاد ہونے کے باوجود زمین آسمان کا فرق ہے۔ انسانی فطرت اللہ کی عطا کردہ ہوتی ہے بعض لوگ حالات کے تحت اپنی فطرت بدل بھی لیتے ہیں لیکن اگر کوئی نہ بدل سکے تو...... خون کا یہ اٹوٹ رشتہ توڑا تو نہیں جا سکتا۔'' ان کے لہجہ میں بڑی شکستگی تھی۔

''درخت کی خوبصورتی اور اس کی اہمیت اس کی شاخوں اور پتوں کی مرہون منت ہوتی ہے پتے توڑ لیے جائیں۔ شاخیں الگ کر دی جائیں تو اکیلا تنہا درخت کوئی وقعت نہیں رکھتا۔'' وہ ذرا کی ذرا رکیں۔ ''مجھے نادیہ اور فوزیہ...... منصور اور نازلی سے زیادہ عزیز ہیں اس کے ساتھ ساتھ نجمہ بھی اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ مجھے بہت عزیز ہے۔ وجاہت نے خود تو بہن کی بات کا مان رکھنے کے لیے انکار نہیں کیا۔ اب مجھے اتنے کٹھن امتحان میں ڈال دیا ہے ویسے مجھے یقین ہے اگر زندگی اس کا ساتھ دیتی تو کسی مناسب وقت پر اور صحیح طریقے سے وہ انکار بھی کر دیتا۔ نادیہ تو اس کی جان تھی۔'' عابدہ بیگم کا چہرہ ضبط دکھ میں سرخ ہو گیا تھا۔

''چلیں چھوڑیں یہ آپ بھائی بہنوں کا معاملہ ہے۔ میں اگر مداخلت کروں گا تو ممکن ہے آپ لوگوں کو ناگوار گزرے۔'' وہ کھڑے ہو گئے۔

''پھر...... کیا خیال ہے۔ خان بہادر صاحب اور بی بی آپا کو منظوری کا جواب لکھ دیا جائے؟ اس عرصہ میں آپ ریاض میاں اور منصور کے بارے میں نادیہ کی مرضی معلوم کر لیجیے گا۔ وہ جس کے حق میں بھی فیصلہ دے گی ہمیں منظور کرنا پڑے گا۔''

''میں جانتی ہوں۔'' ان کی آواز میں بلا کی تھکاوٹ تھی۔ وہ بے حد پریشان اور فکرمند نظر آ رہی تھیں۔ حالات نے انہیں ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جس کے ایک طرف ان کا بیٹا اور اس کی پسند تھی تو دوسری طرف چھوٹی بہن کی خواہش۔ اولاد کے دل کا حال ماں سے زیادہ کون جا سکتا ہے انہیں معلوم تھا منصور کو نادیہ بے حد پسند ہے۔ لیکن نادیہ کے بارے میں وثوق سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ منصور کے حق میں فیصلہ ہونے کی صورت میں بہن کے رشتے کی یہ دیوار بڑی آسانی سے ڈھے جائے گی لیکن اگر دوسری صورت ہوئی تو...... تو میرے منصور کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

رشید احمد کھڑے بڑے غور سے ان کے چہرے کا مطالعہ کر رہے تھے۔ چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیات سے انہوں نے بہت کچھ جان لیا تھا۔ ان کے قریب آن کر جھکے اور آہستہ سے بولے۔

''بیگم صاحبہ! یہ اتنا بڑا مسئلہ بھی نہیں ہے کہ آپ اتنی زیادہ فکرمند ہو جائیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ یہ قسمت کا کھیل ہے۔ جوڑے آسمانوں پر بن جاتے ہیں۔ ہمارے لیے کیا اچھا ہے کیا برا ہے ہمارے ذہن اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ نادیہ اور منصور کی قسمت میں اوپر والے نے جو اپنی ام الکتاب میں لکھ دیا ہے اسے ہمیں بخوشی قبول کرنا ہوگا۔''

''ہاں...... آپ ٹھیک کہتے......''

''آپ نے دیکھا...... رات کے دو بج چکے ہیں۔ شب بخیر۔'' گھڑی پر نظر پڑتے ہی عابدہ بیگم حیران رہ گئیں۔

''غضب خدا کا اتنی دیر ہو گئی شب بخیر۔'' لیکن رشید احمد اس سے پہلے ہی اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

☆

پہاڑوں میں گھرے ہوئے اس چھوٹے سے گاؤں میں زمیندار برکت علی کی اپنی بادشاہت تھی وہ اس علاقہ کا حاکم تھا۔ حاکم وقت کے آگے سرنگوں ہونا اس کے ہر حکم کو جی جان سے ماننا رعایا کا فرض ہوتا ہے۔

''سرکار آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا؟'' آنے والے نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ استفسار کیا۔

زمیندار برکت علی کا یہ معمول تھا کہ ہر شام حویلی کے باہر لان میں چائے پیتے، ایسے میں گاؤں کے بے شمار لوگوں کے مسائل حل کیے جاتے۔ شکایتیں سن کر ان کا تدارک کیا جاتا اور دن بھر ہونے والے اہم واقعات ان کے گوش گزار کیے جاتے۔

زمیندار برکت علی بڑے نیک دل اور صاحب اصول انسان تھے۔ سفارش انہیں ناپسند تھی۔ خوشامد ان کے مزاج کو برہم کر دیتی تھی تو ناجائز سختی اور رتبہ کا غلط استعمال ان کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا۔ حکمران تو رعایا کا خادم ہوتا ہے۔ اور خادم بڑے بڑے محلوں میں نہیں رہتے۔ ان کے دسترخوان پر انواع اقسام کے کھانے نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کی آمدورفت کے لیے قیمتی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ پڑوسیوں کا ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہونا ہمارے دین کا جزو ہے۔ بادشاہ کا رعایا کے حالات سے بے خبر ہونا کتنا بڑا گناہ ہوگا۔

''ہاں رحیم خان میں نے ہی تمہیں بلوایا تھا۔ سنا ہے کہ تمہارے باپ کی طبیعت بہت خراب ہے۔'' کسی بڑے گناہ کا بوجھ وہ اپنے کندھوں پر نہیں لاد سکتے تھے۔

''جی سرکار...... بہت بیمار ہے اب تو چلنے پھرنے کے بھی قابل نہیں رہا ہے۔ اللہ جانے کیا ہو گیا ہے۔'' رحیم خان ان کے نزدیک ہی فرش پر بیٹھ گیا۔

''علاج کس کا ہے؟'' برکت علی نے پوچھا۔

''وہی سرکار اپنے حکیم صاحب کا پر اس بار اللہ جانے کیوں فائدہ ہی نہیں ہو رہا ہے۔ ابا بہت زیادہ کمزور ہو گیا ہے زمیندار جی!'' رحیم خان کی آواز میں لرزش تھی۔

''مایوس نہیں ہوتے بیٹا...... اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس نے ہر چیز ہر کام کا ایک وقت مقرر کیا ہے۔''

''لیکن...... زمیندار جی...... حکیم صاحب تو کہتے ہیں...... تیرے باپ کی کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔ تو پھر یہ سب کیا ہے؟'' اس کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا۔ فکر تھی۔

"کوئی بیماری نہیں ہے تو، تو پھر وہ علاج کس چیز کا کر رہے ہیں؟" برکت علی کو بڑا تعجب ہوا۔

"بس وہ تو یہ کہتے ہیں کہ تیرے باپ کے ذہن پر کوئی بہت بڑا بوجھ ہے۔ کسی شدید صدمہ کا اثر ہے۔ جس نے اس کی یہ حالت بنا دی۔"

"اچھا......" برکت علی کو تعجب ہوا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ "فکر نہ کر۔ میں خود کسی روز آن کر کریم داد سے بات کروں گا بوجھ وجھ کچھ نہیں ہے۔ اصل میں تمہاری ماں کی اچانک موت اور اس کے بعد تمہارے بڑے بھائی کی گمشدگی ان دو بڑے حادثات نے اس کی کمر توڑ دی ہے۔ مرد بچہ ہو کر ہمت ہار بیٹھا ہے۔ میری ایک بات یاد رکھنا۔ ہماری زندگی میں آنے والے دکھ اور خوشیاں یہ سب ہمارے اپنے اعمال کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

"لیکن زمیندار جی!" نزدیک بیٹھے لوگوں میں سے ایک نے لقمہ دیا۔ "اپنا کریم داد تو بڑا ہی نیک انسان رہا ہے۔ میں تو اسے زمانے سے جانتا ہوں جب وہ گلزار نگر میں نواب وجاہت علی کی حویلی میں ملازمت کرتا تھا۔"

"اچھا......نواب وجاہت کی حویلی میں ملازم تھا۔" زمیندار برکت علی نے بڑی حیرانی سے اس کارندے کی طرف دیکھا۔ "تمہیں......یقین ہے......کہ...... یہ وہی کریم داد ہے جو ان کا اردلی ہوا کرتا تھا۔"

"جی ہاں سرکار۔" اس نے بڑے یقین سے جواب دیا۔ زمیندار برکت علی بڑی دیر تک سر جھکائے اس دور کے حالات کو اپنے ذہن میں مجتمع کرتے رہے جب وجاہت علی گلزار نگر کے نواب تھے۔ ان کے اپنے والد ان کے بڑے اچھے دوست تھے۔

"اچھا......ٹھیک ہے۔" چند سیکنڈ بعد انہوں نے سر اٹھا کر رحیم خان کی طرف دیکھا۔ کچھ سوچتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔ "فکر کرنے کی ضرورت نہیں رحیم خان میں کل کسی وقت کریم داد کو دیکھنے ضرور آؤں گا۔ حکیم صاحب سے بھی اس بارے میں بات کروں گا۔ اللہ اپنا فضل کرے گا۔"

"اللہ آپ کو خوش رکھے زمیندار جی!" رحیم خان نے جھک کر ان کے پاؤں چھو لیے

برکت علی نے جلدی سے اپنے پاؤں ہٹا لیے۔

"نہیں رحیم خان ایسا کبھی نہ کرنا۔ انسان انسان کے پاؤں چھوئے یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

"لیکن زمیندار جی! یہ تو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔" رحیم خان سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"کوئی بات نہیں، اپنے بڑوں کی غلطیوں کو دہرانے کے بجائے چھوڑ دینا چاہیے اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔"

"بہتر جی......" رحیم خان سلام کر کے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی زمیندار برکت علی بھی کھڑے ہو گئے۔ ان کے اٹھتے ہی تمام کارندے بھی ادب سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے برکت علی نے آگے بڑھ کر ایک کارندے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔

"دیکھو بھائی اس دنیا میں تمام انسان برابر ہیں بڑا اور لائق تعظیم تو وہ ہے جو علم میں ہم سے برتر ہے۔ یہ ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا۔ جھک کر پاؤں چھونا۔ مسلمان کا شیوہ نہیں ہے، جب تم سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو تو ہندوانہ رسمیں اپنا کر کیوں گناہ مول لیتے ہو۔ اچھا بھائیو! اللہ نگہبان۔" وہ اندر چلے گئے۔

☆

اپنے سامنے زمیندار برکت علی کو دیکھ کر کریم داد ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج تک تو اس گاؤں میں ایسا کچھ تو نہیں ہوا تھا۔

"آپ...... مائی باپ......آپ اور...... یہاں......" زمیندار برکت علی مسکرا دیئے اسے آہستہ سے سہارا دے کر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔

"تم...... کھڑے کیوں ہو گئے؟ آرام سے بیٹھو۔ رحیم خان نے تمہاری بیماری کے بارے میں بتایا تھا سو پوچھنے چلا آیا، اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟"

"ہے تو سہی سرکار! اسی لیے کہ یہ ہمارے گاؤں کی ریت رسم نہیں ہے۔"

"میں ان فضولیات کا قائل نہیں ہوں کریم داد ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ اب طبیعت کیسی ہے۔ حکیم صاحب کی دوا سے کچھ فائدہ ہوا؟"

کرم داد تو جواب دینے کے بجائے بس حیرانی و پریشانی سے انہیں تکے جا رہا تھا۔

اسے اپنی آنکھوں پر ابھی تک اعتبار نہیں آیا تھا۔ بھلا کہیں کبھی بھی کسی اتنے بڑے زمیندار نے گاؤں کے معمولی کارندے کے گھر آ کر اس کی عیادت کی ہے۔

''بابا.....'' رحیم خان نے اسے جھنجوڑا۔ ''ہوش کرو..... اپنے زمیندار صاحب تمہاری طبیعت پوچھنے آئے ہیں۔ اللہ نے ان کو فرشتوں جیسا نیک بنایا ہے۔'' زمیندار برکت علی پلنگ کے نزدیک پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''ہاں اب بتاؤ..... تمہیں کیا تکلیف ہے۔ کیا بیماری ہے میں نے حکیم صاحب سے بات کی تھی۔ وہ تو کہتے ہیں تم کو کوئی بھی بیماری نہیں ہے بس وہم ہے۔ ڈر ہے۔ کوئی انجانا خوف ہے۔ آخر یہ سب کس وجہ سے ہے؟''

''وہ تو میں خود بھی نہیں جانتا زمیندار جی کہ مجھے کاہے کا ڈر ہے۔ کس چیز کا خوف ہے لیکن..... اندر کچھ ہے جو مجھے پریشان کیے ہوئے ہے۔'' کریم داد نے دھیرے دھیرے بول کر اپنی بات واضح کرنی چاہی لیکن شاید وہ اس میں ناکام رہا۔ زمیندار برکت علی بڑے غور وخوض سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس کے چہرے پر پژمردگی تھی۔ وحشت اور ندامت تھی۔

''کریم داد۔'' انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ''اتنے مایوس اور فکرمند کیوں ہوتے ہو اللہ صحت دے گا۔ بیماری دکھ سے تو بھاگ کر نہیں جا سکتے۔''

کرم داد سر جھکائے خاموشی سے سنتا رہا۔

''بندے کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔''

کریم داد نے سر اٹھا کر زمیندار کی طرف دیکھا پھر ٹوٹی آواز میں بولا۔ ''زمیندار جی! میں حوصلہ ہار چکا ہوں۔ میں..... میں کیا کہوں آپ سے..... میں بہت برا انسان ہوں آپ! میرے لیے پریشان نہ ہوں، بس دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے۔''

زمیندار برکت علی تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے پھر ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولے۔

''زندگی میں ہر انسان سے اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ بندہ بشر ہے۔ غلطی بھی کر سکتا ہے۔ اگر.....تم سے بھی انجانے میں کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے جس نے تمہیں اتنا بے چین کر رکھا ہے تو..... اگل دو..... کسی کو اپنا جان کر بتا دو..... بوجھ ہلکا ہو جائے گا اللہ سے تو کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے پھر بندوں سے چھپا کر اپنے آپ کو کیوں زندہ درگور کر رہے ہو۔''

''مالک!'' کریم داد نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا..... کچھ بھی نہیں..... پھر..... کیا بتاؤں؟''

''چلو جانے دو..... تمہاری مرضی۔'' زمیندار برکت علی نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر تسلی دی۔ ''میں تم سے تمہارے خوف کی وجہ پوچھنے نہیں آیا۔ تمہاری طبیعت پوچھنے چلا آیا تھا..... ممکن ہے حکیم صاحب کا خیال ہی غلط ہو۔''

''نہیں زمیندار جی!'' بڑی دیر بعد رحیم خان نے مداخلت کی۔ ''ابا تو سوتا ہی نہیں۔ دن بھر، رات بھر جاگتا رہتا ہے اگر کبھی آنکھ لگ بھی جائے تو پاگلوں کی طرح چیختا ہوا اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ہمیشہ ایک ہی جملہ کہتا ہے۔ ''مجھے چھوڑ دو..... مجھے جانے دو..... میں بے قصور ہوں۔'' کریم داد نے ملتجیانہ نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ زمیندار برکت علی سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے چند منٹ بعد تحکمانہ لہجہ میں گویا ہوئے۔

''کریم داد! تمہیں بتانا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے، آیا تم بے قصور ہو یا قصوروار اور اگر قصوروار ہو تو ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا ہے تم سے جس نے تمہاری زندگی اجیرن کر دی ہے۔''

کریم داد نے نظریں اٹھا کر بڑی بے چارگی سے زمیندار صاحب کی طرف دیکھا، دیکھتا رہا۔ پھر اچانک پلنگ سے نیچے اتر کر ان کے دونوں پاؤں پکڑ لیے۔

''میں بہت گناہ گار ہوں زمیندار جی..... نمک حرام ہوں۔ احسان فراموش ہوں۔ میں نے تو اتنا بڑا گناہ کیا ہے، جس کی کوئی معافی نہ ہے نہ ہو سکتی ہے؟''

''اللہ اپنا رحم کرے..... اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔'' انہوں نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اعتراف گناہ سے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ضرور ہوتا ہے۔ پھر تم تو بڑے نیک بندے ہو میں نہیں سمجھتا کہ جس غلطی کو تم گناہ سمجھ رہے ہو وہ واقعی اتنا بڑا گناہ ہوگا۔ اس لیے کہ کرم داد میں کسی صورت یہ یقین نہیں کر سکتا کہ تم جیسا اچھا انسان کسی ناقابل یقین گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ یہ سب تمہارا وہم ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ مجھے اپنے دل کا حال بتا دو، میں تو تمہیں خوش اور صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں، اس لیے بھی کہ تم میرے باپ کے خاص ملازم تھے اور وہ مرتے دم تک تمہاری بے حد عزت کرتے تھے۔''

''زمیندار...... جی!'' کریم داد بڑے سکون سے آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گیا۔ ''میں بڑا بدنصیب انسان ہوں اور...... اتنا ہی ذلیل بھی کہ میں نے اپنے اس مالک کے ساتھ دھوکہ کیا ہے، جس نے کبھی بھی مجھے کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ میری ایک ایک ضرورت پوری کی تھی۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح جانا اور...... اسی شخص کے ساتھ میں نے دھوکہ کیا...... میں......'' اس کا سارا تن کپکپا رہا تھا۔ ''میں ایسا کبھی نہ کرتا۔ کبھی بھی نہیں...... لیکن رمضان خان نے مجھے بہکا دیا تھا۔ روپے میں بڑی طاقت ہے زمیندار جی...... اس نے مجھے اتنے پیسے دیئے، اتنے ڈھیر سارے کہ میں ساری عمر عیش کی زندگی گزار سکتا تھا مگر......'' وہ ذرا رکا۔ ''وہ تو اللہ کے بڑے نیک بندے تھے۔ اس کے نیک بندوں کو دھوکہ اور تکلیف دینے والا چین سے کہاں رہ سکتا ہے۔''

''لیکن...... کریم داد...... آخر وہ تھا کون اور تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟'' زمیندار برکت علی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا انہوں نے بیچ سے ہی اس کی بات کاٹ دی اگرچہ ان کی اپنی آواز میں لرزش تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''پہلے آپ مجھ سے وعدہ کریں زمیندار جی کہ مجھے سولی پر چڑھوا دیں گے کہ اب زندہ رہ کر گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔''

''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کیا گناہ ہے۔ کیا ثواب ہے اس کا فیصلہ بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہم تو محض مجبور بندے ہیں۔''

''پر یہ بھی تو معلوم ہو ابا کہ تو نے کس کے ہاں ڈاکہ ڈالا، قتل کیا جو تو یوں پاگلوں کی طرح باتیں کیے جا رہا ہے۔'' خیر دین کی قوت برداشت بھی جواب دیئے جا رہی تھی۔

''میں نے...... میں نے زمیندار جی......'' اس نے سر اٹھا کر زمیندار برکت علی کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں عجیب سی حسرت اور ویرانی تھی۔ خوف تھا۔ پشیمانی تھی، لیکن آواز میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ خود اعتمادی تھی۔ ''میں وہ ذلیل انسان ہوں زمیندار جی جس نے اپنے مالک، اپنے آقا، اپنے محسن نواب وجاہت علی کو درندوں کے سپرد کر دیا تھا۔ پھر...... پھر ان ظالموں نے ان کو...... مار ڈالا۔''

''زمیندار برکت علی اور رحیم خان کا سارا جسم منجمد ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں دہشت تھی، دکھ تھا۔ کریم داد تو اس گاؤں کا شریف ترین انسان تھا پر دولت کتنی بدتر اور

کم ترشے ہے جس نے آناً فاناً اس کی شرافت، نیکی اور تمام تر اچھائیوں کو مٹی میں ملا دیا۔ برکت علی نے بولنا چاہا لیکن الفاظ ان کی زبان سے ادا نہ ہو سکے۔ کرم داد فرش پر بیٹھا سر جھکائے بولے جا رہا تھا۔

''جب رعایا نے بغاوت کی اس وقت نواب صاحب گاؤں کے دورے پر تھے۔ وہ حویلی جانے پر بضد تھے ہم لوگوں نے انہیں منع کیا، ان کا خاص ملازم شامو ان کے ساتھ ہی تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ حویلی جانا خطرہ سے خالی نہیں اس لیے ان کو گاؤں میں کسی محفوظ مقام پر چھپا دیا جائے۔ رمضان خان نے وعدہ کیا کہ نواب صاحب کی حفاظت میں کروں گا۔ بہت جلد حالات بالکل ہی قابو سے باہر ہو گئے تو نواب صاحب نے بیگم صاحبہ کے نام پرچہ لکھ کر شامو کے ہاتھ حویلی بجھوا دیا۔ انہیں مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ میں نے انہیں تسلی دی تھی کہ گاؤں میں میرے ساتھ آپ بالکل محفوظ رہیں گے۔ لیکن وہ دھوکہ کھا گئے انہیں کیا معلوم تھا کہ رمضان خان اور اس کے ساتھیوں نے پہلے ہی پیسے دے کر مجھے خرید لیا ہے شیطان مجھے بہکا چکا تھا...... میں انہیں اپنے گاؤں، اپنے گھر لے آیا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھے۔ بار بار مجھے گلے لگا کر شکریہ ادا کر رہے تھے۔ پر میرا دل کٹ رہا تھا۔ ان کے اس اندھے بھروسے پر ایک دفعہ تو میرا دل چاہا سب کچھ بتا کر انہیں کہیں اور چھپا دوں لیکن رمضان خان کی دھمکی اور ٹرنک میں رکھے ہوئے نوٹوں کی گڈیوں نے میری زبان بند کر دی۔ میں کمینہ بندہ ان کو دھوکہ دیتا رہا۔ اگلی رات جب وہ کھانا کھا کر آرام کرنے کے لیے لیٹے ہی تھے کہ رمضان خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ گیا۔ نواب صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''خیریت رمضان میاں اتنی رات گئے کیسے آئے؟''

''آپ کی نوابیت کا کھیل ختم کرنے۔'' اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ان نمک حراموں نے انہیں گولیوں سے بھون دیا۔ میں سامنے کھڑا سب دیکھتا رہا۔ ان کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ ان کی کھلی آنکھیں میرے چہرے پر بے جان ہوئیں یہ ان آنکھوں کی بددعا ہے جس نے اس گھڑی سے آج تک مجھے ایک لمحہ بھی چین نہیں لینے دیا۔ یقین مانئے زمیندار جی ان باغیوں کا دیا ہوا سارے کا سارا روپیہ ابھی تک اس سامنے والے ٹرنک میں جوں کا توں پڑا ہے۔ میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ہاتھ لگاتا بھی کیسے جب بھی ارادہ کرتا وہ دو آنکھیں میرے راستہ میں حائل ہو جاتیں۔ اللہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا کہ میں وہ

درندہ ہوں جس نے بہت اچھے، نیک اور سب سے محبت کرنے والے انسان کو دھوکہ دیا ہے۔نواب صاحب مجھے معاف کر دینا۔بیگم صاحبہ!...... نادیہ! اور فوزیہ بی بی! آپ سب مجھے معاف کرنا...... میں...... میں......آپ سب کا گناہ گار ہوں۔''

زمیندار برکت علی گم صم بیٹھے تھے۔ان کے سامنے کریم داد زمین پر اوندھا پڑا۔ ہچکیوں سے رو رہا تھا لیکن ان کے کانوں میں تو بس ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔''میں نے ان کو مروا ڈالا...... میں ان کا قاتل ہوں۔''

کتنے لمحے بیت گئے رحیم خان اور زمیندار برکت علی تسلی کا ایک حرف بھی اس سے نہ کہہ سکے۔ کہنے کے لیے رہا بھی کیا تھا آخر بڑی دیر بعد جب اس کی ہچکیوں کی آواز مانند پڑ گئی تو زمیندار برکت علی نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اٹھانا چاہا......تو...... وہ کانپ کر رہ گئے۔

کریم داد ختم ہو چکا تھا۔

☆

گلزار نگر سے واپسی پر عابدہ بیگم یوں خوش ہو رہی تھیں جیسے کوئی انمول خزانہ ہاتھ لگ گیا۔ ناامیدی میں اگر امید کی ہلکی سی کرن بھی نظر آ جائے تو انسان کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ سچ پوچھو تو نادیہ کی طرف سے وہ اتنی پُر امید نہیں تھیں۔ انہیں دھڑکا لگا تھا۔ پچھلا تجربہ بڑا سخت تھا۔ ان کے ساتھ جانے کے لیے اس نے جس صفائی سے انکار کیا تھا وہ لمحہ وہ بھولی نہیں تھیں۔ پھر یہ تو زندگی کا ساتھ نبھانے والی بات تھی۔ حالات نے اسے تلخ بنا دیا تھا۔ رشتوں پر سے اس کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ آج تک کوئی یہ بھی نہ جان سکا تھا کہ منصور کے بارے میں اس کے احساسات کیا ہیں۔ ہاں اس گھپ اندھیرے میں عابدہ بیگم کے پاس امید کی ایک کرن تھی وہ تھا باپ کی بات کا مان رکھنا۔ سو وہ اس نے رکھ لیا تھا۔

نادیہ کی رضامندی نے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔ فوزیہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ البتہ نازلی کی خوشی اور جوش و خروش میں شرم و حیا کا عنصر بھی غالب تھا۔ یہ لڑکیاں بھی عجیب و غریب شے ہوتی ہیں۔ رشتہ طے ہو جانے پر ان کے عجیب تاثرات ہوتے ہیں دکھ اور خوشی...... خوف اور تجسس، اپنائیت اور اجنبیت ان سب کا مکسچر بن کر رہ جاتی ہیں۔ ایک طرف ان کا رنگین اور بے نیاز ماضی ہوتا ہے تو دوسری طرف مستقبل کے

وسوسے۔ ماں باپ کی محبتیں اور پیار وہ تو کہیں اور کسی صورت نہیں ملتا۔ ہاں اپنا آپ، اپنی خودداری کی بنیاد پر اپنی خواہشات کے گارے سے جو عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ اس میں قیام و طعام کی سہولتیں ضرور مل جاتی ہیں۔ حسین مستقبل اور پُر خلوص ساتھی کے تصور ہی سے نازلی کے چہرے پر گلال کھلا دیتے تھے۔

منصور کئی دن سے دفتر کے ضروری کام کے سلسلہ میں باہر گیا ہوا تھا۔ ان دونوں ہی کو اس کا شدید انتظار تھا۔ شام گئے جب ہی اس کی گاڑی پورچ میں آن کر رکی وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آ گئیں۔ منصور نے دروازے کے شیشے سے سر نکال کر حیرانی سے دونوں کو یوں آتا دیکھا، پلکیں جھپکائیں، ہینگر پر لٹکا ہوا کوٹ اتار کر باہر آتے ہوئے بولا۔

''خیر تو ہے۔ آج میرا استقبال اس قدر گرمجوشی سے کیوں کیا جا رہا ہے؟''

''آپ بھی عجیب انسان ہیں، استقبال نہ کرو تو شکایت ہوتی ہے کہ کیسی نالائق بہنیں ہیں اتنے دنوں بعد بھائی آیا تو دروازے پر خوش آمدید کہنے ہی نہیں آتیں...... اور......''

منصور نے آگے بڑھ کر فوزیہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔''بس...... بس...... عنایت مہربانی۔ یہ جانِ ناتواں آپ دونوں خواتین کے اس احسانِ عظیم کا متحمل نہیں ہو سکتا ویسے......'' وہ نازلی کی طرف مڑا اور ذرا اکڑ کر بولا۔

''چلو تم یہ کوٹ اور بیگ پکڑو اور اے لڑکی ادھر آؤ۔'' فوزیہ کو انگلی کے اشارے سے بلایا۔ گاڑی سے میرا اٹیچی کیس نکال کر اندر پہنچاؤ۔'' دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو سامان پٹخ کر بھاگ کھڑی ہوتیں لیکن آج تو بات ہی کچھ اور تھی۔

''جیسا حکم سرکار!'' نازلی نے سنبھال کر کوٹ اور بیگ پکڑا۔

فوزیہ نے آہستہ سے اٹیچی کیس اٹھا لیا۔ منصور ساکت کھڑا دونوں کو دیکھے جا رہا تھا۔

''اب اندر چلیے نا۔ ہمیں کیا گھور رہے ہیں؟'' انہوں نے آواز لگائی۔

''دراصل مجھے ان آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا ہے۔ کہیں میں کوئی انوکھا خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔'' دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''کتنی فرسٹ کلاس ایکٹنگ کرتے ہیں آپ...... حالانکہ ہم لوگ ہمیشہ سے آپ کے کام کرتے ہیں۔''

"جی ہاں بجا فرمایا آپ دونوں نے، میری دعا ہے اللہ تعالیٰ! ایسی فرمانبردار، خدمت گزار، بلکہ نہایت کام چور قسم کی بہنیں سب کو ملیں۔"

آخری الفاظ اس نے بڑی آہستگی سے ادا کیے تھے لیکن فوزیہ نے سن لیے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے سن لیا ہے۔ منصور بھائی!"

"پھر بھی......؟" اس نے رک کر حیرانی سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ "تم...... اتنا بھاری اٹیچی کیس اٹھائے لیے جا رہی ہو۔ حد ہے یعنی...... میری اس غیر موجودگی میں کہیں کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی صحبت تو نصیب نہیں ہوگئی جو......"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"ہمیں تو خیر نصیب ہو یا نہ ہو، صاحبزادہ منصور صاحب کو پہنچے ہوئے بزرگ کی صحبت ضرور ملنے والی ہے۔ بیٹا سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔" عابدہ بیگم کا کمرہ آ گیا تھا۔

منصور دونوں کو پیچھے دھکیل کر جلدی سے اندر چلا گیا۔

"آداب اماں جان!" اس نے آگے بڑھ کر اپنا سر ماں کے سامنے جھکا دیا۔

"جیتے رہو۔ میری جان!" انہوں نے ممتا بھری شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ دعائیں دیں۔ پیشانی پر پیار کیا۔ پھر نازلی اور فوزیہ پر نظر پڑتے ہی حیران ہو کر ہنس پڑیں۔

"ارے...... یہ کیا...... منصور میاں آپ نے چھوٹی بہنوں کو قلی بنا ڈالا۔ دیکھو تو میری بچیاں کیسی ہانپ رہی ہیں۔" دونوں نے سامان نیچے پٹخ دیا۔ منصور ہنسے جا رہا تھا۔ آخر ماں کی طرف جھک کر رازدارانہ انداز میں بولا۔

"آخر ماجرا کیا ہے اماں جان! یہ لڑکیاں چار پانچ دنوں میں اتنی نیک سیرت کیسے ہو گئیں۔"

"تو بدسیرت کب تھیں میری بیٹیاں! واہ منصور! تم نے بھی خوب کہی۔ ارے ایک تو تمہاری گاڑی کی آواز سنتے ہی مارے محبت کے بھاگی گئیں، اس پر سے تم نے اتنا سارا سامان بھی لاد دیا۔ خوش نصیبوں کو ملتی ہیں ایسی بہنیں۔"

"اس خوش بختی پر تعجب ہے اماں جان...... میرا خیال ہے۔ پہلے تو یہ کبھی ایسی نہ تھیں۔"

"فکر نہ کریں۔" نازلی تڑ سے بولی۔ "اب سارے ہی نیک کام کریں گے۔"

دفعتاً منصور کی نظر عابدہ بیگم کے سامنے پھیلے ہوئے سنہرے ٹشو کے دوپٹہ پر پڑی۔ اسے گھسیٹتے ہوئے بولا۔ "خیر تو ہے۔ اما جان! یہ سب کیا ہے؟ کہیں ان دونوں میں سے کسی کا......" رک کر بڑی معنی خیز نظروں سے دونوں کو باری باری گھورا۔

"غالباً آپ نے کسی ایک کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"وہ میرا مسئلہ ہے۔" عابدہ بیگم نے دوپٹہ سمیٹ کر رکھ دیا۔ "لیکن یہ بات یاد رکھو منصور میاں! میری زبان خراب الفاظ کبھی ادا نہیں کرنا چاہتی، وہ بھی خوشی کے موقع پر۔"

"سوری اماں جان!" منصور نے ماں کے قریب بیٹھ کر ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ "غیر ارادی طور پر شاید ایسا ہو گیا ہو ورنہ آپ جانتی ہیں میں کتنا شائستہ اور مہذب انسان ہوں۔" عابدہ بیگم کو ہنسی آ گئی فوزیہ اور نازلی مسکرائے جا رہی تھیں۔

"ویسے اطلاعاً عرض ہے۔" فوزیہ، منصور کے قریب آ کر معنی خیز انداز میں بولی۔ "ہم دونوں کو ٹھکانے لگاتے لگاتے کہیں آپ ہی ٹھکانے نہ لگ جائیں۔"

"اس خوش فہمی میں نہ رہنا، منصور علی خان کو ٹھکانے لگانا آسان کام نہیں ہے۔" وہ کسی دل جلی بڑھیا کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر بولا۔ "ویسے اماں جان! اب سب سے پہلے اس فوزیہ کی بچی کو ٹھکانے سے لگاؤں گا۔ اور ایسے آدمی کے پلے باندھوں گا جو شکل اور عقل دونوں لحاظ سے نرا گاؤدی ہو گا۔" عابدہ بیگم بے تحاشہ ہنس رہی تھیں۔ نازلی نے زور کا قہقہہ لگایا اور فوزیہ منہ تھپتھپا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

"پھوپھی حضور! منع کریں انہیں۔ یہ ہمیں تنگ نہ کریں۔" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"اچھا...... اچھا بھئی...... روؤ تو نہیں...... چلو فرسٹ کلاس کارٹون تو ٹھیک رہے گا۔"

"کیوں ستا رہے ہو...... منصور!" عابدہ بیگم نے ڈانٹا۔ "بڑوں کے ہوتے ہوئے ابھی اس کا کیا سوال۔ نازلی، نادیہ اور تمہارے بعد اس کا نمبر آئے گا۔" نازلی اور فوزیہ نے زوردار تالیاں بجائیں۔

"پھوپھی حضور زندہ باد۔"

منصور نے جلبلا کر دانت کچکچائے۔ اچانک پینترا بدل کر نہایت مسمسی آواز میں بولا۔

"اماں جان...... میں یہ دیکھ رہا ہوں۔ آپ کو میرا ذرا بھی خیال نہیں رہا ہے، صبح

صرف ایک پیالی چائے پی کر نکلا تھا۔ اس وقت یہاں پہنچا ہوں۔ یہاں کوئی اتنا اپنا نہیں ہے کہ کھانے کو نہ سہی چائے ہی کو پوچھ لے۔''

عابدہ بیگم تڑپ اٹھیں۔ ''سچ تو ہے۔ باتوں میں دھیان ہی نہ رہا۔ نازلی! بھائی کے لیے چائے کے ساتھ کھانے کی کچھ چیزیں بھی منگواؤ دیکھو تو سہی کیسا منہ اتر رہا ہے بھائی کا۔''

دونوں زور سے ہنس پڑیں۔

''خدا کی قسم منصور بھائی آپ بڑے اچھے ایکٹر ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ گھر کے کھانے کا مزہ باہر تو نہیں آ سکتا۔ جلدی سے جاؤ اور نوکر سے کہو چھوٹے صاحب کے لیے چائے کے ساتھ ناشتہ بھی لے کر آئے۔''

''وہ تو منگوا دوں گی۔ لیکن...... یہ صاف جھوٹ بول رہے ہیں اماں جان! ان کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ آدھا گھنٹہ تو بھوک برداشت نہیں کر سکتے۔ کیا چار گھنٹے بھوکے رہ سکتے ہیں۔''

''چلو...... جھوٹ بول رہا ہوں بس...... ہاں اماں جان، خالہ بیگم کی طرف سے جواب آیا یا نہیں۔'' منصور نے بدلہ لینے کے لیے پلٹا کھایا۔ نازلی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے فوزیہ بھی کمرے سے نکل آئی۔ عابدہ بیگم منصور کی اس حرکت پر دیر تک ہنستی رہیں پھر بولیں۔ ''بری بات ہے، منصور میاں! بہنوں کو یوں تنگ نہیں کرتے بیٹا خوش قسمت ہیں وہ بھائی جنہیں بہنوں کا پیار ملا ہو۔''

''اور وہ بہنیں خوش قسمت بہنیں ہیں جنہیں مجھ جیسے بھائی کا پیار ملا ہو۔'' عابدہ بیگم نے ایک دھپ رسید کی۔ ''باز نہیں آئے گا۔ تم نے تو آتے ہی ادھم مچا دیا ورنہ میں تو تمہیں بتانے والی تھی کہ خیر سے اگلے ماہ کی اکیس تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اسی ماہ کے آخر تک آپا بیگم اور بھائی صاحب معہ پورے خاندان کے یہاں آ جائیں گے۔ تمہارے ذمہ تو بہت سے کام ہیں جن میں سب سے پہلا تو یہ ہے کہ پیلی کوٹھی کھلوا کر صفائی کروا دو۔ اس میں ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کر دو تاکہ ان لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔''

''پہلے تو آپ دونوں کو بہت بہت مبارک ہو دوسرے آپ لوگ فکر نہ کریں بندہ حاضر ہے۔ انشاء اللہ دو دن کے اندر سب کام آپ کے حسب منشا ہو جائیں گے۔''

''جیتے رہو۔ خدا خوش رکھے۔'' انہوں نے بڑے دل سے دعا دی۔ چند سیکنڈ تک اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ کچھ کہنا چاہا لیکن رک گئیں۔

''آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہیں اماں جان!'' منصور نے ان کے تذبذب سے اندازہ لگایا وہ مسکرا دیں۔ منصور کو بھی ہنسی آ گئی۔ ''میں سمجھ گیا آپ کو ابھی اور اس سے زیادہ اہم کام مجھ سے کروانا ہے۔ بے دھڑک بتا دیں۔ آپ حکم کریں اور میں انکار کروں کبھی ایسا ہوا ہے۔'' عابدہ بیگم ہنس پڑیں۔

''میں تمہاری زبان سے یہی سننا چاہتی تھی۔'' وہ کچھ دیر رکیں پھر بڑے سنجیدہ اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولیں۔

''دراصل...... میرا اور تمہارے ابا میاں کا خیال ہے کہ نازلی کی شادی سے پہلے تمہارے رشتہ کا اعلان کر کے منگنی کر دی جائے۔''

''میرے...... یعنی کہ...... میری...... منگنی۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے بڑے حیران کن انداز میں پوچھا۔

''ہاں بیٹے تمہارا رشتہ، تمہاری منگنی، اس میں اتنے حیران پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

''لیکن...... اماں جان...... یہ اچانک نازلی کا رشتہ کرتے کرتے مجھے...... میرا مطلب بلاوجہ ہی مارا جاؤں۔''

''اچانک فیصلہ نہیں ہوا منصور میاں! یہ تو مدتوں پہلے کی بات ہے۔ تم تو جانتے ہو بیٹا وجاہت میرا کتنا پیارا بھائی تھا۔'' بھائی کا ذکر آتے ہی ان کی پلکیں نم آلود ہو گئیں ایک سیکنڈ رک کر انہوں نے اپنا آپ قابو میں کیا پھر بولیں۔ ''اس بھائی کے پیار کو انمٹ کرنے کے لیے ہم نے سوچا کہ نادیہ اور تم کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دیا جائے۔''

''نا...... د...... یہ...... اور میں......'' منصور آنکھیں پھاڑ کر بڑبڑایا۔

''نہیں...... اماں جان...... یہ ناممکنات میں سے ہے۔'' وہ بیٹھے بیٹھے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''بیٹا! یہ فیصلہ تو بہت پہلے جب تم دونوں ناسمجھ تھے۔ تمہارے ماموں حضور نے کر لیا تھا۔ انہیں نادیہ کی طرح تم بھی بہت عزیز تھے۔ ہمیں اس وقت بھی یقین تھا اور اب بھی ہے کہ...... مایوس نہیں کرو گے۔ میں نے نادیہ سے اس کی مرضی معلوم کر لی ہے۔ تمہاری مرضی اور خوشی بھی ضروری ہے۔ میں جانتی ہوں......'' وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بھانپتے ہوئے دھیرے سے بولیں۔

”نادیہ بڑی ضدی اور تیز مزاج ہے۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ تمہیں خوش نہ رکھ سکے۔ آخر کو وہ وجاہت جیسے محبت کرنے والے باپ اور ثریا دلہن جیسی نفیس خاتون کی بیٹی ہے۔“

اسے ہنسی آ گئی لیکن گردن جھکا کر بڑی خوبصورتی سے اپنی ہنسی کو چھپا لیا۔

”بولو...... مجھے تمہارا ہاں یا نا میں جواب چاہیے۔ زبردستی نہیں کروں گی۔ یہ خوشی کا سودا ہے بیٹے! اگر نادیہ اپنی ان کمزوریوں کی وجہ سے تمہیں ناپسند ہے تو...... بلا جھجک انکار کر دو اپنی خوشی کی خاطر اکلوتے بیٹے کی زندگی کو خوشیوں اور سکون سے محروم کرنا نہیں چاہتی۔“

”اماں جان!“ منصور نے نظریں اٹھا کر ماں سے براہ راست سوال کیا۔ ”نادیہ کو یہ رشتہ خوشی سے منظور ہے؟“

”ہاں...... اس لیے کہ یہ فیصلہ وجاہت نے کیا تھا اور نادیہ باپ کے کسی فیصلہ، کسی بات سے روگردانی نہیں کر سکتی۔“

منصور کے ہونٹوں پر بڑی گہری سی مسکراہٹ عود کر آئی۔

”اگر...... بالفرض میں یہ کہہ دوں کہ...... مجھے آپ کی لڑاکا، ضدی اور خود سر قسم کی بھتیجی قطعی پسند نہیں ہے تو؟“ اچانک عابدہ بیگم کے چہرے کا رنگ بدل گیا پھر بھی بڑے حوصلے سے مسکرائیں۔

”تو تمہاری خاطر بھتیجی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گی، اس لیے بیٹا کہ اب جبکہ نادیہ نے میری بات کا مان رکھ کر باپ کے فیصلہ کے حق میں رضامندی دے دی ہے تو...... تمہارے انکار سے اس کی انا اتنی مجروح ہو گی کہ......“ منصور نے آہستہ سے ان کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ماں کی آنکھوں میں اتنی گہری مایوسیاں تھیں کہ وہ کانپ سا گیا۔ ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر آہستہ سے بولا۔

”آپ کو میرے الفاظ نے دکھ پہنچایا۔“

”نہیں...... بالکل نہیں...... تم کیا جانو بیٹا! ماؤں کا دل کتنا بڑا ہوتا ہے۔ کتنا مضبوط، میں تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں بس۔“

”اماں جان!“ منصور کی اپنی آواز کانپ گئی۔ ”آپ بہت گریٹ ہیں۔ شاید بلکہ یقیناً ہر ماں اتنی ہی گریٹ ہوتی ہو گی۔ میں تو آپ کو ستا رہا تھا۔ بھتیجی کی کتنی چاہت ہے؟ آزما رہا تھا...... بھلا میری مجال کہ آپ، ابا میاں اور ماموں حضور کے کیے ہوئے فیصلہ کے خلاف

بولوں...... توبہ...... توبہ......“

عابدہ بیگم ہنستے ہوئے رو پڑیں۔ منصور کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر بولیں۔

”بہت شریر ہو گئے ہو۔ ماں کو امتحان میں ڈال دیا۔ اس بچی کو تنگ نہ کرنا۔“

”ایک بات آپ کی مانی ہے، دوسری آپ کو ماننی پڑے گی۔ تنگ نہ کرنے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔“

”آپ میری بہن کو تنگ کر کے تو دیکھیں......“ فوزیہ اور نازلی پردہ ہٹا کر اندر آ گئیں۔

”مبارک ہو منصور بھائی! آخر کار آپ ٹھکانے لگ ہی گئے۔“ نازلی نے تھالی میں سے مٹھائی اٹھا کر اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ پھر جلدی سے تھال ماں کے سامنے رکھ کر بولی۔

”مبارک ہو اماں جان منہ میٹھا کیجیے۔“

”آپ بھی منہ میٹھا کیجیے، مستقبل کے بہنوئی صاحب!“ فوزیہ نے مٹھائی کا ٹکڑا اس کے منہ میں دے دیا۔

”آپ نے دیکھا اماں جان! یہ دونوں ہماری باتیں سن رہی تھیں...... حد ہے بھئی۔ یہ تو بڑی خطرناک ہو گئی ہیں۔“ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

☆

فوزیہ کا خط پڑھ کر نادیہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”اس خط میں ایسی کون سی خوشخبری ہے جو آپ ہی آپ ہنسے جا رہی ہو، ہم بھی تو کھڑے ہیں برابر میں۔“ قریب ہی کھڑی مریم نے بال سنوارتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”یہ میں بھی جانتی ہوں کہ آپ بہ ہوش و حواس یہاں موجود ہیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ کسی خوشی کی خبر پر ہی ہنسا جائے۔“ نادیہ نے خط کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

”یہ نادیہ وجاہت علی کا اپنا فلسفہ ہو گا۔ ورنہ آج تک تو یہی سنتے آئے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے دور حکومت میں لوگ خوشی کی خبر پر دھاڑیں مار مار کر روتے ہوں۔“ نادیہ زور سے ہنس دی۔

”بڑی ذلیل ہو۔“

”ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ خاکسار تو آپ ہی کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔“ مریم نے جھک کر آداب کیا پھر کوٹ پہنتے ہوئے بولی۔

"ویسے کیا اب یہ معلوم کرنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ کس کا خط ہے؟ کیا لکھا گیا ہے؟"

"خدا کی مار...... تم ہو کہ خط کے مضمون کی فکر میں گھلی جا رہی ہو اس کا ہوش نہیں کہ نو بج چکے ہیں۔ پرویز زیدی کی کلاس شروع ہو چکی ہو گی۔" مریم نے گھبرا کر گھڑی پر نظر ڈالی پھر نادیہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے، کسی بزرگ نے کہا تھا کہ صبح ہی صبح خط پڑھنا شروع کر دو اور ساتھ ہی ساتھ ہنسنا بھی شروع کر دو؟"

"میرا خط تھا۔ میں ہنسوں یا روؤں...... دیکھنے والوں کو کیوں تکلیف ہو؟ اچھا بس...... اب جلدی چلو......" دونوں کتابیں اٹھا کر تقریباً بھاگتی ہوئی کلاس روم میں پہنچ گئیں۔

شام چار بجے نادیہ تیار ہو کر بیڈمنٹن کھیلنے جا رہی تھی کہ میٹرن نے اطلاع دی۔

"بی بی! ملاقاتی کمرے میں کوئی صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اچھا۔" نادیہ کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ معاً اس کا ذہن منصور کی طرف چلا گیا۔ "وہی بدتمیز آدمی ہو گا اس لیے کہ بیرسٹری کی ڈگری کے ساتھ ساتھ اس قسم کی فضولیات کی ڈگری بھی ان حضرت ہی کے پاس ہے۔" لیکن ساتھ ہی اس کے رخسار تپ اٹھے۔ اور چہرے پر ہلکی سی گلال پھوٹ پڑی۔ ملاقاتی کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کی نظر منصور کے بجائے ڈاکٹر عامر پر پڑی۔ لمحہ بھر کے لیے چہرہ کا رنگ بدلا۔ عجیب سی مایوسی کا احساس ہوا۔ لیکن فوراً ہی آگے بڑھ کر اس نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔

"آداب ڈاکٹر صاحب! کیسے ہیں؟"

عامر کھڑا ہو گیا۔ سرسری نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ سفید لباس میں وہ اچھی خاصی اسمارٹ لگ رہی تھی۔ ہاتھ میں ریکٹ تھامے۔ سامنے کھڑی وہ بڑے پیارے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ عامر نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

"غالباً آپ کھیلنے جا رہی تھیں...... میں بے وقت آ گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تو بس یونہی گھنٹہ دو گھنٹہ پریکٹس کر لیتی ہوں۔ آپ تشریف رکھیں۔"

دونوں آمنے سامنے پڑے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"کافی عرصہ سے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ آج ادھر سے گزرا تو سوچا آپ سے بھی ملتا چلوں۔"

"شکریہ......" میں بھی سوچ رہی تھی کہ آپ تو بالکل ہی غائب ہو گئے۔ دراصل آپ مصروف بھی تو بہت رہتے ہوں گے۔ کسی بندے کو جلانا، کسی کو مارنا، بڑا مشکل پیشہ ہے۔"

عامر زور سے ہنس پڑا۔ "کچھ دنوں بعد آپ کو خود ہی اس چیز کا تجربہ ہو جائے گا۔"

"بس دعا کیجیے فیل نہ ہو جاؤں ورنہ جہاں تک تجربات کا تعلق ہے ان میں تو میں نے پی ایچ ڈی کیا ہوا ہے۔"

ڈاکٹر عامر مسکرا دیا۔ "حاضر جوابی میں بھی آپ کا جواب نہیں۔ ویسے یہ فیل ہونے کا خیال بھی دل میں کیسے آیا۔ آپ جیسے ذہین لوگ بھی کہیں فیل ہوا کرتے ہیں۔"

نادیہ زور سے ہنس پڑی۔ "اس کو کہتے ہیں مبالغہ آمیزی۔ بھلا آپ سے کس نے کہہ دیا میں ذہین ہوں، رٹ رٹا کر نمبر لے ہی لیتی ہوں۔"

"چلیے کند ذہن سہی۔ یہ بتائیں پڑھائی کیسی ہو رہی ہے۔ اگر کوئی مشکل ہو؟ کسی مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بندے کو یاد فرما لیجیے گا۔"

"بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب! آپ نہ بھی کہتے تب بھی اگر مشکل میں گرفتار ہوتی تو آپ ہی کو تکلیف دیتی۔" عامر مسکرا دیا۔

دونوں خاموش ہو گئے۔ بات کرنے کے لیے کوئی موضوع بھی نہیں رہا تھا۔ نادیہ بے چین تھی بلکہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی۔ 'بس بھاگو بھی ڈاکٹر صاحب...... ہو گئیں بہت باتیں میرے کھیل کے وقت کو تو برباد نہ کرو۔' آخر عامر نے اس سکوت کو توڑا۔

"آپ کی پھوپھی حضور کے یہاں تو سب خیریت ہے؟"

"استغفر اللہ۔" وہ بڑبڑائی لیکن نہایت شائستگی سے بولی۔ "جی ہاں...... خدا کا شکر ہے۔"

"منصور صاحب آج کل کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں؟"

منصور کے نام پر اس کا دل زور سے دھڑکا بائیں ہاتھ سے بالوں کو سمیٹتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"حضور اسلام پور ہی میں ہیں اور مجھے پکا یقین ہے کہ جھوٹ سچ کی ملاوٹ کر کے کامیاب پریکٹس کر رہے ہوں گے۔ ویسے آپ اپنے دوست سے ملنے نہیں گئے۔"

"جی ہاں...... مصروفیات کی وجہ سے اسلام پور جانا ہی نہیں ہوا اور وہ نالائق گلزار نگر آتا تو ہو گا لیکن یہ توفیق کبھی نہیں ہوتی کہ مجھ سے ملنے آ جاتا۔"

"اس کے یہ معنی ہیں کہ سخت ناقابل اعتماد قسم کے دوست ہیں آپ کے۔" نادیہ نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ "ویسے ان کی نامعقولیت کی سزا دینے کے لیے کسی روز ہمت کر کے اسلام پور چلے ہی جائیں۔"

عامر کو ہنسی آ گئی۔ "ترکیب تو آپ نے اچھی بتائی...... کوشش کروں گا کہ اگلے ہفتہ چکر لگا آؤں۔ حالانکہ بڑا چکنا گھڑا ہے، ہر بات کو مذاق میں اڑا دے گا۔"

"جی ہاں...... ساتھ ہی ساتھ بے شرم بھی بہت ہے۔ اچھا ڈاکٹر صاحب ایک بات میں میں بھی کتنی بدتہذیب ہوں ابھی تک آپ سے چائے یا ٹھنڈے کے لیے پوچھا تک نہیں۔" چیکو قسم کے لوگوں کو بھگانے کی یہ بڑی معقول ترکیب تھی۔

"شکریہ چائے پی کر ہی آ رہا ہوں اب چلتا ہوں۔ آپ کا خاصا وقت برباد کیا۔"

خدا تیرا شکر ہے۔ اس نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ "ایسی بھی کیا جلدی ہے ڈاکٹر صاحب! تھوڑی دیر اور تشریف رکھیں کم از کم کافی کا ایک کپ ہی لے لیتے۔"

عامر کھڑا ہو گیا۔ "پھر کسی وقت آن کر پی لوں گا ادھار رہی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

نادیہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ دور ہی سے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کیا اور بھاگتی ہوئی فیلڈ میں پہنچ گئی۔

"خیریت، کہاں غارت ہو گئی تھیں؟" اس پر نظر پڑتے ہی پارٹنر رعنا نے جلبلا کر سوال کیا۔

"سوری رعنا! خدا کی قسم وہ ڈاکٹر تو صوفے پر چپک کر ہی رہ گیا تھا۔ میں تو سمجھی آج کا گیم گیا۔"

"بنومت۔" رعنا نے ڈانٹا۔ "چاہے دل میں خوش ہو رہی ہو ہمارے معاشرے کی لڑکیوں میں یہی تو خرابی ہے کہ اسمارٹ، ہینڈسم اور مالدار قسم کے لڑکوں سے ملنے کے لیے، دوستی بڑھانے کے لیے بے چین رہتی ہیں اور ظاہر یوں کرتی ہیں گویا انہیں ان کی پرواہ ہی نہیں ہے۔"

"تم اعلیٰ درجہ کی خبیث ہو رعنا بیگم! ارے لڑکی! ڈاکٹر بس تھوڑا سا اسمارٹ ہے۔ مہذب ہے مگر شکل سے بے وقوف۔"

"بکواس بند۔" رعنا نے بیچ میں روک دیا۔ "اپنے سارے کام تو اس ننھی سی جان

سے کروا لیے اب جبکہ مطلب نکل گیا تو شکل سے بیوقوف نظر آنے لگا۔"

"نہیں بھئی میرا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا۔" نادیہ نے سمجھانا چاہا۔

"ویسے بڑا دیدہ زیب ہے۔ گستاخی معاف تمہارے لیے کیسا رہے گا بات کروں نہایت سعادت مند ثابت ہوگا۔"

"میرے ہاتھ میں ریکٹ ہے۔ اس کی چوٹ بھی بڑی سخت ہوتی ہے۔ ویسے اب آپ اپنی بک بک بند کر دیں تو بہتر ہوگا۔" دونوں ہنستے ہوئے کھیل میں منہمک ہو گئیں۔

رات استری کے لیے جب کوٹ اتارا تو فوزیہ کا خط پھر ہاتھ میں آ گیا۔

مریم باہر تھی۔ اس نے جلدی جلدی دوبارہ پڑھا پھر کچھ سوچتے ہوئے بڑی بیزاری سے الماری کھول کر دراز میں ڈال دیا۔ "خدا جانے پھوپھی حضور کو اتنی جلدی کیا تھی۔" استری کرتے ہوئے وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔ "تین سال کی تو بات تھی۔ گزر جاتے تب یہ جھگڑا کھڑا کرتیں۔ لیکن قصور تو میرا ہی ہے، میں نے کیوں ایک دم ہی ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔" کوٹ ہینگر پر لٹکا کر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ "پر جب ابا حضور کی یہی مرضی اور ان کی خوشی یہی تھی تو...... میں انکار کر بھی نہیں سکتی تھی۔" ایک دم ہی جوش میں آن کر کھڑی ہو گئی۔

"انکار تو منصور کو کرنا چاہیے تھا سمجھ میں نہیں آتا وہ کیسے راضی ہو گیا۔"

منصور کا نام آتے ہی لمحوں میں وہ حال کو پھلانگ کر ماضی میں پہنچ گئی۔

"میری پیدائش بھی عجیب و غریب تھی۔ بقول امی حضور کے ادھر تم پیدا ہوئیں اور ادھر دوسرے کمرے میں دادی حضور کا انتقال ہوا۔ کتنی انہونی بات ہے۔ پھر تھوڑی بڑی ہوئی تو ابا اور امی حضور دونوں ہی ہم سے دور چلے گئے۔ ریاست ختم ہو گئی۔ حویلی چھن گئی لوگ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ نادیہ وجاہت علی سبز قدم ہے۔ منحوس ہے۔ خود منصور ہی نے کتنی بار مذاق میں صحیح کہا۔ نادیہ جی آپ ذرا دور ہی دور رہیں کہیں آپ کی قربت ہمیں بھی اللہ کے گھر نہ پہنچا دے۔" اس کے ہونٹوں پر اداس مگر بڑی تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"سنتے ہیں قسمت کا لکھا انمٹ ہوتا ہے۔ آخر یہ منصور رضامند کیوں ہوا۔ کہیں اللہ نہ کرے اگر یہ شادی بھی......" اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"نہیں...... اللہ میں...... ایسا نہ ہو...... ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر واقعی میں منحوس ہوں تو منصور کو میری اس نحوست سے محفوظ رکھنا۔ مجھے ہی کچھ ہو جائے۔ ویسے بھی ماں باپ کے

بعد بندے کا کوئی بھی تو بہت اپنا نہیں ہوتا۔'' منصور کے تو بہت سے اپنے ہیں۔ اسے ان کی اور انہیں اس کی ضرورت ہے۔ اللہ میاں! میری اتنی سی گزارش ہے۔'' اللہ میاں سے باتیں کر کے جیسے نادیہ کو سکون مل گیا ہو۔ وہ دوبارہ حال کی طرف لوٹ آئی۔ استری کا پلگ نکالا اور خاموشی سے مسہری پر آن کر لیٹ گئی۔

آنکھیں کھلی تھیں۔ جسم مسہری پر تھا۔ لیکن ذہن نامعلوم رستوں پر بھٹک رہا تھا۔

مریم بڑی دیر سے کھڑی اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ آخر تھک کر قریب ہی ٹک گئی بالوں کو سمیٹتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

''تھیب دشمناں۔ ہر ہائینس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

نادیہ چونک اٹھی۔

''ارے...... تم...... مریم بیگم!...... اتنے گھنٹوں سے کہاں غائب تھیں۔ میں سمجھی مر کھپ گئیں۔'' وہ ہنستی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ فضا میں چھائی ہوئی دھند دور ہو چکی تھی۔

''میری فکر چھوڑو...... پہلے یہ بتاؤ۔ ذہنی گمشدگی کا مرض کب سے لاحق ہوا؟''

''آپ کو تو ہمیشہ الٹی سوجھتی ہے ابھی تک تو میں ہوش و حواس میں ہوں۔ دراصل اتنی تھک گئی تھی کہ چپ چاپ آنکھیں بند کر کے پڑے رہنے ہی میں سکون مل رہا تھا۔'' مریم نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی نادیہ وجاہت علی سے اس کے دل کی بات جاننا ناممکنات میں سے ہے۔ وہ تو ایسا پتھر ہے جو خود تو ٹوٹ سکتی ہے لیکن اس کی ذات سے دوسروں کو چوٹ لگے یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اپنے آپ کو دکھوں کا اشتہار بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کر کے ہمدردیاں حاصل کرنے سے اسے نفرت تھی۔

''اچھا چلو اٹھو...... چائے پی کر پڑھائی شروع کرو۔'' وہ چپ چاپ اٹھ کر مریم کے ہمراہ ہو لی۔

☆

پوری حویلی میں ہنگامہ بپا تھا۔ برسوں بعد اس خاندان کے ان مختصر سے افراد کو یہ مسرتیں اور خوشیاں دیکھنی نصیب ہوئی تھیں۔ اسی لیے رشید احمد نے دل کھول کر جشن منانے کا اہتمام کر ڈالا تھا۔ معمولی بات تو نہیں تھی۔ ان کی اکلوتی بیٹی اور اکلوتے بیٹے کی شادی کی تقریبات تھیں یہ دن تو ہر ماں ہر باپ کی زندگی کا اہم ترین اور مسرت انگیز دن ہوتا ہے

جس کے انتظار میں وہ وقت کی ہر کٹھنائی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہتے ہیں۔ رشید احمد اور عابدہ بیگم کا بس چلتا تو وہ وقت کی لگامیں تھام کر اس کو یہیں پر زندہ جاوید کر دیتے۔ حویلی کا چپہ چپہ رنگ برنگی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ حویلی کا بڑا گیٹ شادی سے ایک ہفتہ پہلے ہی پھولوں سے سجا دیا گیا تھا۔ مالی کو خاص ہدایت دی گئی تھی کہ ہر روز مرجھائے ہوئے پھولوں کی جگہ تروتازہ پھول لگائے جائیں۔ نازلی کا کمرہ فوزیہ نے خود بڑی محنت اور جانفشانی سے سجایا تھا۔ مایوں کی مناسبت سے کمرے کے پردے، چادریں، ہر چیز ابٹن کے زرد رنگ میں بنائی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں اور کمرے کے دروازے پر پردوں کی جگہ گیندے کی بے شمار لڑیاں لہرا رہی تھیں۔ دو دن سے فوزیہ سجاوٹ میں مصروف تھی۔ تھکن سے برا حال تھا لیکن کام کرنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔ کئی بار نازلی نے ٹوکا بھی لیکن ہر بار ہنس کر ٹال جاتی۔ عابدہ بیگم اور رشید احمد کے طے شدہ پروگرام کے تحت نازلی کے مایوں سے ایک دن پہلے منصور اور نادیہ کی منگنی تھی۔ مایوں میں تین دن باقی تھے۔ رسم منگنی میں دو دن اور نادیہ ابھی تک غائب تھی۔ ''بڑی بے پرواہ لڑکی ہے اللہ اس کو احساس ذمہ داری دے۔'' آتے جاتے عابدہ بیگم اپنی پریشانی کا اظہار کر جاتیں۔

نازلی، ماں کی گھبراہٹ اور فکر پر مسکرا دیتی اور فوزیہ کچھ بولے بنا سوچوں میں غرق ہو جاتی۔ تمام کاموں سے نمٹ کر تھوڑی دیر تھکن اتارنے نازلی کے پاس آن کر لیٹی تھی کہ منصور نے پردہ ہٹا کر جھانکا۔

''ہیلو...... ہیلو...... کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' پھر اجازت ملے بغیر ہی اندر آ کر نازلی کے قریب بیٹھ گیا۔

''ہائے فوزیہ وجاہت! آپ تو اس طرح نڈھال سی پڑی ہیں جیسے نامعلوم کتنے معرکے سر کر لیے ہوں۔''

وہ تنک کر اٹھ بیٹھی۔

''دلہن کا کمرہ سجانا بھی ایک معرکہ ہے۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ آپ سے زیادہ کام کر رہی ہوں۔'' منصور مضحکہ خیز انداز میں ہنسا۔

''جواب نہیں آپ کا اور مجھ سے زیادہ کام کر رہی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ابا جان پر رعب ڈالنے کے لیے ایک کمرے سے دوسرے کمرے کا چکر ضرور لگاتی رہی ہیں۔''

نازلی کو ہنسی آ گئی۔

''اور آپ کتنا کام کر رہے ہیں ہمیں معلوم ہے۔ تمام دن باہر بیٹھے دوستوں سے گپیں مارتے رہتے ہیں یا چائے پیتے ہیں۔ پھوپھا حضور کی جھلک نظر آئی اور جھوٹ موٹ ہی کام میں لگ گئے۔''

''وہ الگ بات ہے۔''

منصور نے گردن اکڑا لی۔ ''دراصل شاہی خاندان کے لوگوں کے یہی اطوار ہوتے ہیں، نوکر چاکر کاموں میں جتے رہتے ہیں اور وہ آرام سے ٹانگیں پھیلا کر چائے یا کافی یا ٹھنڈا نوش جان فرماتے رہتے ہیں۔''

''کام چور قسم کے لوگ یونہی دل خوش کر لیا کرتے ہیں۔ فوزی! ان بے چاروں کو معاف کر دو۔'' نازلی نے فوزیہ کا ساتھ دیا۔ منصور نے پلٹ کر نازلی کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

''یہ...... یہ تم بولی تھیں۔''

''جی ہاں...... یہ اس خاکسار کے الفاظ تھے۔'' نازلی بے تحاشہ ہنسے جا رہی تھی۔ فوزیہ کا بھی ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

''لڑکی! شادی ہونے میں صرف چھ دن رہ گئے ہیں۔ حال یہ ہے کہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور قہقہے بلند ہو رہے ہیں۔ ارے ذرا بھی نور نہیں اترے گا۔'' اس نے بڑی بوڑھیوں کی طرح ہاتھ نچا نچا کر نصیحت کی۔

''آپ کی منگنی میں بھی تو دو دن باقی رہ گئے ہیں۔ تھوڑی تو شرم کر لیجیے۔'' فوزیہ جلدی سے بولی۔

''ارے ہاں...... دو دن بعد منگنی ہے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اللہ خیر ہی کرے۔ عجیب منگنی ہے۔ دلہن صاحبہ کا کوئی اتا پتا ہی نہیں۔''

''تو آپ کا خیال ہے کہ آپ کے ساتھ تفریح کرتی پھرے۔'' نازلی سے چپ نہ رہا گیا۔

''میری بہن بے حیا نہیں ہے کہ شادی سے پہلے ہونے والے شوہر کے ساتھ گھومتی پھرے۔'' نادیہ کے خلاف بات سننا فوزیہ کی برداشت سے باہر تھا۔

''جی ہاں وہ تو بڑی شرم دار خاتون ہیں۔'' منصور کھا جانے والے انداز میں فوزیہ سے

مخاطب ہوا۔ اسے ہنسی آ گئی۔

''کہیے تو ان شرم دار خاتون کو انگوٹھی پارسل کر دوں۔ ممکن ہے یہاں آن کر شرم سے پانی پانی ہو جائیں۔''

''اللہ سمجھے آپ کو منصور بھائی!'' فوزیہ نے دانت پیسے۔

''ویسے ٹھیک تو ہے۔ وہ آئیں کیوں نہیں حالانکہ انہیں تو کل آ جانا چاہیے تھا۔''

وہ فکر مند ہو گئی۔

''شرم کے مارے قدم ہی نہیں اٹھ رہے ہوں گے تو آتی کیسے۔''

''منصور بھائی!...... آپ باز نہیں آئیں گے۔'' نازلی نے ڈانٹا۔

''اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔ اماں جان، بھائی کی محبت میں عجیب سرپھری لڑکی میرے سر تھوپ رہی ہیں۔''

''خدا نہ کرے وہ سرپھری ہوں۔'' فوزیہ کا منہ بن گیا۔ ''اگر وہ سرپھری ہیں تو آپ انکار کیوں نہیں کر دیتے۔ کسی نے خوشامد کی ہے۔'' غصہ اور دکھ میں اس کا چہرہ لال پڑ گیا تھا۔ منصور کو ہنسی آ گئی۔ اٹھ کر اس کا کان کھینچتے ہوئے بولا۔

''بس ان کی بہن صاحبہ کی شان میں گستاخی کی اور ان کا مزاج بگڑا۔''

''جی ہاں...... میں ان کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کرتی۔'' فوزیہ کھڑی ہو گئی پھر بڑے تشویشناک انداز میں بولی۔ ''سچ منصور بھائی...... آپی کو آ جانا چاہیے تھا۔ اللہ کرے خیریت سے ہوں۔''

منصور کو پھر شرارت سوجھی۔ ''کمال ہے، ارے وہ خیریت سے نہ ہوں گی تو اور کون ہو گا۔''

''کیوں؟''

''بے چاری خیریت کو ان کے پاس جا کر اپنی شامت بلانی ہے۔''

''منصور...... بھائی!'' فوزیہ چلا پڑی۔ نازلی پیٹ پکڑے ہنسے جا رہی تھی۔ اور منصور جان بچا کر کمرے سے باہر بھاگ گیا۔ نیم تاریک گیلری سے گزرتے ہوئے معاً اس کی نظر اپنے سامنے خاصے فاصلے پر سے آتی ہوئی نادیہ پر پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر مسرت انگیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس اور دوسرے میں بیگ تھامے وہ خراماں خراماں

چلی آ رہی تھی۔ وہ خود دبے دبے قدم اٹھاتا اس کے نزدیک آ گیا۔

''یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر۔'' سلام دعا کے بغیر ہی منصور نے مصرعہ پڑھا۔

''ہیلو...... آپ!'' وہ اسے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ لیکن فوراً ہی چہرے کے تاثرات چھپا کر جلدی سے بولی۔ ''اندھیرے میں بھوت کی طرح کدھر سے آن ٹپکے۔''

''آپ کے استقبال کو۔''

''شکریہ۔'' اس نے جلدی سے آگے بڑھ جانا چاہا۔

''اونہہ...... میرے ساتھ چلیے اماں جان بڑے غصہ میں بیٹھی ہیں۔'' منصور نے راستہ روک کر اٹیچی کیس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''کیوں؟ بھلا غصہ میں کیوں ہیں؟ اب دس دن پہلے تو آنے سے رہی۔ آج ہی آ گئی...... غنیمت سمجھیے۔''

''بڑی عنایت ہے آپ کی۔''

''اور نہیں تو کیا۔'' وہ تڑ سے بولی۔

''خیر جی...... منگنی مبارک ہو۔'' منصور سے رہا نہ گیا۔

''آپ ہی کو مبارک ہو...... خوامخواہ کے لیے پیچھے ہی پڑ گئے۔''

''مجھے کیا ضرورت تھی آپ کے پیچھے پڑنے کی۔ آپ ہی نے رو رو کر اماں جان کو خوشامد کی ہو گی۔''

''اس خوش فہمی میں نہ رہیے گا۔'' وہ ہنستے ہوئے چڑانے والے انداز میں بولی۔

''میں نے تو محض پھوپھی حضور کے ڈر سے ان کا دل رکھنے کے لیے حامی بھر لی تھی ورنہ......''

''تو میں نے کون سا دل سے رضامندی دی ہے۔''

''انکار کر دیا ہوتا۔ آپ کی زبان کس نے روکی تھی۔ کسی کا بھلا ہو جاتا۔''

''تم ہی نے انکار کر دیا ہوتا...... میری بھی جان بچتی۔''

''ٹھیک...... ابھی پھوپھی حضور سے بات کیے لیتی ہوں۔ وقت ہے۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

''گلا نہ گھونٹ دوں گا...... انکار کر کے دیکھو۔'' منصور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور باہر

نکل گیا۔

☆

''عابدہ بیگم اور رشید احمد نے بیٹے کی منگنی کے لیے بڑا زبردست پروگرام ترتیب دیا تھا۔ رسم کے بعد ہی دلہا دلہن کے اعزاز میں شامِ غزل منعقد کی گئی تھی۔ ڈانسر تھے لیکن جیسے ہی نادیہ کو ان پروگراموں کا علم ہوا وہ شدید مخالفت پر اتر آئی۔

''نہیں پھوپھی حضور!...... آپ کو منگنی کرنی ہے نا...... سادگی سے کیجیے۔ یہ سارا دھوم دھڑکا مجھے...... پسند نہیں ہے۔ یہ سب چیزیں بڑی سطحی سی لگتی ہیں۔'' پھر جلدی یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ برا مان گئی ہیں۔ گلے میں باہیں ڈال کر بڑے پیار سے بولی۔

''وہ یہ کہ پھوپھی حضور میرے اندر شاید بوڑھوں کی روح ہے، اسی لیے اچھل کود، گانا بجانا، ناچ رنگ اس قسم کی واہیات تقریبوں میں پھنس جاؤں تو پاگل سی ہونے لگتی ہوں۔ آپ بھلا...... یہ کہاں پسند کریں گی کہ انگوٹھی پہنتے ہی دلہن دیوانوں جیسی باتیں کرنے لگے۔'' غصہ اور رنج کے باوجود عابدہ بیگم کو ہنسی آ گئی۔

''نادیہ جان تُو تو ہو بہو اپنے باپ کی تصویر ہے اس سے بھی کبھی جیت نہیں سکی تو...... تم سے کہاں جیت سکتی ہوں۔ چلو تمہاری مرضی سہی جیسا تم چاہو گی ویسا ہو گا۔ اب تو خوش ہو۔''

''تھینک یو پھوپھی حضور!''

''وہ بھی آخر آخر میں ایسا ہی کہہ دیا کرتے تھے۔'' پھوپھی بھتیجی دونوں کی آنکھیں نم آلود تھیں۔ عابدہ بیگم نے گلے لگا کر بہت سارے پیار کر ڈالے۔ پھر آہستہ سے بولیں۔

''اچھا تو وہ جوڑا جو میں نے خاص طور پر منصور کی دلہن کے لیے بنوایا ہے وہ تو پہنو گی نا۔''

''اب اتنی بھی بری نہیں ہوں۔ آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گی۔''

''جیتی رہو۔ خوش رہو۔'' انہوں نے گلے سے لگا کر ڈھیر ساری دعائیں دے دیں۔

رشید احمد کو بھی آخر کار نادیہ کی بات ماننی پڑی اور یوں نازلی کے مایوں سے ایک دن پہلے صرف رشتہ داروں کی موجودگی میں نہایت سادہ تقریب میں عابدہ بیگم نے نادیہ اور منصور کو منگنی کی انگوٹھی پہنا دی۔

ہلکے گلابی رنگ کے کامدار سوٹ میں شرماتے کی کوشش کرتے ہوئے نادیہ بے حد

پیاری لگ رہی تھی۔ نجمہ بی اس تقریب میں شریک تھیں لیکن بالکل خاموش اور ناراض سی۔ ریاض نے خالہ کے گھر آنے اور ملنے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔

رات ان دونوں کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن تقریب نہایت رسمی سی تھی بقول نادیہ کے شکر ہے نازلی کی شادی کے ہنگامے کی وجہ سے وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے سے بچ گئی۔ چھوٹی پھوپھو بالکل الگ تھلگ اور خاموش تھیں۔ اس کی وجہ، اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اور نہ ہی اس نے جاننے کی کوشش کی۔ کھانا ختم ہوتے ہی کپڑے تبدیل کر کے وہ خود بھی ان ہنگاموں میں شامل ہو گئی۔

''منگنی مبارک ہو نادیہ بیگم!'' بڑی دیر بعد اور بڑی مشکل سے منصور نے اسے گھیرا۔ وہ صرف مسکرا دی۔

''کام کریں..... بیکار باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔''

''بہتر ہے۔'' اور جلدی سے مردان خانے میں چلا گیا۔ نادیہ نے محسوس کیا کہ وہ زیادہ ہی خاموش اور سنجیدہ ہے۔ نازلی جیسی عزیز بہن کی رخصتی کی ساری ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لاد کر ضرورت سے زیادہ ہی بردبار ہو گیا تھا۔ مایوں کے دن صبح سے شام تک باہر کے کاموں میں مصروف رہا۔ شام کو اندر آتے ہی نازلی کے کمرے میں گھس آیا۔ وہیں نادیہ سے ملاقات ہو گئی۔ انگوٹھی دکھا کر اتنا برا منہ بنایا جیسے کڑوی دوا نگل لی ہو۔ فوزیہ نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس سے رہا نہ گیا بولی۔

''یہ آپ آپی کو دیکھ کر اتنا برا سا منہ کیوں بنا رہے ہیں۔'' منصور نے کن انکھیوں سے نادیہ کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے آرام سے ایک طرف بیٹھی شام کو تھال پر ڈالنے کے لیے کپڑے پر گوٹہ لگانے میں مصروف تھی۔

''کوئی خاص وجہ نہیں۔ بس تمہاری آپی پر نظر پڑتے ہی منہ کا مزہ کڑوا سا ہو جاتا ہے۔ یہ ڈاکٹر جو ہوئیں۔''

نادیہ نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر سوئی دھاگا اور کپڑا ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

''میں نے تو کبھی التجا نہیں کی کہ آپ میری طرف دیکھیں۔ ویسے گستاخی معاف یہ مردوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ لڑکیوں اور عورتوں کو ضرور تاکتے ہیں۔ خود گھر میں بیوی

بچے ہی کیوں نہ موجود ہوں۔''

منصور نے زوردار قہقہہ لگایا نازلی اور فوزیہ بھی ہنس پڑیں۔

''یہ محض الزام ہے۔ آپ ہی بتائیں گھر میں..... اس کمرے میں، بروقت آپ کی موجودگی نظر انداز تو نہیں کی جا سکتی۔''

''دو چار روز اور صبر کر لیں نازلی رخصت ہو جائے۔'' نادیہ نے برجستہ جواب دیا۔

''اجی..... دو چار روز کیا اب تو ساری زندگی ہی صبر و شکر کرنا ہے۔''

''منصور بھائی.....'' نازلی نے تنبیہ کی۔

نادیہ کا دل چاہا اس لمحہ کوئی بہت ہی جلا بھنا جملہ منصور کی کھوپڑی پر دے مارے لیکن کچھ سوچ کر خاموشی سے اٹھی اور اپنا سامان اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ فوزیہ نے غصہ سے منصور کو گھورا۔ اس نے جھٹ آنکھیں بند کر لیں۔ فوزیہ بھی بہن کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر آ گئی۔

نازلی کی شادی اور منصور کی منگنی دونوں ہی تقریبات بڑی خوبصورتی سے اور بخیر وخوبی اختتام کو پہنچ چکی تھیں۔ نادیہ ولیمہ میں شرکت کیے بنا ہی کچھ کی ناراضگی اور کچھ کی مایوسیاں سمیٹ کر ہوسٹل چلی گئی تھی۔ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کی روانگی بھی ولیمہ کے دوسرے ہی دن سے شروع ہو گئی تھی۔ نئے دلہا دلہن ہنی مون کے لیے ملک سے باہر روانہ ہو چکے تھے اور اب اس سارے ہنگامے اور افراتفری کے بعد عابدہ بیگم اور فوزیہ گھر کو سمیٹنے میں مصروف تھیں جو اچھا خاصا مشکل کام تھا۔

گھر میں اتنی دھا چوکڑی کے بعد عجیب سا سناٹا اور اداسی چھا گئی تھی، جو کم از کم فوزیہ کے لیے تو ناقابل برداشت تھا۔ آخر کار ہفتے کے اندر اندر سوائے نجمہ بیگم اور اختر حسین کے تمام ہی مہمان رخصت ہو چکے تھے۔

جانے سے ایک دن پہلے رات کھانے کے بعد جب سب لوگ لاؤنج میں بیٹھے کافی کا انتظار کر رہے تھے، نجمہ بیگم بڑے دھیرے پن سے بولیں۔

''آپا بیگم! ماشاء اللہ آپ کی دونوں ہی تقریبیں نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہو گئیں آپ کو اور بھائی صاحب کو بہت بہت مبارک ہو۔''

عابدہ بیگم خوش ہو کر مسکرا دیں۔ ''ہاں نجمہ! اللہ کا بڑا کرم ہے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ ہمارے بچے ہمیشہ خوش رہیں۔''

نجمہ بیگم کے چہرے سے پھر کچھ ناگواری کا سا احساس ہوا۔ بڑے طنزیہ انداز میں مسکرائیں۔

''لیکن آپا بیگم زندگی میں پہلی بار آپ نے مجھے بڑا دکھ پہنچایا ہے۔ ایسی چوٹ دی

ہے کہ اس کی کسک شاید زندگی بھر نہ جا سکے۔''

عابدہ بیگم نے حیران ہو کر بہن کی طرف دیکھا۔ ''میں سمجھی نہیں نجمہ! میری ذات سے تمہیں دکھ پہنچا ہے۔ یہ جان کر اس وقت مجھے خود دکھ ہوا ہے۔ تم بلا تکلف بتا دو شاید ازالہ کر سکوں۔''

عابدہ بیگم تو اس لمحے کی پہلے سے ہی منتظر تھیں لیکن تھوڑی سی خوش فہمی بھی تھی کہ شاید چھوٹی بہن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔

نجمہ بیگم ہنس پڑیں۔ ''آپا بیگم آپ تو اماں حضور کی جگہ تھیں اور مائیں بیٹیوں کے حق نہیں مارا کرتیں۔''

عابدہ بیگم پوری طرح حقیقت حال سے آگاہ ہو چکی تھی۔ رشید احمد بھی سر جھکائے گفتگو سننے میں مشغول تھے۔

''آپ تو بخوبی جانتی تھیں کہ وجاہت بھیا نے نادیہ کے لیے ریاض کا رشتہ منظور کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلے پر بڑے خوش اور مطمئن تھے۔ اس کے باوجود آپ نے مجھے لاعلمی میں رکھ کر ساری باتیں نہ صرف طے کر لیں بلکہ منگنی بھی کر لی۔ میں آپ کی چھوٹی بہن تھی کم از کم اطلاعاً ہی ذکر تو کر دیتیں کہ وجاہت کے فیصلے کے خلاف میں نادیہ کا رشتہ منصور سے طے کر رہی ہوں۔''

''نجمہ!'' عابدہ بیگم کے لہجے میں بلا کی متانت تھی۔ ''میں مانتی ہوں کہ اس رشتے کے سلسلے میں تم سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ ہم نے اس معاملے کو اتنی اہمیت ہی نہیں دی۔ غالباً تمہیں یاد نہیں رہا کہ میرے سامنے ہی تم نے وجاہت سے بات کی تھی اور اس سے بہت پہلے ہی میں وجاہت سے منصور کے لیے نادیہ کو مانگ چکی تھی۔ اس وقت نادیہ کی عمر مشکل سے ایک سال کی بھی نہیں ہو گی۔ ہاں البتہ اسے وجاہت کی غلطی کہو، مروت یا بہنوں سے محبت کہ اس نے فوری طور پر انکار کر کے تمہارا دل توڑنا نہیں چاہا اور غالباً اس کے بعد اسے اللہ نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ تم کو اصل بات سے آگاہ کر سکتا۔''

نجمہ بیگم ہنس پڑیں۔ ''آپا بیگم! یہ محض ایک قیاس آرائی ہے۔ وہ بڑے جرأت مند انسان بھی تھے۔ اپنی مرضی اور خوشی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ ممکن ہے جب آپ نے یہ گزارش کی ہو انہوں نے سن لی ہو قبول نہ کی ہو۔ مجھے یاد ہے جب ریاض

کے لیے میں نے بات کی تھی تو ان کے چہرے پر بڑی مسرت انگیز مسکراہٹ پھیل گئی تھی اور کہا تھا۔ ''وقت آنے پر سب ہو جائے گا ابھی ان بچوں کو بڑا تو ہو لینے دو۔'' انہوں نے بڑے پیار سے میری پیٹھ تھپتھپا کر تسلی دی تھی۔''

''یہیں پر تو وجاہت سے غلطی ہوئی اور شاید مجھ سے بھی۔ ہمیں چاہیے تھا کہ اسی وقت تمہیں اصل حقیقت سے آگاہ کر دیتے تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔'' ویسے نجمہ! عابدہ بیگم کا لہجہ تھوڑا تلخ ہو گیا تھا۔ ''کیا تم وہ زمانہ بھول گئیں جب تم اور خاندان والوں کی اکثریت نے متفقہ طور پر نادیہ کو منحوس قرار دے دیا تھا۔ اپنے بچوں کو اس کے قرب سے بچایا جاتا تھا صرف اس وجہ سے نا کہ اس کی پیدائش کے عین اسی لمحے اماں حضور کا انتقال ہوا تھا۔''

''اس ضعیف الاعتقادی میں وجاہت بھیا بھی شامل تھے۔''

نجمہ نے وقفہ کے بغیر جواب دیا۔ ''انہوں نے بھی تو کئی ماہ تک بیٹی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ بھی اشارۃً کہہ دیا کرتے کہ کاش میں ایسی اولاد سے محروم ہی رہتا جس کے قدموں کی برکت نے میری ماں کو مجھ سے چھین لیا۔''

عابدہ بیگم کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن ضبط کی حدود کو توڑنے کے بجائے مسکرا دیں۔

''چلیے...... یہ مانا آپ پہلے ہی بات کر چکی تھیں تو میرے بات ڈالنے پر انہوں نے ذکر تک نہیں کیا۔''

''مجھے معلوم ہے آپا بیگم! انہیں ریاض (معاف کیجیے گا) منصور کے مقابلے میں نادیہ کے لیے زیادہ موزوں لگا ہو گا۔''

''تمہیں تھوڑی غلط فہمی ہے۔ ریاض اور منصور دونوں ہی وجاہت کو عزیز تھے۔ ہاں اگر میرے کہنے سے پہلے ہی تم ریاض کے لیے بات کر لیتیں تو وہ یقیناً نا نہیں کرتا لیکن وہ تھوڑا رکیں اسے یہ بات بھی بخوبی معلوم تھی کہ اوروں کی طرح تم بھی نادیہ کے وجود کو منحوس سمجھتی ہو۔ چالیسویں تک تم وجاہت کے یہاں رہیں۔ اس بچی کو گود میں لینا تو درکنار ثریا دلہن کے کمرے میں جا کر ایک نظر بچی کو دیکھا تک نہیں بلکہ......''

نجمہ بیگم نے بات کاٹ دی۔ ''پچھلی باتیں دہرانے سے کیا فائدہ آپا بیگم! اس وقت جو کچھ بھی میں نے کیا اور کہا، وہ عین انسانی فطرت کے مطابق تھا۔ بہر حال آپ نے اور رشید بھائی نے جس مصلحت پسندی اور دانشمندی سے یہ رشتہ جوڑا اور بہن بہنوئی کی رائے

لیے بغیر منگنی بھی کر ڈالی اس کے لیے قابل ستائش ہیں لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ شادی نہیں ہونے دوں گی۔ اس لیے کہ ریاض اپنی ناکامی اور بے عزتی کبھی برداشت نہیں کرتا۔''

عابدہ بیگم خاموش تھیں لیکن رشید احمد کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔

''نجمہ بہن! اگر اجازت ہو تو آپ دونوں بہنوں کی گفتگو میں، میں بھی کچھ حصہ لے لوں کہ منصور میری بھی اولاد ہے۔''

نجمہ بیگم زور سے ہنس پڑیں۔ ''اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے رشید بھائی! اولاد کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں باپ کو پورا حق ہوتا ہے۔''

''شکریہ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ جب نادیہ سال کی بھی نہیں تھی ہم نے اس کو ثریا دلہن اور وجاہت سے منصور کے لیے مانگ لیا تھا۔ وہ دونوں بے حد خوش ہوئے تھے بلکہ وجاہت نے اسی وقت مٹھائی منگوا کر منہ بھی میٹھا کروایا تھا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ہمارے درمیان یہ طے پایا تھا کہ فی الحال اس بات کو اپنے ہی تک رکھا جائے تو بہتر ہے۔ اگر ہم سے پہلے آپ لوگ یہ سوال ڈال دیتے تو خدا کی قسم ہماری مجال نہیں تھی کہ وجاہت کے فیصلے کو رد کر کے آپ یا ریاض کو دکھ پہنچاتے۔ لیکن آپ لوگوں نے تو غالباً دو تین سال بعد وجاہت سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ اب یہ وجاہت کی غلطی تھی یا بہن کی دل شکنی نہ کرنے کی عادت کہ فوری انکار نہ کر سکے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہو جب بحسن و خوبی آپ لوگوں کو اصل معاملہ سے آگاہ کر دیتے تاکہ بہن بھائی کے رشتہ میں کوئی دراڑ نہ پڑے۔ لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں وقت اور موت دونوں نے ہی مہلت نہ دی اور ان کی ذرا سی کمزوری نے آج ہمیں اور آپ کو اتنے بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے اگر ثریا دلہن ہی موجود ہوتیں تب بھی یہ غلط فہمیاں اور شکوے پیدا نہ ہوتے۔''

''ویسے بھائی صاحب!'' بڑی دیر بعد اختر حسین نے گفتگو میں مداخلت کی۔ ''آپ لوگوں نے جلد بازی اور رازداری سے کام لے کر معاف کیجیے گا غلطی تو کی ہے۔ اگر ہم سے تذکرہ ہی کر دیتے تو آج شکایت کی نوبت ہی نہ آتی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انہی دنوں میں ہم لوگ آپ لوگوں کو یہ بتانے آنے والے تھے کہ دو ماہ بعد ہمارا ارادہ نادیہ اور ریاض کا نکاح کرنے کا ہے کہ آپ کا دعوت نامہ مل گیا۔ ہم حیران رہ گئے لیکن یہ مناسب نہیں سمجھا

کہ آپ کی پہلی تقریب میں کوئی بدمزگی پیدا کی جائے۔ اس لیے بھی کہ منگنی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کسی وقت بھی ختم کی جاسکتی ہے۔

عابدہ بیگم اور رشید احمد کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کس آسانی سے انہوں نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو انہیں اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا ان کے بیچ گمبھیر خاموشی تھی آخر توقف کے بعد عابدہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

”خیر لیکن میں نے جو کچھ بھی کیا وہ وجاہت کی مرضی اور اس کی عین خوشی کے مطابق کیا ویسے شریف خاندانوں میں منگنی کا ٹوٹنا بھی باعثِ شرم ہوتا ہے تم سے یہ بھی گزارش ہے نجمہ! کہ جو بھی قدم اٹھانا سوچ سمجھ کر کہ وجاہت کی روح کو تکلیف نہ ہو۔ اس منگنی کا اعلان نادیہ کی مرضی اور خوشی سے ہوا ہے۔ وہ راضی نہ ہوتی تو خدا کی قسم میں کبھی زبردستی نہ کرتی۔ تم دونوں سے بھی یہ کہنا ہے کہ نادیہ کی مرضی معلوم کرلو۔ اس کے ساتھ زیادتی نہ کرنا۔“

نجمہ بیگم مسکرا دیں۔ ”آپا بیگم! میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں۔ بہت کچھ بندے کی نفسیات جانتی ہوں۔ مجھے یہ تو یقین ہے کہ اسے ریاض پسند ہے۔ بے وقوف لڑکی نے اگر آپ سے اپنے دل کی بات بتا دی ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی۔ ویسے ایک روز ہم دونوں جا کر اس کی مرضی ضرور معلوم کرلیں گے۔“

عابدہ بیگم کے پاس اب کہنے کو کچھ نہ رہا تھا۔ رشید احمد بھی خاموش تھے۔ نجمہ بیگم کھڑی ہوگئیں۔

”مجھے اجازت ہے آپا بیگم پیکنگ کرنی ہے کل صبح ہی روانگی ہے۔“

”ہاں، آں شب بخیر رات کافی ہو چکی ہے۔“ وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئیں۔

☆

”نادیہ وجاہت علی صاحبہ! میں آپ سے چند لمحوں کے لیے ملاقات کا خواہش مند ہوں۔ زمیندار برکت علی۔“

نادیہ، اپنا آخری پریکٹیکل ختم کر کے تھکے تھکے قدموں سے کمرے کی طرف آ رہی تھی کہ چوکیدار نے یہ پرچہ تھما دیا اس نے غور سے کئی بار اس مختصر سی تحریر کو پڑھا زمیندار برکت علی؟ بھلا یہ کون چیز ہوسکتی ہے؟ اور مجھ سے ملاقات کی خواہش مضحکہ خیز۔“

”بابا۔“ اس نے چوکیدار کو مخاطب کیا۔ ”کون صاحب ہیں۔ میں تو کسی زمیندار و

میندار کو نہیں جانتی۔“

”میں نے تو خود پہلی بار ان صاحب کو دیکھا ہے ویسے ملنے میں کیا حرج ہے بیٹا! شاید کوئی ضروری کام ہو۔“

”اچھا...... چلو تم کہتے ہو تو مل لیتی ہوں۔“

”آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی نادیہ نے سوال کر ڈالا۔

زمیندار برکت علی احتراماً کھڑے ہوگئے۔ ”آپ نواب وجاہت علی کی صاحبزادی......“

”جی ہاں......“ اس نے درمیان سے بات کاٹ دی۔

”آپ تشریف رکھیے میں ہی نواب وجاہت علی کی بیٹی ہوں۔ آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے حالانکہ میں تو؟“

انہوں نے بھی بات پوری نہ ہونے دی۔ ”آپ بھلا مجھے کیا جانتی ہوں گی۔ جس وقت آپ کے ابا حضور کی ریاست کو زوال آیا اس دور میں میرے والد اپنے گاؤں کے زمیندار تھے۔ اپنے ابا کے ساتھ کئی بار میں بھی نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بڑے شریف النسل انسان تھے۔ محبت کرنے والے مجھ سے تو بہت پیار کرتے تھے۔“

نادیہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ”جی ہاں وہ بڑے مشفق اور سچے انسان تھے۔ جب یہاں کے لوگوں میں سے سچائی اور بے غرضی کا عنصر ختم ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ اچھا ہی کیا۔“

”آپ درست فرماتی ہیں زر پرستی اور خود غرضی ان دونوں نے اچھے بھلے انسان کو شیطان بنا دیا۔“ وہ کچھ دیر کو رک کے سوچتے رہے پھر بڑی رازداری سے بولے۔ ”میں صرف یہ بتانے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے والد صاحب کو کسی ایرے غیرے نے نہیں بلکہ ان کے خاص ملازم کریم داد نے......“

نادیہ نے آنکھیں پھاڑ کر ان کی طرف دیکھا پھر جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں بولی۔

”کریم داد؟ کیا آپ کا مطلب ہے کہ بابا جان کو کریم داد نے مارا جو ان کا خاص ملازم تھا جس سے وہ اپنی اولاد سے زیادہ محبت کرتے تھے یہ...... یہ نہیں ہوسکتا وہ تو نہایت شریف، نیک اور بابا جان کے لیے خود اپنی جان دے دینے والا بندہ تھا۔ آپ سے کسی نے

غلط کہا ہے۔"

"کاش یہ غلط ہوتا نادیہ بی بی! اس طرح اس کا بھرم بھی رہ جاتا اور آپ کا مان بھی نہ ٹوٹتا لیکن بعض گناہوں کا بوجھ اتنا بھاری ہوتا ہے کہ گناہ گار بلبلا کر خود ہی بول پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے میرے سامنے مجھ سے بہ ہوش و حواس اپنے اس گھناؤنے جرم کا اعتراف کیا ہے۔"

نادیہ نے شکست خوردہ ہو کر سر جھکا لیا ذہن کے پردوں پر کوئی تحریر نہیں تھی سوچنے سمجھنے کے لیے کچھ بچا بھی نہیں تھا۔

"آپ کو اس انکشاف سے یقیناً دکھ ہوا ہے۔" زمیندار برکت علی اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔

"جی ہاں اور شکایت بھی کہ آپ یہ سب بتانے کیوں آ گئے۔ کم از کم کسی انسان پر تو میرا اعتماد قائم رہتا۔ مجھے تو یہ اطلاع ملی تھی کہ بابا جان کو اس نے پناہ دی تھی۔ حفاظت کی تھی۔ میں تو آج تک اس انتظار میں تھی کہ ایک نہ ایک دن کریم داد بابا جان کو لے کر آئے گا اور اپنے مخصوص انداز میں کہے۔ گا "لو بیٹا لے آیا تمہارے ابا حضور کو۔"

نادیہ کا سر جھکا ہوا تھا آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ مگر آگ کی طرح تپ رہی تھیں برسوں سے جس آس کو زخم نہیں بننے دیا تھا آج رستا ہوا ناسور بن گئی تھی۔

"مجھے...... بہت افسوس ہے۔" وہ رک رک کر بولے۔ "کہ میری وجہ سے آپ کے پرانے زخم تازہ ہو گئے، ایک بے یقین سی امید بھی ختم ہو گئی۔ لیکن یقین مانئے میرا مقصد آپ کو دکھ پہنچانا نہیں تھا۔"

"کریم داد! آپ کو کہاں ملا؟ اب کہاں ہے؟ میں مل سکتی ہوں؟" نادیہ کے لہجے میں ٹھہراؤ اور پختگی تھی۔

"کریم داد اب اس دنیا میں نہیں ہے۔" انہوں نے بڑے اطمینان اور رسانیت سے انکشاف کیا۔ "احساس جرم کی آگ اندر ہی اندر اسے سلگاتی رہی تھی۔ وہ ز الوں سے بیمار تھا۔ علاج بے اثر ثابت ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ اسے بیماری کوئی نہیں تھی محض ایک ذہنی دباؤ تھا۔ اس روز جب میں اس کی عیادت کو گیا تو میرے پاؤں پر سر رکھ کر رو پڑا۔ پھر اپنے گناہ کا اعتراف کرنے کے بعد جیسے اسے سکون مل گیا ہو کہ اتنی آسانی اور اچانک پن سے

ختم ہو گیا کہ کئی دنوں تک مجھے یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ واقعی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔"

"یہ بھی اچھا ہی ہوا۔" نادیہ کے لہجے میں بڑا سکون تھا۔ "ناقابل اعتماد اور مطلب پرست انسانوں کی جتنی بھی کمی ہو جائے اس دنیا کی بقا کے لیے بہتر ہے۔"

"آپ۔" انہوں نے فوری سوال کیا۔ "یہ نہیں پوچھیں گی کہ اتنے اچھے انسان نے اتنا گھناؤنا فعل کیوں کیا؟ وہ بھی ایسے مالک کے ساتھ جو اسے اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔"

"بابا جان اپنے ملازم سے محبت کرتے تھے ان کی معمولی سے معمولی ضرورت بھی ان کے لیے نہایت اہم ہوتی تھی لیکن زمیندار صاحب میں یہ ہرگز نہیں پوچھوں گی کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ شاید اس کی کوئی مجبوری ہو گی اور کریم داد سے ہم دونوں بہنیں محبت بھی کرتی تھیں اور عزت بھی کہ انہوں نے ہمیں گودوں میں کھلایا تھا۔ حقیقت سے آگاہ ہو کر میں اپنے اندر نفرت کا بیج بونا نہیں چاہتی۔ انسان کو بھٹکتے دیر تو نہیں لگتی۔ یہ بات آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہوں گے۔ چلیں چھوڑ دیں یہ بتایئے کچھ اور کہنا ہے آپ کو؟"

زمیندار برکت علی کی نظریں اس سادہ معصوم سی لڑکی پر جمی ہوئی تھیں جو بظاہر بڑی پُرسکون نظر آ رہی تھی لیکن اندر مچلتے ہوئے طوفان کو روکنا کچھ اسی کا حوصلہ تھا۔ وہ سوچ رہے تھے۔ انسان کو فرشتہ بننے کے لیے طویل راستے طے نہیں کرنے پڑتے بس ایک چھوٹا سا لفظ درگزر اسے کتنی آسانی سے ان کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

"جی...... آپ نے کچھ پوچھا؟" یہ خواب سے حقیقت کی طرف پلٹ آئے تھے۔ نادیہ کے ہونٹوں پر پژمردہ موہوم سی مسکراہٹ تھی زمیندار برکت علی کھڑے ہو گئے۔

"معاف کرنا نادیہ بی بی! میں نے آپ کا بڑا وقت لے لیا۔ بلکہ ماضی کا ذکر کر کے آپ کو دکھ بھی پہنچایا لیکن یہ تکلیف دہ ڈیوٹی مجھے انجام دینا ہی تھی کیونکہ کریم داد نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے التجا کی تھی کہ آپ دونوں بہنوں سے مل کر ان سے کہیے گا کہ میں آپ دونوں کا گناہ گار ہوں، ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں۔"

نادیہ کے پاس اس کا نہ کوئی جواب تھا، نہ معاف کرنے کا حوصلہ۔

☆

پے در پے رونما ہونے والے ناقابل یقین قسم کے واقعات انسان کے ذہن سے

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی چھین لیتے ہیں۔ اس کا دنیا پر، لوگوں پر اور اپنے آپ پر سے بھی اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ زمیندار برکت علی نے جس اندوہناک حقیقت کا انکشاف دو تین روز پہلے کیا تھا، اس نے نادیہ کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ابھی وہ اس ریزہ ریزہ وجود کو پوری طرح سمیٹ بھی نہ پائی تھی کہ چھوٹی پھوپھو کا فون آ گیا۔

''مجھے ایک ضروری بات کے سلسلے میں تم سے ملنا ہے شام کو کسی وقت ہوسٹل آؤں گی۔''

''اللہ خیر کرے۔'' نادیہ کا دل دھڑکا۔ یہ چھوٹی پھوپھو اس سے پہلے تو کبھی ملنے نہیں آئیں۔ فون پر اکتفا کر لیا کرتی ہیں۔ یہ کیسی محبت امڈ پڑی کہ شام ہی کو آ رہی ہیں۔

تمام دن کلاسز اٹینڈ کرتے ہوئے پریکٹیکل کرتے ہوئے اس کے ذہن پر یہی خیال چمٹا رہا۔

آ رہی ہیں تو کیوں آ رہی ہیں؟ مجھ سے بھلا ایسی کون سی ضروری بات کرنی ہے؟ آخر اپنی اس بے بنیاد پریشانی کا ذکر مریم سے بھی کر بیٹھی اسے ہنسی آ گئی۔

''تم تو بالکل ہی پاگل ہو۔ ارے تمہاری پھوپھی ہیں منگنی پر ملی تھیں دل نہ بھرا ہو گا سوچا دوبارہ مل آؤں حرج ہی کیا ہے۔''

''ہاں ٹھیک بھی ہے مجھ سے محبت بھی بہت کرتی ہیں۔ اچھا خیر دیکھا جائے گا۔ ہاں تمہیں یہ بتانا تھا کہ ڈاکٹر فرمان کے ساتھ ضروری کام سے باہر جا رہی ہوں ممکن ہے دیر ہو جائے اس دوران اگر چھوٹی پھوپھو آ جائیں تو استقبال کر لینا۔''

''او کے باس! اور کوئی حکم بائی؟ داوے ڈاکٹر فرمان کے ساتھ کون سا ضروری کام نکل آیا معلوم کر سکتی ہوں؟''

''آپ احمق ہیں انہیں اپنی بہن کو کچھ چیزیں بھیجنی ہیں اس لیے مجھے شاپنگ کے لیے لے جا رہے ہیں۔ دوسروں کے کام آنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے نا۔ ہاں ایک بات شاید آپ یہ بھول گئی ہیں کہ...... کہ میں انگیجڈ ہوں۔'' اور ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

واپسی پر واقعی دیر ہو گئی تھی۔ نجمہ بیگم انتظار میں بیٹھی تھیں۔ ریاض ان کے ساتھ تھا اسے دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔ جلدی سے اٹھ کر گلے لگایا پیار کیے پھر قریب ہی بٹھاتے ہوئے بولیں۔

''بڑی دیر کی بیٹی! کب سے انتظار میں بیٹھی ہوں۔''

''سوری پھوپھو بازار میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔'' ریاض پر نظر پڑتے ہی مسکرا

دی۔ ''اوہو آج تو ریاض بھائی بھی آئے ہیں۔ بڑا خوش قسمت دن ہے۔ ہاں پھوپھو بتائیں کون سا ضروری کام تھا کہ آپ نے زحمت کی؟''

نجمہ بیگم چند سیکنڈ سوچتی رہیں جیسے مناسب الفاظ سمیٹ رہی ہوں پھر بڑے اعتماد سے بولیں۔

''تم سے اپنا حق مانگنے آئی ہوں۔''

نادیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''مجھ سے؟ یہ حق تو مجھے آپ سے مانگنا چاہیے تھا۔ آپ میری پھوپھی ہیں۔ یہیں رہتی ہیں اور گاہے گاہے ہی بھتیجی کو پوچھتی ہیں۔ میں بھلا آپ کو کیا دے سکتی ہوں۔''

''نادیہ بیٹی! دراصل آپا بیگم نے چپ چپاتے جو فیصلہ اپنے بیٹے کے حق میں کیا ہے وہ ہمارے ساتھ سراسر ناانصافی ہے کیا تم نے دل سے قبول کر لیا؟''

نادیہ نے آنکھیں پھاڑ دیں۔ ''میں سمجھی نہیں چھوٹی پھوپھو آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

''تم بہت بھولی ہو بیٹا۔ تمہیں تو یہ معلوم بھی نہیں کہ وجاہت بھیا نے ریاض کے لیے حامی بھر لی تھی۔ وہ اس رشتے پر بڑے خوش تھے لیکن تمہاری پھوپھو حضور نے ہمیں اور ہمارے بیٹے کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا اور ہمیں بتائے بغیر ہی دھوم دھام سے تمہاری منگنی منصور سے کر دی۔ انہیں اپنے مرے ہوئے بھائی کا بھی خیال نہ آیا۔'' وہ کچھ سوچنے کے لیے رکیں۔ اس لیے نادیہ کی اپنی سانسیں رک گئی تھیں۔ ایک نیا انکشاف، نیا شگوفہ، نیا امتحان ''اللہ میاں مجھے ان امتحانوں کی کتنی پل صراطیں طے کرنی ہوں گی؟'' اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔

''اب میں تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ منگنی تو انہوں نے اپنی مرضی سے کر لی لیکن اب میں وجاہت بھیا کی روح کو مزید تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ جو فیصلہ اپنی زندگی میں انہوں نے کیا تھا اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہمارا کام ہے۔ لہٰذا ہم نے سوچا ہے جتنی جلدی ہو سکے تم دونوں کا نکاح کر دیا جائے۔ مجھے یقین ہے باپ کی خوشی کی خاطر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔''

نادیہ کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ بات کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رہا تھا۔ اچانک غیر متوقع طور پر اتنا شدید حملہ ہو تو ہاتھ پاؤں کے ساتھ ذہن بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔

"کیا سوچنے لگیں نادیہ؟ اتنی فکر مند نہ ہو۔ یہ تو تمہارے بابا جان کی خواہش تھی۔ وہ تو اس رشتے پر بے حد خوش تھے۔"

"چھوٹی پھوپھو!" چہرے کے ساتھ ساتھ لہجہ میں بھی بلا کی سنجیدگی تھی۔ "فی الحال اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی پہلے مجھے پھوپھی حضور سے بات کرنا ہوگی۔"

"لیکن یہ فیصلہ تو تم کو کرنا ہے اور ابھی کرنا ہے۔" ریاض نے قریب آن کر بتایا۔

نادیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"ریاض بھائی! یہ میری زندگی کا فیصلہ ہے اور مجھے ہی کرنا ہے۔ اس لیے کہ نہ میرا باپ زندہ ہے اور نہ ہی میری ماں میرے پاس ہے۔ بابا جان کی کیا خواہش تھی؟ انہوں نے اپنے دونوں بھانجوں میں سے کس کے لیے مجھے منتخب کیا تھا؟ اس کا مجھے علم ہے لیکن آپ لوگ جو بات ابھی اس وقت مجھ سے کہلوانا چاہتے ہیں۔ ناممکن ہے۔"

"چلو، کوئی بات نہیں جیسی تمہاری مرضی۔" نجمہ بیگم اس کے بگڑے تیور بھانپ کر جلدی سے بولیں۔

"دو تین روز بعد میں خود آ کر تمہاری مرضی معلوم کرلوں گی ویسے۔" وہ بڑے فیصلے کن انداز میں بولیں۔ "فیصلہ تو تمہیں ریاض ہی کے حق میں دینا ہوگا کیونکہ یہ وجاہت بھیا نے....."

نادیہ نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی۔ "چھوٹی پھوپھو! میں کورٹ کی گیند تو نہیں ہوں جس نے چاہا اچک لیا۔ میں بچہ بھی نہیں ہوں کہ دوسروں کی خوشیوں اور خواہشات پر اپنا آپ قربان کر دوں۔ آپ سننا چاہتی ہیں تو سن لیں۔ بابا جان نے میرے لیے منصور کو انتخاب کیا تھا۔ آخری بار جب وہ مجھے ملنے ہوسٹل آئے تھے تب یہ بات انہوں نے بتائی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ یہ نوعمری کا فیصلہ ہے۔ بڑے ہونے پر تمہیں خود اپنا فیصلہ کرنا ہوگا۔ ہم اپنی پسند بنا کر تم پر جبر نہیں کرنا چاہتے۔" اس کی جھنجلاہٹ بڑھ گئی تھی چہرے سے غصہ ظاہر تھا۔

"مجھے اجازت دیں چھوٹی پھوپھو! کافی دیر ہوگئی ہے۔ ڈائننگ ہال میں سب لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ہاں بیٹا ہم بھی چلتے ہیں۔ دو تین روز بعد آؤں گی دیکھو مایوس نہ کرنا۔" نجمہ بیگم نے

گلے لگا کر پیشانی چوم لی۔

"میں اپنے حق سے کبھی دستبردار نہیں ہوتا یہ بھی یاد رکھنا۔" ریاض نے قریب ہو کر رسانیت سے سمجھایا۔ نادیہ جواب دیئے بغیر دروازے ہی پر خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل آئی۔

کھانا کھائے بغیر ہی وہ سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ مریم اس کا انتظار کر کے ڈھونڈتی ڈھونڈتی جب کمرے میں آئی تو دیکھا نادیہ کرسی پر آنکھیں بند کیے خاموش لیٹی تھی۔ چہرے پر شدید ناگواری کے اثرات تھے۔ قدموں کی آہٹ پر اس نے آنکھیں کھولیں سامنے ہی مریم کو کھڑا دیکھ کر جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"کہاں مر کھپ گئی تھیں۔ کھانے کا وقت بھی ختم ہو گیا اب بھوکی مرنا۔" مریم نے ڈانٹ پلائی۔ وہ صرف مسکرا دی بولی کچھ نہیں۔ ایسی تو وہ کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ مریم گھبرا گئی۔

"نادیہ!" اس نے قریب آ کر پیار سے پوچھا۔ "کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تمہارا چہرہ کتنا زرد ہو رہا ہے۔"

"تمہارا وہم ہے۔" آخر اسے بولنا پڑا۔ بلب کی روشنی میں زرد لگ رہا ہوگا یا پھر آج کھانے میں زردہ تو نہیں تھا۔"

"بکواس مت کرو۔ یہ بتاؤ تمہاری چھوٹی پھوپھو آئی تھیں کہیں ان سے جھگڑا تو نہیں کر لیا۔ تمہارا کیا بھروسہ۔" جواب میں نادیہ نے آنکھیں بند کرلیں مریم نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"یہ کیا طریقہ ہے۔ میں کچھ پوچھ رہی ہوں اور تم ہو کہ منہ کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی بند کرلیں۔"

"مریم!" وہ بہت ہی آہستہ بولی۔ "مجھے خاموش ہی رہنے دو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"اچھا..... تو اٹھو مسہری پر آرام سے لیٹ جاؤ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

نادیہ بڑی سعادت مندی سے اٹھی کپڑے تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر لیٹ گئی۔ پانچ منٹ بعد مریم چائے اور کچھ بسکٹ لے کر اس کے پاس آئی تو وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

☆

عابدہ بیگم کئی دنوں سے سخت پریشان تھیں۔ اس فکر و پریشانی میں ان کا بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا تھا کھانا برائے نام کھا رہی تھیں۔ رشید احمد کو ان کی پریشانی کا بخوبی علم تھا لیکن وہ

جانتے تھے کہ سمجھانا بجھانا لاحاصل ہے۔ فوزیہ نے کئی بار اس بارے میں استفسار بھی کیا لیکن ہر بار وہ ہنس کر ٹال گئیں۔

"پھوپھی حضور! نازلی کو فون کر دوں وہ آ جائے تو شاید آپ کی طبیعت بحال ہو۔" اس پریشانی کا ایک ہی حل فوزیہ کی سمجھ میں آیا تھا۔ یقیناً نازلی کے جانے کا ان پر اتنا اثر ہے لیکن عابدہ بیگم اس کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

"نہیں بیٹا میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ بس اتنے دنوں کی تھکاوٹ ہے۔ اس لیے طبیعت نڈھال ہو گئی ہے۔ آرام کروں گی تو خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"میں نہیں مانتی پھوپھی حضور! صرف جسمانی تھکاوٹ انسان کو اتنا مضمحل نہیں کرتی۔ یہ منصور بھائی بھی بس عجیب آدمی ہیں دو دن کا کہہ کر گئے اور چار دن گزار دیئے آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ وہ آ جائیں تو ان کی موجودگی سے بھی آپ کی طبیعت بہل جائے گی۔ تنہائی کا احساس جاتا رہے گا۔"

عابدہ بیگم نے اسے اپنے قریب ہی بٹھالیا۔ "تم اتنی فکر مند کیوں ہو رہی ہو۔ آ جائے گا جلدی کیا ہے۔ آفس کے کام سے گیا ہے۔ ہاں نادیہ کا کوئی فون آیا جب سے گئی ہے اس کی کوئی خبر ہی نہیں ملی۔" "آپی بھی جا کر بھول گئیں۔" فوزیہ خود بھی بڑی پریشان تھی۔ "ان سے یہ بھی نہ ہوا کہ ہفتے میں ایک چکر ہی لگا لیتیں پتا تو ہے کہ ہم دونوں اکیلے ہیں۔ کتنی تنہائی ہے۔"

"ایسا کرو۔" عابدہ بیگم نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر سمجھایا۔ "کل یا پھر پرسوں تم ڈرائیور کے ساتھ اس کے پاس دن بھر کے لیے چلی جاؤ وہ بھی خوش ہو جائے گی اور تمہاری بھی طبیعت بہل جائے گی۔"

"نہیں پھوپھی حضور! آپ کو اس حالت میں تنہا چھوڑ کر تو میں کبھی نہیں جاؤں گی۔ ہاں آپی سے بات کرتی ہوں پرسوں ہفتہ ہے وہ آ جائیں تب تک تو منصور بھائی بھی آ جائیں گے۔ نازلی کو بھی بلوالیں گے۔ مزہ آ جائے گا خوب رونق رہے گی۔ عابدہ بیگم مسکرا دیں۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" وہ دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں کچھ دیر تک فوزیہ خاموشی سے ان کے فکر مند چہرے کو تکتی رہی پھر دبے قدموں باہر آ گئی۔ نادیہ سے بات کرنا

چاہی تو معلوم ہوا وہ مریم کے ساتھ باہر گئی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر تک خالی ذہن ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکر لگاتی رہی پھر تھک کر باہر برآمدے میں سیڑھیوں میں چپ چاپ بیٹھ گئی۔ محض اتفاق تھا یا اس کی خوش قسمتی کہ اسی لمحے چوکیدار نے گیٹ کھولا اور منصور کی گاڑی اندر آ گئی۔ فوزیہ کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا بھاگ کر نیچے آئی منصور نے بالکل سامنے اسے دیکھ کر گاڑی روک لی۔ کھڑکی میں سے سر نکال کر چلایا۔ "اے لڑکی خودکشی ہی کرنا ہے تو میری گاڑی کے سامنے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔"

"میں بہت خوش ہوں اس وقت اللہ میاں سے کچھ اور مانگتی تو وہ بھی مل جاتا۔ سیڑھیوں پر بیٹھی یہی دعا مانگ رہی تھی کہ اللہ جلدی سے آج بلکہ ابھی منصور بھائی کو بھیج دے۔"

"کیوں خیریت۔" وہ گاڑی سے اتر آیا۔ "خیریت ہی تو نہیں ہے پتا نہیں کیا ہے پھوپھی حضور کی طبیعت کچھ عجیب سی خراب ہے۔ سارا دن کمرے ہی میں لیٹی رہتی ہیں۔ پوچھو تو بتاتی بھی کچھ نہیں ہیں۔"

وہ فوزیہ کے ساتھ چلتا ہوا ماں کے کمرے میں آ گیا۔ عابدہ بیگم خاموش آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔ "آداب امی جان!" منصور کی آواز پر چونک کر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ منصور نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آ رہی ہے یقیناً فوزیہ نے تنگ کیا ہو گا۔" وہ ہنس پڑیں۔ اس کی پیشانی اور بالوں پر کئی پیار کیے۔ "تنگ تو تم نے کیا دو دن کا کہہ کر گئے اور چوتھے دن آ رہے ہو۔ یہ بے چاری تو خود تنہائی کے عذاب میں مبتلا ہے۔ مجھے کیوں تنگ کرتی۔ اچھا اٹھو جاؤ کپڑے تبدیل کرو۔ فوزیہ بیٹی بھائی کے لیے کھانا لگوا دو۔"

"نہیں امی جان میں کھانا کھا کر آ رہا ہوں اور کپڑے یہ تو میرے خیال میں خاصے صاف ستھرے ہیں۔ بابا نظر نہیں آ رہے ہیں کہاں ہیں؟"

ان کی مسہری کو خالی دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

"اپنے کسی ملنے والے کے پاس گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔"

"اور تو سب خیر خیریت ہے نا۔" منصور کو تشویش تھی۔

"ہاں بیٹا سب خیر خیریت ہے اللہ کا شکر ہے۔"

"کوئی خیر خیریت نہیں ہے۔" فوزیہ جھٹ سے بول پڑی۔ "مجھے لگتا ہے پھوپھی

حضور کچھ نہ کچھ بیمار ضرور ہیں۔ تکلیف کیا ہے پوچھو تو بتاتی بھی نہیں ہیں۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اس کو وہم ہو گیا ہے۔ جاؤ تم جا کر آرام کرو۔''

''جیسا آپ کا حکم۔'' اٹھتے ہوئے بولا۔'' کہیے تو آپ کی نیم حکیم بھتیجی کو بلوا دوں۔''

وہ مسکرا دیں۔''نیم حکیم کیوں ہونے لگی اگلے سال خیر سے پوری ڈاکٹر بن جائے گی۔''

''جی ہاں اس کے بعد ہی سے فیملی پلاننگ کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔'' عابدہ بیگم نے ہلکے سے چپت رسید کی۔''بہت بولنے لگا ہے۔''

''اچھا یاد آیا کل صبح ڈرائیور کے ساتھ فوزیہ کو گلزار نگر بھجوا رہی ہوں۔ وہ غریب بھی اس تنہائی سے تنگ آ گئی ہے۔ سارا دن بہن کے پاس رہے گی تو تازہ دم ہو جائے گی۔''

''آپ کی مرضی۔'' لیکن وہ جاتے جاتے پلٹا۔''اگر نادیہ خود یہاں آ جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ آپ کو چیک بھی کر لیتی اور آپ دونوں تازہ دم بھی ہو جاتیں۔''

''اپنے متعلق کیا خیال ہے آپ بھی تو تازہ دم ہو جائے۔'' فوزیہ نے جملہ کسا۔ تینوں زور سے ہنس پڑے۔ عابدہ بیگم کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔''فوزیہ تم نادیہ کو فون کر کے بتا دو صبح گاڑی بھیج رہے ہیں وقت نکال کر ضرور آ جائے مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

منصور جاتے جاتے رک گیا۔ ان کے نزدیک مسہری پر بیٹھتے ہوئے بولا۔''خیریت تو ہے اماں جان! کون سی ضروری بات ہے مجھے بھی تو معلوم ہو؟''

''ہے ایک تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔'' ان کے چہرے پر دوبارہ فکرمندی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

''نادیہ آ جائے تم دونوں کے سامنے ہی بات ہو گی۔ ویسے کوئی اتنی اہم بات بھی نہیں ہے جاؤ جا کر آرام کرو۔ فوزیہ تم یاد سے فون کر دینا۔ اگر وہ آنے پر رضامند ہو جاتی ہے تو صبح ہی صبح گاڑی بھیج دینا۔ اب تم بھی جاؤ۔ لائٹ آف کر دینا مجھے نیند آ رہی ہے۔''

اپنے کمرے کے دروازے پر رک کر منصور بڑے تشویشناک انداز میں بولا۔''مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے یقیناً تمہاری بہن صاحبہ نے کوئی گھپلا کر دیا ہے۔''

''کوئی نہیں۔'' فوزیہ چڑ گئی۔'' آپ بلاوجہ ہی ان پر الزام لگا دیتے ہیں۔ وہ تو جب سے گئی ہیں کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔''

''چلو پھر میں ہی غلط ہوں گا ویسے میری مانو کمرے میں جاؤ جائے نماز بچھا کر ساری رات بہن کی سلامتی کی دعا مانگو۔ مجھے تو اماں جان اچھی خاصی ناراض نظر آ رہی ہیں۔''

''اچھا بائی بائی شب بخیر۔''

عابدہ بیگم اور رشید احمد کے بیدار ہونے سے پہلے ہی نادیہ اسلام پور پہنچ گئی تھی۔ گاڑی کے جاتے ہی فوزیہ برآمدے کی سیڑھیوں پر گرم گرم چائے کا مگ ہاتھ میں لیے چاروں طرف کمبل لپیٹے مجسم انتظار بنی بیٹھی تھی۔ رات فون پر نادیہ نے آنے کا وعدہ کر لیا تھا بلکہ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ خود ہی آنے والی تھی۔ اسے بھی شاید کوئی ضروری بات کرنی تھی۔

''ان ضروری کاموں اور ضروری باتوں نے تو اچھی خاصی مصیبت ڈھا دی ہے۔'' فوزیہ پتا نہیں کیا کچھ سوچے جا رہی تھی کہ گیٹ میں گاڑی کے داخل ہوتے ہی وہ کمبل پھینک کر گاڑی کی طرف لپکی۔ نادیہ نے گاڑی سے باہر آ کر بہن کو گلے لگا کر ڈھیر سارے پیار کر ڈالے پھر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اندر آ گئیں۔ منصور کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک لحہ کو اس کے قدم رکے۔

''صبح بخیر نادیہ وجاہت علی صاحبہ!''

وہ چونک پڑی۔ منصور کھڑکی سے سر نکالے مسکرا رہا تھا۔

''صبح بخیر۔ پر آپ نے تو ڈرا ہی دیا۔'' نادیہ ہنس پڑی۔

''شخصیت ہی ایسی ہے کہ سب ڈرتے ہیں اور تمہیں تو ڈرنا ہی چاہیے۔'' وہ گاؤن پہنتے ہوئے باہر آ گیا۔''تاریخ کا پہلا واقعہ ہے کہ تم اتنی صبح اور اتنی سعادت مندی سے آ گئیں۔ انکار نہیں کیا۔''

''جی ہاں کبھی کبھی انسان کو اپنے معمولات بدلنا بھی پڑ جاتے ہیں۔ اچھا اب آپ اندر جائیں حلیہ درست کریں اتنے میں میں پھوپھی حضور سے مل لوں۔'' وہ آگے بڑھ گئی۔

عابدہ بیگم بیدار ہو چکی تھیں۔ رشید احمد بھی ایزی چیئر پر نیم دراز تھے۔ نادیہ کو غیر متوقع طور پر اپنے سامنے پا کر حیران رہ گئے۔ اس نے قریب جا کر اپنا سر پھوپھی کے سینے سے لگا دیا۔ انہوں نے پیار کیے دعائیں دیں اور پاس ہی بٹھا لیا۔

ناشتے کے بعد رشید احمد آفس چلے گئے۔ عابدہ بیگم نے بنا کسی تمہید کے وہیں میز پر ہی نادیہ کو مخاطب کیا۔

''بیٹی! میں نے ایک اہم مسئلے کے فیصلے کے لیے تمہیں بلوایا ہے۔ میں الجھ گئی ہوں چاہتی ہوں تم میرا ساتھ دو۔''

''کیوں پھوپھی حضور؟'' نادیہ ہنس پڑی۔ ''کیا ان بیرسٹر منصور صاحب کی پریکٹس ناکام ہوگئی؟'' عابدہ بیگم بھی مسکرا دیں۔ منصور کچھ بولنے والا تھا کہ انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا۔

''ایسا مقدمہ بھی نہیں ہے کہ عدالتی کارروائی کی نوبت آئے۔ معمولی سی بات ہے۔ آپس کا معاملہ ہے۔''

''میں تو خود آج آپ کے پاس اپنے اہم مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے آنے والی تھی۔'' نادیہ کے جملے نے سب کو حیران کر دیا۔

''میں سمجھ گئی جو اہم مسئلہ مجھے درپیش ہے یقیناً اسی نے آپ کو بھی الجھایا ہوا ہے چھوٹی پھوپھو اور ریاض بھائی میرے پاس ہوسٹل آئے تھے۔''

''وہ کیوں؟'' منصور نے آنکھیں نکالیں۔

''اچھا...... نجمہ اور ریاض تمہارے ہوسٹل پہنچ گئے۔ انہیں ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' عابدہ بیگم کو غصہ آ گیا۔ ''میں نے نجمہ کو ساری باتیں سمجھا دی تھیں پھر بھی......''

''آخر بات کیا ہے؟'' منصور کے لیے برداشت کرنا ناممکن ہو رہا تھا۔ ''مجھے بھی تو معلوم ہو۔''

''بات کچھ بھی نہیں ہے بیٹا!'' عابدہ بیگم نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔ ''نجمہ کو کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ان کو شکایت ہے کہ میں نے ان سے مشورہ کیے بغیر تمہاری منگنی نادیہ سے کر دی حالانکہ بقول ان کے وجاہت نے ریاض کے لیے حامی بھر لی تھی۔ جو اس رشتہ پر خوش تھے میں نے جو کچھ بھی کیا وہ ریاض کے ساتھ سراسر زیادتی ہے اور یہ کہ منگنی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''انہوں نے سب باتیں کب کہیں۔ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' منصور کو واقعی غصہ آ گیا۔

''اپنے جانے سے ایک دن پہلے۔'' انہوں نے بتایا۔

''آپ نے اس وقت مجھے کیوں نہیں بتایا۔ اب یہ میرا مسئلہ ہے ان سے کہہ دیجیے

انہیں جو کہنا ہو وہ براہ راست مجھ سے بات کریں۔''

''منصور! جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' عابدہ بیگم نے سمجھایا۔ ''دراصل ہم دونوں خاندان غلط فہمیوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وجاہت نے نادیہ کے لیے ریاض کا رشتہ خوشی سے قبول کر لیا تھا حالانکہ دو سال پہلے وہ تمہارے لیے اپنی رضامندی دے چکے تھے۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ نجمہ کو صحیح صورتحال سے آگاہ کر دیتے لیکن جیسا کہ ان کی عادت تھی چھوٹی بہن کی محبت اور مروت میں فوری انکار نہ کر سکے۔ یقیناً کسی مناسب وقت کی تلاش میں ہوں گے۔ جو انہیں نہ مل سکا حالانکہ مجھے یاد ہے ہمارے جانے کے بعد جب بچیوں کو ہوسٹل میں داخل کروا دیا تھا ایک دن فون پر مجھ سے خاص طور پر کہا کہ نادیہ، منصور کی امانت ہے بھول نہ جایئے گا۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اب نہ وجاہت ہم میں موجود ہیں اور نہ ثریا دلہن، ایسے میں کسی تیسرے شخص کی ضرورت ہے جو نجمہ اور ریاض کو یہ باور کرا سکے جو سمجھ رہے ہو وہ وجاہت کی مرضی نہیں تھی۔''

''ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں باور کرائیں۔'' منصور نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ ''ماموں، منصور کی مرضی اور ان کی اپنی خواہش کی وجہ سے یہ منگنی ہوئی ہے۔ وہ اور ان کا بیٹا اسے قبول نہیں کرتے تو نہ کریں۔''

''تم سے کیا کہنے آئی تھیں؟'' عابدہ بیگم نے منصور کے غصے کو نظر انداز کر کے نادیہ سے سوال کیا۔

''وہی سب جو آپ سے کہا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ جو فیصلہ ریاض بھائی کے حق میں ہوا ہے وہ اس سے کسی حالت میں بھی دستبردار نہیں ہو سکتے۔''

''ہوں تو یہ بات ہے۔'' منصور نے گہری سانس لی۔

''میرے نزدیک اس قسم کی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ پھوپھی حضور! میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ آخری بار گاؤں کے دورے پر جانے سے پہلے جب بابا جان مجھ سے ملنے سکول آئے تھے تو اس وقت پہلی بار انہوں نے یہ بتایا کہ تمہارے لیے ہم نے منصور کا انتخاب کیا ہے لیکن زبردستی نہیں ہے ابھی تم دونوں ناعمر ہو، ناسمجھ ہو۔ بڑے ہونے پر اگر یہ رشتہ منظور نہ ہوا تو اپنی زندگی کے ساتھی کا فیصلہ خود کر لینا۔ یہ بات پھوپھی کی سمجھ میں کسی حد تک آتی یا نہیں آتی لیکن ریاض بھائی ماننے کو قطعی تیار نہیں تھے۔''

”تو نہ مانیں ہمیں اس سے غرض نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ رشتے منقطع ہو جائیں گے تو ہو جائیں۔“

”منصور اپنے آپ کو قابو میں رکھو بیٹا! یہ اتنے قریبی رشتے ہیں۔ اس آسانی سے تو قطع نہیں کیے جاسکتے۔“ عابدہ بیگم نے سمجھایا۔ ”تم صبر تو کرو میں نجمہ اور ریاض سے بات کر کے انہیں سمجھاؤں گی۔ مجھے یقین ہے وہ اپنی اس غلط قسم کی ضد سے باز آ جائیں گے۔“

”یہ ناممکن ہے پھوپھی حضور!“ نادیہ دھیرے سے بولی۔ ”جہاں عزت اور آن درمیان میں آ جائے تو معاملات سلجھتے نہیں اور الجھ جاتے ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ میری ذات کی وجہ سے آپ دونوں بہنوں کے درمیان اتنی تلخی بڑھے کہ ساری زندگی کے لیے آپ لوگ ایک دوسرے سے دور ہو جائیں۔ شاید یہی کچھ بابا جان بھی نہیں چاہتے ہوں گے ورنہ صاف انکار کر دیتے۔“

”تو اب کیا، کیا جائے؟“ منصور کے لہجے میں تھوڑی بے چارگی تھی۔ ”لیکن آپ لوگ معاف کیجیے گا ماموں حضور کی اس جھوٹی مروت نے آج ہمارے لیے اتنا بڑا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔“

”اس کو پہاڑ بنا کر سر پر تو سوار نہ کرلیں۔“ نادیہ نے بڑی رسانیت سے سمجھایا۔ ”بابا جان کی اس کمزوری نے آپ لوگوں کو اتنا پریشان کر رکھا ہے اس کا مجھے احساس ہے۔ اب اس امر کا صرف ایک ہی حل ہے پھوپھی حضور کہ آپ اس معاملے اور اس رشتے کو یہیں ختم کر دیں۔ اگر ایک گھر بسانے سے دو خاندانوں کے درمیان نفرتوں کی دیوار حائل ہو جائے تو اس کو وقت سے پہلے ہی ڈھا دینا چاہیے مجھے فی الحال شادی ہی نہیں کرنی ہے۔“

”یہ آپ نے ایک اور اعلیٰ قسم کی بے وقوفی کی بات کی۔“ منصور نے ڈانٹا۔

”جہاں اور بہت سی بے وقوفیوں کو آپ لوگوں نے برداشت کیا ہے اس کو بھی برداشت کرلیں۔“ وہ مسکرا دی۔

”یوں بابا جان کی روح بھی مطمئن ہو جائے گی ورنہ اپنی دو عزیز ترین بہنوں کے درمیان اتنی نفرتیں جنم لے لیں ان کو بے چین رکھے گا۔ ویسے لوگ غلط تو نہیں کہتے ہیں۔ اب تو مجھے بھی احساس ہونے لگا ہے کہ نحوست کیا ہوتی ہے۔“

”نادیہ اگر آئندہ تمہاری زبان سے یہ لفظ نکلا تو اچھا نہ ہوگا۔“ عابدہ بیگم نے تنبیہ

کی۔ ”اور نہ کوئی غلط قسم کا فیصلہ کرتا۔ سب قسمت کا کھیل ہے ہمارے اپنے بس کی بات نہیں۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں ہمیں نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے کس کے لیے کس کو منتخب کیا ہے۔ اس کا فیصلہ بہر حال ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔“

”اماں جان!“ منصور تڑپ کر بولا۔ ”میں اپنی مرضی کے خلاف کسی بھی فیصلے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ خواہ زندگی بھر کے لیے آپ کو اپنی بہن کو چھوڑنا ہی پڑے۔“

عابدہ بیگم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا انہوں نے بڑی عجیب شکایت آمیز نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس نئی نسل کے نزدیک تو رشتوں کی کوئی اہمیت بلکہ ضرورت ہی نہیں رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کس آزمائش میں مبتلا کر رہا ہے۔

نادیہ بغور ان کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی، اس کا دل دکھ گیا۔ ان کے کندھے سے سر ٹکا کر بڑے پیار سے بولی۔

”پھوپھی حضور! اتنی پریشان تو نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا آپ جانتی ہیں بابا جان کو آپ دونوں بہنوں سے کتنی محبت تھی۔ اب ان کی بیٹی کی وجہ سے اگر آپ کی محبت نفرت میں بدل گئی تو ان کی روح کو بڑی اذیت ہوگی جو میرے لیے ناقابل برداشت ہے اور باعث شرم بھی۔ میں نے کہا نا مجھے شادی نہیں کرنی آپ چھوٹی پھوپھو کو بتا کر انہیں تسلی دے دیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ میرے ہوسٹل نہ آئیں۔“

”لیکن میں تمہارے اس فیصلے کو قبول نہیں کرسکتا تمہارے رزلٹ آنے کے بعد یہ شادی ہوگی اور ضرور ہوگی۔“ منصور نے اعلان کیا جواب میں نادیہ نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور عابدہ بیگم کی زبان تو جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ فوزیہ چپ چاپ سر جھکائے روئے جا رہی تھی یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ دل و دماغ کے لیے ان حالات کو قبول کرنا ناممکن سا ہو گیا تھا۔

خوشیاں بھی کسی کسی ہی کو دل کھول کر ملتی ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ اس کا بہت بڑا انعام اپنے بندوں کے لیے کہ جسے چاہے جھولی بھر کر دے دے اور جسے چاہے ایک مٹھی عطا کر دے۔ انسان کی زندگی کا بڑا حصہ تو ان آزمائشوں ہی میں بسر ہو جاتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ اسے مبتلا کرتا رہتا ہے، یہ جانے بغیر کہ کن حالات میں اس کی بہتری اور کہاں ابتری ہے۔“

میڈیکل کے پانچ سال یوں گزر گئے جیسے پانچ دنوں کی بات ہو، داخلہ لیتے وقت نادیہ کو یہی سال پہاڑ معلوم ہوئے تھے جن کو عبور کرنا اسے ناممکن نظر آیا تھا۔ یوں بھی داخلہ کے سلسلے میں اسے بڑی بڑی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کئی کٹھن مرحلوں سے گزری تھی اب جبکہ وہ یہ تمام رکاوٹوں کو پار کر چکی تھی اسے عجیب سی اطمینان بخش مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ایسی خوشی گویا سارے جہاں کے خزانے اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیئے گئے ہوں۔

زندگی کی ان تین منزلوں میں اس نے بہت کم خوشیاں دیکھی تھیں۔ اتنی کم اور مختصر کہ ان کے نقوش اس کے ذہن سے ریت پر بنائی گئی لکیروں کی طرح کب کے مٹ مٹا چکے تھے۔ اب وہ ریت کے ان ٹیلوں کے قریب کھڑی ہو کر ماضی کو تلاش کرتے ہوئے افسردہ ضرور ہو جاتی۔ عام سی لڑکیوں کی طرح تکیے میں منہ چھپا کر آنسو نہیں بہاتی تھی۔ حال کی بنیادوں پر اس جیسا ہی دوسرا ماضی تعمیر کرنے کی لگن تھی جس نے اسے اپنوں سے دور گلزار نگر میں ڈالا ہوا تھا صرف اس لیے کہ یہاں امی حضور کو پا لینے کی بہت موہوم سی امید تھی۔ اس شکستہ سی امید کے سہارے وہ انجانی خوشیوں کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ ایک لڑکی کو اس کی حقیقی مسرتیں اور خوشیاں دو ہی ٹھکانوں پر ملا کرتی ہیں۔ ماں کی آغوش، باپ کی شفقت میں یا شوہر کی سچی اور پُرخلوص محبت میں۔ پہلی خوشیاں تو ہر ایک کو مل ہی جاتی ہیں کم یا زیادہ دوسری مسرت اور محبت کون جانے کس کے حصے میں آتی تھی یا نہیں زندگی کے دونوں ہی دور بے حد حسین ہوتے ہیں۔ ایک میں پہاڑوں پر سے گزرنے والے جھرنے کا حسن اور وقار ہے تو دوسرے میں کانٹوں کے بیچ کھلے پھول کی خوبصورتی ہے جسے پا لینے کے لیے انگلیوں کا خون کرنا پڑتا ہے۔ تب مہک اپنی بن جاتی ہے۔

امتحانوں سے فارغ ہونے کے بعد فرصت ہی فرصت تھی۔ ہوسٹل کی زیادہ تر لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں لیکن نادیہ اور مریم نے یہ طے کر لیا تھا کہ نتیجہ آنے کے بعد ہی ہوسٹل چھوڑیں گی ان دنوں ان کے دو ہی پسندیدہ مشغلے تھے ناولیں پڑھنا یا پکچر دیکھنا۔

رات گئے تھک تھکا کر جب دونوں لیٹتیں تو اکثر ایسا ہوتا کہ ساری رات گزر جانے کے بعد بھی وہ دونوں نیند سے سمجھوتہ نہ کر پاتیں۔

''تم سوئی نہیں؟'' نادیہ، مریم سے سوال کرتی۔

''تم کیوں جاگ رہی ہو؟'' دوسری پوچھتی اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔

اس رات بھی نادیہ آنکھیں پھاڑے ان اندھیروں میں جیسے نیند کو تلاش کر رہی تھی کہ مریم کی مسہری سے دبی دبی سسکی کی آواز سن کر اچھل پڑی۔

''مریم، مریم ادھر دیکھو۔'' وہ اٹھ کر اس کی مسہری پر آ گئی تھی۔ آہستہ سے چادر اس کے چہرے سے ہٹائی مریم کا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے بھیگی بھیگی پلکیں اٹھا کر نادیہ کی طرف دیکھا پھر اس کی گود میں منہ چھپا کر سسک اٹھی۔

''مریم! کیا ہوا تمہیں؟ کیوں رو رہی ہو؟ بتاؤ نا مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

نادیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح چپ کرائے چند لمحے بعد مریم خود ہی چادر کے کونے سے آنکھیں پونچھ کر ہنستی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ ''چلو جاؤ اپنے بستر پر مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''مریم!'' الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ وہ حیران بھی تھی اور سنجیدہ بھی

''میری نیند خراب کر کے کہتی ہو نیند آ رہی ہے۔ اب رونے کی وجہ تو بتانا ہی پڑے گی۔''

''کچھ بھی نہیں نادیہ یونہی دل چاہ گیا۔ رونے پر بھی بھلا کسی کا بس ہے۔''

''تم چھپا رہی ہو۔''

''بتانے سے بھی کیا حاصل۔''

''دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔'' نادیہ نے سمجھایا۔

''اگر یہ بوجھ ہی مجھے عزیز ہو تو؟''

''پاگل مت بنو۔ رو رو کر مر جاؤ گی کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

''مرنا اتنا آسان نہیں نادیہ! جتنا جینا مشکل ہے۔'' وہ ذرا رکی۔ ''وہ شعر تو تم نے سنا ہوگا جس کا ایک مصرعہ کچھ یوں ہے زندگی مجھ پر وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا۔

''مشکلات پر قابو پا لینے ہی میں انسان کا بڑا پن ہے۔''

''میرا بڑا پن کھو چکا ہے۔ اسے کہاں سے لاؤں؟''

''یہ آپ کی اپنی جھوٹی اختراع ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ دکھ بانٹ لیے جائیں تو بڑی حد تک ذہنی سکون مل جاتا ہے۔ ویسے مجھے افسوس ہوا اتنے سال ساتھ رہنے کے باوجود تم نے مجھے قابلِ اعتماد نہیں سمجھا یہ میرے لیے باعثِ شرم ہے۔''

''نادیہ یہ بات نہیں ہے۔'' مریم بے چین ہو اٹھی۔ ''تم تو پہلے ہی اپنی پریشانیوں میں

گرفتار ہو اپنی ناکامیاں بھی کیوں تمہارے راستے پر ڈالوں۔"

"ٹھیک ہے میں مجبور تو نہیں کرتی۔" نادیہ اپنی مسہری پر واپس آ گئی۔

"بس ہو گئیں ناراض۔"

"ناراض بھی تو اپنوں ہی سے ہوا جاتا۔"

مریم مسکرا دی اس کے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"خدا کی قسم میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ میرا دکھ سن کر تم خوانخواہ ملول ہو۔ ارے پگلی یہ کوئی اتنی اہم بات بھی نہیں ہے۔ ایسی اور اس سے بھی بڑھ کر خدا معلوم کتنی کہانیاں ہمارے گھرانوں میں جنم لے چکی ہیں اور جب تک ہم تم اور ہماری جیسی اور لڑکیاں پیدا ہوتی رہیں گی یہ کہانیاں بھی عنوان بدل بدل کر سامنے آتی رہیں گی۔" وہ بڑی خوابناک آواز میں بولی۔ "وہ زمانہ جیسا بھی تھا اچھا ہی تھا جب ماں باپ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے یوں زندہ درگور ہونے سے تو بچ جاتی تھیں۔"

"مریم۔" نادیہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ہر بچے کی پیدائش سے پہلے اس کی تقدیر اس کی پیشانی پر لکھ دیتے ہیں۔ اب اگر ماؤں سے زیادہ چاہنے والی ہستی بھی ہماری تمہاری پیشانیوں پر بدقسمتی، کم مائیگی وغیرہ وغیرہ لکھ دے تو بھلا کون کس سے شکایت کرنے جائے گا۔ میں مایوس نہیں ہوں مجھے تقدیر سے شکایت بھی نہیں ہے مجھے تو بس ایک الجھن، ایک بے چینی، ایک اچنبھا ہے جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے دعا کرتی رہتی ہوں۔" مریم کی پلکیں نم آلود تھیں ہونٹ خشک ہو رہے تھے لیکن لبوں پر وہی معصوم سی مسکراہٹ تھی۔

"مریم!" نادیہ نے سمجھانا چاہا۔ "میں جانتی ہوں عمر نے تمہارے ساتھ بے وفائی کی۔ تمہیں دھوکہ دیا، تمہاری انا کو ٹھیس پہنچائی۔ ایسے انسان سے تو تمہیں نفرت ہونی چاہیے شدید ترین نفرت اور تم ہو کہ اس کی یاد میں آنسو بہا رہی ہو۔ ارے لڑکی گٹر میں عرق گلاب لنڈھا دینے سے بھی اس کی بدبو نہیں جاتی خوشبو کا زیاں ہوتا ہے۔"

"بس کبھی کبھی گزرے ہوئے اچھے دن یاد آ جائیں تو پانی بن کر بہنے لگتے ہیں ان پر اپنا بس بھی تو نہیں ہے۔ ویسے نادیہ! ہم لڑکیاں بھی کتنی بے وقوف ہوتی ہیں کس آسانی سے دھوکہ کھا کر اپنے پیار کی ساری دولت دوسروں پر لٹا کر خالی ہاتھ رہ جاتی ہیں اور دوسرے

کتنے محتاط ہوتے ہیں اکثر سوچتی ہوں کیا عمر کو وہ خوبصورت دن، وہ باتیں کبھی یاد نہیں آتی ہوں گی کبھی کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا ہو گا۔" اس نے ہونٹوں کو کھینچ کر آنکھیں بند کر لیں پھر آنکھیں کھول کر زور سے ہنس پڑی۔ نادیہ کا سارا وجود کانپ اٹھا۔

"بے وقوف لڑکی۔" اسے غصہ آ گیا تھا۔ "جو انسان اتنا ناقابل اعتماد اور کم ظرف ہو اسے بھول جانا چاہیے۔ اس کی یاد سے اپنے ذہن کو کیوں گندہ کرتی ہو؟"

"یہی تو مشکل ہے کہ ابھی تک وہ میرا اپنا ہے۔"

"آپ اعلیٰ ترین درجے کی بے وقوف ہیں۔" نادیہ جھنجلا گئی۔ "یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ وہ تو وہاں بیوی بچوں کے ساتھ عیش کرتا رہے اور آپ یہاں اس کی یاد میں آنسو بہائیں لعنت ہے تم پر۔"

"میں روتی کہاں ہوں۔ آج کئی سالوں بعد یہ آنسو بہے ہیں۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ کلینڈر پر نظر پڑتے ہی اچانک ہی یاد آیا آج ہماری شادی کی دسویں سالگرہ تھی۔"

"ہوں، اچھا۔" نادیہ کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ اسے اپنے اندر کوئی چیز ڈوبتی، ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی یہ شدید خواہش تھی کہ مریم ایسے ذلیل مرد کو چلا چلا کر برا بھلا کہے۔ اس کی حرکتوں کو طشت ازبام کرے تاکہ اس دنیا کے تمام مرد اپنے کانوں سے اپنے گھناؤنے کردار کی کہانی سنیں۔ وہ ایسا دریا بن جائے جو طغیانی آ جانے پر راستے کی ہر چیز کو ملیا میٹ کر دیتا ہے لیکن مریم ہنس رہی تھی اس کے چہرے پر بڑا سکون تھا۔

"کیا سوچنے لگیں؟" مریم کی آواز نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

"ہوں، کچھ نہیں۔"

"کچھ......تو۔" مریم نے اصرار کیا۔

"یہی کہ مشاہدات اتنے تلخ ہوں تو اعتماد کتنے دھیرے سے اٹھ جاتا ہے۔ اب بھلا کون کس پر اعتبار کرے۔ اچھا ہی ہوا میں نے شادی سے انکار کر دیا۔ ورنہ شاید برسوں بعد بھی میں منصور پر اعتماد نہ کر سکتی۔"

"نادیہ!" مریم کانپ اٹھی۔ "پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ پاگل مت بنو۔ خدا نہ کرے منصور بھائی، عمر جیسے ہوں وہ ایک اچھے انسان ہیں۔ پھر، میری جان دلہن بن کر جب ایک لڑکی اپنے گھر سے باہر قدم رکھتی ہے تو وہ اس اندھے اعتماد کے سہارے ہی آگے

بڑھتی۔ ورنہ وہ طویل فاصلہ جو باپ کے گھر کی چوکھٹ اور سسرال کی ڈولی کے درمیان ہوتا ہے کیسے طے کرے؟"

نادیہ کو ہنسی آ گئی۔

"سقراطن صاحبہ مان گئے۔ بڑی ڈھیٹ ہو ابھی آنسو بہا رہی تھی۔ اب بزرگ بن کر نصیحت کرنے بیٹھ گئیں۔"

"داد دو ہمارے ضبط اور حوصلے کی۔"

"میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں دوست جو تمہارے بلند حوصلے اور ضبط کے لیے استعمال کر سکوں۔"

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا بس سو جانا چاہیے بہت بکواس ہو چکی۔"

مریم لائٹ آف کر کے لیٹ گئی۔ نادیہ بھی اپنی مسہری پر آن کر لیٹ گئی اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن نیند ان آنکھوں سے غائب تھی۔

☆

اس نے لیٹے لیٹے ہی آنکھیں کھولے بغیر ہی ہاتھ بڑھا کر میز پر سے اخبار اٹھایا تھوڑی سی آنکھ کھول کر سرسری نظر ڈالی پھر فوراً ہی پوری کی پوری آنکھیں پھاڑ دیں سامنے ہی بڑی بڑی ہیڈ لائن میں ایم بی بی ایس کا رزلٹ موجود تھا۔ رضائی پھینک کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نظریں مختلف نمبروں پر سے ہوتی ہوئیں اس مخصوص نمبر پر آ کر رک گئیں جس کی اسے تلاش تھی۔

"تو فرسٹ کلاس مار ہی لیا بڑی استاد ہو۔" منصور کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مبارک ہو نادیہ وجاہت علی صاحبہ!" وہ بڑبڑایا۔ پھر اخبار ہاتھ میں لیے ہوئے عابدہ بیگم کے کمرے میں آ گیا۔

"اماں جان! آپ کی بھتیجی کا رزلٹ آ گیا۔"

"کیا ہوا؟ تم نے دیکھ لیا؟ پاس ہو گئی میری بچی؟" عابدہ بیگم نے جلدی جلدی سوال کیے۔

"جی ہاں دیکھ لیا لیکن افسوس ہے کہ......" اس نے قدرے مسمسی شکل بنائی کہ عابدہ بیگم کے ہاتھ سے تسبیح گر پڑی۔

"سچ کہو منصور وہ پاس تو ہو گئی ہے نا؟"

"جب کوئی لڑکی پڑھے لکھے گی نہیں تو کیا خاک پاس ہو گی۔" وہ منہ لٹکا کر وہیں ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ بچپن سے لے کر آج تک کبھی فیل نہیں ہوئی۔ لاؤ اخبار مجھے دو کیا نمبر تھا اس کا؟" عابدہ بیگم ایک دم ہی افسردہ ہو گئی تھیں۔

"تو اب فیل ہو گئی۔ آپ کو بڑا ناز تھا نا اپنی بھتیجی پر کہ بڑی ذہین ہے ساری ذہانت دھری کی دھری رہ گئی۔"

"تم مانو یا نہ مانو وہ واقعی ذہین ہے۔ مجھے ابھی بھی یقین نہیں۔ تم نے ضرور کوئی غلط نمبر دیکھ لیا ہے۔" اسی لمحے فوزیہ اخبار ہاتھ میں لیے بھاگتی ہوئی اندر آئی۔

"مبارک ہو پھوپھی حضور! آپی نے ایم بی بی ایس فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔"

"کیا؟" عابدہ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"جی ہاں یہ دیکھیے یہ رہا ان کا نمبر۔" فوزیہ نے اخبار ان کے سامنے کر دیا۔

"لیکن نہیں یہ منصور تو کہہ رہا تھا کہ......" منصور نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

"کیا کہہ رہے ہیں یہ منصور بھائی؟" پھر منصور کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی۔

"انہوں نے یقیناً آپ سے جھوٹ بولا ہو گا۔ یہ تو چاہتے تھے کہ آپی فیل ہو جائیں۔ جلتے ہیں نا ان سے......"

عابدہ بیگم نے فوزیہ کے ہاتھ سے اخبار لے کر نادیہ کا نمبر دیکھا پھر منصور کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولیں۔

"بہت نالائق ہو۔ ماں کو بھی ستانے سے باز نہیں آتا میری آدھی جان نکال لی۔" وہ مسکرائے جا رہا تھا۔

"اب تمہاری یہ سزا ہے کہ......" عابدہ بیگم شکرانے کے نفل ادا کرنے کے لیے اٹھتے ہوئے بولیں۔ "فوراً جا کر مٹھائی لاؤ پھر ہم سب نادیہ کو مبارکباد دینے گلزار نگر جائیں گے۔"

"لیکن اماں جان سنیں تو۔" وہ گھبرا گیا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں بس جلدی جاؤ کہہ دیا نا۔"

فوزیہ اس کی بے بسی پر ہنس رہی تھی۔ منصور نے جلبلا کر مکا دکھایا۔ عابدہ بیگم کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے فوزیہ بھی باہر چلی گئی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد عابدہ بیگم نے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ دعا مانگ کر دوبارہ اخبار اٹھایا۔ دوبارہ نادیہ کا نمبر غور سے دیکھا۔ پھر نامعلوم سے جذبات اور احساسات سے اس خوشی کے موقع پر بھی ان کی پلکیں بھیگ گئیں۔ آنسو پونچھ کر وہ اپنے تخت سے اتریں الماری کھولی۔ سامنے ہی نواب وجاہت علی اور ثریا بیگم کی تصویر رکھی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر تصویر اٹھالی۔ کچھ دیر تک غبار آلود نظروں سے انہیں دیکھتی رہیں پھر بہت دھیرے سے بولیں۔

"لو وجاہت اور ثریا دلہن! تمہاری نادیہ آج ڈاکٹر بن گئی۔ مبارک ہو۔ تم دونوں کو بڑا مان تھا نا اس دن کا۔" تصویر اندر رکھ کر الماری بند کی اور واپس آن کر یوں خاموش بیٹھ گئیں جیسے دکھوں سے سمجھوتا کر لیا ہو۔ انسان کتنا بے بس اور مجبور ہے۔ حال اور مستقبل کے لیے نہ جانے کتنے حسین خواب بنتا ہے یہ سوچے بغیر کہ ہمارے بیچ ایک ایسی ہستی موجود ہے جو یہ جانتی ہے ہمارے لیے کیا اچھا ہے کیا برا ہے۔ مصلحتوں کے یہ دائرے انسان کو اس طرح گھیرے ہوئے ہیں جن سے نکلنا ناممکن ہے۔

☆

نادیہ اور مریم نے اپنا اپنا رزلٹ دیکھا اور دونوں مارے خوشی کے ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ کتنی عجیب سی بات ہے اچانک بہت ساری خوشیاں مل جانے پر بندے کو اپنے یاد آتے ہیں جن کے ساتھ مل کر وہ ان خوشیوں کو بھرپور طور پر منا سکے۔ مریم اپنوں کو چھوڑ چکی تھی اور نادیہ کے اپنے اسلام پور میں تھے۔ اسے اچانک ہی ثریا بیگم یاد آ گئیں۔ ان کی یاد کے ساتھ ہی نواب وجاہت علی یاد آئے۔ انہیں کتنا ارمان تھا مجھے اعلیٰ تعلیم دلوانے کا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور آج دونوں میں سے کوئی بھی اسے گلے لگا کر پیار کرنے کے لیے موجود نہ تھا۔ بابا جان سے ملنے کی تو امید بھی جاتی رہی۔ ہاں امی حضور۔ خدا جانے وہ کہاں ہوں گی؟ پر جہاں بھی ہوں زندہ ہوں۔ ان کی تلاش کی خاطر ہی اس نے پھوپھی اور پھوپھا کی مخالفت مول لی تھی۔ اسی تلاش اسی جستجو میں گلزار نگر کے گلی کوچوں سے نفرت کے باوجود اپنی زندگی کے سولہ سال تنہا رہ کر گزار دیئے تھے۔ اپنی اس دھن میں اکثر وہ سارا سارا دن گلزار نگر کی سڑکوں اور گلیوں میں گھوم گھوم کر گزار دیا کرتی۔ ایک ٹوٹی ہوئی موہوم سی امید تھی جس کے سہارے وہ سالوں سے بھٹک رہی تھی صرف اس یقین اور بھروسے پر کہ

"امی حضور زندہ ہیں وہ مجھے ضرور ملیں گی۔"

آج اس خوشی کے موقع پر اسے وہ بہت یاد آئیں۔ میرے رزلٹ کا انہیں کتنا انتظار رہتا تھا ہر نتیجے سننے کے لیے وہ خود سکول آتی تھیں میری کامیابی پر خوش ہو کر ان گنت پیار کر ڈالتیں۔ پھر مٹھائی منگوا کر سارے سکول کے بچوں میں تقسیم کرواتیں اور آج جبکہ ان کی عین خواہش کے مطابق میں ڈاکٹر بن گئی ہوں وہ جانے کہاں ہیں؟ کپڑے نکالتے نکالتے اس کے ہاتھ رک گئے سوٹ کیس کھلا چھوڑ کر وہ کھڑکی کے قریب آن کر کھڑی ہو گئی برف جیسی ٹھنڈی سلاخوں پر اپنا سر ٹکا کر نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی کہ مریم کی آواز نے اس کو دوبارہ حقیقت کی دنیا میں لا پٹکا۔ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔

"کپڑے پھیلا کر کن سوچوں میں گم ہو گئیں واپس آ جاؤ۔"

اس نے مڑ کر مریم کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ "پہلے یہ بتاؤ تم اچانک ہی کہاں دفعان ہو گئی تھیں۔"

"ارے میٹرن بی بی کو یہ بتانے گئی تھی کہ ہم دونوں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئے ہیں بس یہ قصور ہوا انہوں نے گھیر لیا اور انٹ شنٹ داستانیں سنانا شروع کر دیں۔"

"چلو آؤ میں پیکنگ میں تمہاری مدد کر دوں۔" مریم نے خدمات پیش کیں۔

"ایسا کون سا پہاڑ کھودنا ہے۔" وہ واپس پلٹ کر الماری کے قریب آ گئی۔

"کیوں؟" مریم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"صرف چند جوڑے کپڑے لے جا رہی ہوں۔ جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔"

"طبیعت تو ٹھیک ہے۔" مریم نے آنکھیں پھاڑ دیں۔ وہ زور سے ہنس پڑی۔

"غش کھانے کی ضرورت نہیں مجھے فوراً واپس آ کر گلزار نگر ہسپتال میں ہاؤس جاب کے لیے اپلائی کرنا ہے۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ اب کی بار تمہاری پھوپھی حضور مار کر ہی نکال دیں گی۔"

"خیال تو میرا بھی یہی ہے لیکن کیا کروں مریم! گلزار نگر چھوڑنے کو دل بھی نہیں چاہتا اور تم تو جانتی ہو اب اسلام پور میں رہنا ناممکن ہے۔ میں نے وہ ساری کشتیاں جلا دی ہیں۔"

"تمہاری مرضی۔" مریم خاموش ہو گئی۔

"تم کہیں نہیں جاؤ گی؟" کپڑے رکھتے رکھتے نادیہ نے سوال کیا۔

"میں۔" وہ مسکرا دی۔ "میں بھلا کس کے پاس جاؤں گی۔ ماں باپ ہوتے تو اور بات تھی۔ رشتے داروں کی بناوٹی ہمدردیاں مجھے نہیں چاہئیں۔ میری فکر نہ کرو دو چار روز بعد ہسپتال کے ہوسٹل میں منتقل ہو جاؤں گی مجھے بھی تو ہاؤس جاب کرنا ہے۔"

نادیہ چپ چاپ کھڑی مریم کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بڑی پُرسکون تھی جیسے طوفان گزر چکا ہو۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی زخم آلود، مصنوعی سی۔ اس نے سوچا ہم لوگ بھی کتنے بہروپیے ہیں زندگی کی بڑی سے بڑی بازی ہار جانے کے باوجود ہنس دیتے ہیں۔ اپنے آپ کو خوش اور مگن ثابت کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں محض جھوٹی انا کی خاطر پاگل کہیں کے۔ وہ آپ ہی آپ ہنس پڑی۔

سوٹ کیس بند کر کے ٹیکسی منگوانے والی تھی کہ چوکیدار نے اطلاع دی۔ آپ کے گھر والے آئے ہیں۔

"پھوپھی حضور اور فوزیہ۔" سب یونہی چھوڑ چھاڑ کر بھاگتی ہوئی گیٹ پر پہنچ گئی۔ عابدہ بیگم گاڑی سے اتر رہی تھیں۔ نادیہ ان سے لپٹ گئی انہوں نے بھی اسے چمٹا کر بے شمار پیار کر ڈالے۔ فوزیہ نے بہن کی پیشانی چوم کر بڑا سا پھولوں کا ہار گلے میں ڈال دیا۔ رشید احمد نے سینے سے لگا کر سر پر ہاتھ پھیرا مبارک باد دی۔ منصور سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ ان سب کو لیے اندر ملاقات کے کمرے میں آ گئی۔ بیٹھتے ہی عابدہ نے مٹھائی کا ڈبہ اٹھایا اور نادیہ کے سامنے کر دیا۔

"لو بیٹی جی بھر کر مٹھائی کھاؤ۔"

منصور دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ نادیہ نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن رشید احمد اور عابدہ بیگم کی موجودگی کی وجہ سے خاموش رہی۔

"ارے منصور!" بڑی دیر بعد عابدہ بیگم کو خیال آیا۔ "یہ اتنی دور کیوں کھڑے ہو؟ ادھر آؤ نا۔ تم نے نادیہ کو مبارک باد بھی نہیں دی۔ مٹھائی کھاؤ۔"

"جل رہے ہیں۔" نادیہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"آپی! انہوں نے تو آپ کو فیل ہی کر دیا تھا۔" فوزیہ نے اطلاع دی۔

"اچھا...... پھر بعد میں تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔" نادیہ نے بڑے افسوس ناک لہجے میں جواب دیا۔

"مایوسی سی مایوسی۔" منصور اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بلکہ صبح سے یہی سوچے جا رہا ہوں کہ ہمارا تعلیمی نظام کتنا انحطاط پذیر ہو گیا ہے۔ علم کا کوئی معیار ہی نہیں رہا ہے۔ ہر ایک ڈگری لے کر چلا آ رہا ہے۔ کم از کم ڈاکٹروں کی حد تک تو صحیح بندوں کا انتخاب کرنا چاہیے۔ انسانوں کی جان کا تو خدا ہی حافظ ہے۔"

"قاضی کیوں دبلے شہر کے اندیشے میں۔ کسی نے کہا ہے علاج کروانے مت آنا۔" وہ ہار کلائی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

"میری جان فالتو ہے کیا؟"

"ایسی کوئی قیمتی بھی نہیں ہے۔" نادیہ نے برا سا منہ بنایا۔

عابدہ بیگم اس نوک جھونک پر ہنستے ہوئے بولیں۔ "اچھا بچو اب یہ جھگڑا بعد کے لیے اٹھا رکھو۔ نادیہ بیٹی! جلدی سے جا کر اپنا سامان تو اکٹھا کر لو ہم لوگوں کو ابھی واپس جانا ہے۔"

"سامان تو سب ٹھیک کر لیا ہے پھوپھی حضور! میں تو بس نکلنے ہی والی تھی آپ لوگوں کو تھوڑی دیر ہو جاتی تو میں روانہ ہو چکی ہوتی۔"

"ونڈر فل اماں جان آپ کو تعجب نہیں ہوا ڈاکٹر بنتے ہی آپ کی بھتیجی نیک اور فرمانبردار بھی ہو گئی ہے۔" منصور سے چپ نہ رہا گیا۔

"وہ تو میں ہمیشہ ہی سے تھی۔ اپنی اپنی سمجھ کا قصور ہے۔" نادیہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"پھوپھی حضور! میں سوٹ کیس لے کر ابھی آئی۔" اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ان سب کے ساتھ اسلام پور جا رہی تھی۔

مریم اسے خدا حافظ کہنے کے لیے برآمدے کی سیڑھیوں پر تنہا کھڑی تھی۔ وہ بظاہر مسکرا رہی تھی لیکن اس کے اندر کتنے گھاؤ رس رہے تھے یہ کچھ نادیہ ہی جانتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو اس اداس چہرے پر دائمی انمول خوشیاں بکھیر دیتی۔ سات سمندر پار جا کر بس جانے والے انسان کا گریبان پکڑ کر کہتی۔

"تم کتنے ذلیل اور نادان مرد ہو جو سچائی اور بناوٹ میں تمیز نہ کر سکے، کتنے بدقسمت ہو جس نے تصنع کے ان گنت غلافوں میں لپٹی ہوئی اس عورت کے لیے، اس عورت کی قدر نہ کی جو محبت و ایثار کی دیوی ہے، جس میں سمندر کی گہرائی، پہاڑوں کا وقار اور چٹانوں کی مضبوطی ہے۔ خدا تمہیں غارت کرے عمر!" وہ محض ہاتھ ہلا کر رہ گئی۔

"آپی آپ کی یہ دوست کہیں نہیں جا رہی ہیں۔ اتنے بڑے ہوسٹل میں اکیلی رہیں گی۔"

"ہاں فوزیہ۔" نادیہ کا دل پہلے دکھا ہوا تھا۔ "جب اپنا کوئی نہ ہو تو بندہ کہاں جائے؟"

"ہم اپنے ساتھ لے چلتے۔"

"فوزیہ ٹھیک کہہ رہی ہے نادیہ! تم آفر تو کرتیں آخر کو تمہاری دوست ہے۔" منصور نے رائے دی۔

"بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں منصور بھائی جنہیں محبت بھی اگر خیرات میں ملے تو قبول نہیں ہوتی انہیں ہمدردیاں زہر لگتی ہیں۔"

"بڑی عظیم خوبی ہے۔ ایسے لوگ تو اس دنیا میں بہت کم رہ گئے ہیں بیٹا!" عابدہ بیگم بھی بول پڑیں۔

بقیہ راستہ سب نے نہایت خاموشی سے گزارا۔ ہر ایک اپنی جگہ اپنی اپنی سوچوں میں گم تھا۔

اسلام پور جانے کے دوسرے دن اسے عامر کی طرف سے مبارک باد کا کارڈ ملا۔

اسی رات رشید احمد اور عابدہ بیگم نے اس کی کامیابی کی خوشی میں شاندار دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ نادیہ نے کارڈ ملتے ہی فون پر اسے بھی دعوت دے ڈالی۔

"میں شاید ہی آ سکوں۔" عامر نے معذرت چاہی۔

"میں نہیں جانتی آپ کو ضرور آنا ہوگا۔" اس نے اصرار کیا۔

"کس کو اتنے پیار سے بلایا جا رہا ہے؟" منصور نے اس کے جملے کے آخری الفاظ سن لیے تھے۔

"اپنے بہت ہی قریبی دوست کو۔" نادیہ نے ریسیور رکھ دیا۔

"تو یہ بات ہے۔"

نادیہ کو ہنسی آ گئی۔ "کیوں برا لگ گیا۔ قریبی دوست ہونا اتنی بری بات تو نہیں ہے۔ خوش قسمتوں کو ہی ملتے ہیں۔"

"بھلا مجھے کیوں برا لگے گا؟ شوق سے بلواؤ ویسے اطلاعاً عرض ہے شام کی تقریب میں میری بھی ایک قریبی دوست آ رہی ہے۔ ٹھیک ٹھاک طریقے سے ملنا۔"

"آپ کی قریبی دوست؟ کیوں مذاق کرتے ہیں منصور بھائی!"

"اس میں مذاق اڑانے کی کیا بات ہے۔ شام کو خود دیکھ لینا۔"

"پھر تو اس لڑکی کا دماغ اور آنکھیں دونوں ہی کمزور ہوں گی۔" نادیہ کا انداز خالص مضحکہ اڑانے والا تھا۔

"ممکن ہے ہو لیکن تم سے علاج کروانے نہیں آؤں گا۔ کیا بھروسہ جلن کے مارے مار ہی دو۔"

"مجھے کیا پڑی ہے کسی ایرے غیرے کو مارنے کی۔ مارنا ہوگا تو کسی بہت اپنے کو ماروں گی تاکہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔"

"بات تو ٹھیک کہی ہے تم نے، رات ریاض بھائی بھی آ رہے ہیں۔" منصور اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ نادیہ ہنس پڑی۔

"یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی آپ نے۔ شکر ہے کہ تعلقات منقطع نہیں ہوئے میں بھی اپنی بات کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟ ویسے تم نے بھی ہٹ دھرمی سے کام لیا ورنہ ریاض بھائی بڑے قابل اور اچھے انسان ہیں۔"

"ہاں وہ تو ہیں۔" نادیہ کا چہرہ لال پڑ گیا لیکن لہجہ نہایت پُرسکون تھا۔ "آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیے گا منصور صاحب! جو کچھ میں نے کیا ہے اور کہا ہے وہ صرف بابا جان کی روح کی تسکین اور دونوں بہنوں کے رشتے کو قائم رہنے کے لیے کیا ہے۔"

"اور میں نے بھی اماں جان کی دل شکنی کے خیال سے حامی بھر لی تھی ورنہ انکار بھی کر سکتا تھا۔ سوچا تھا ایک لڑکی ٹھکانے لگ جائے گی میرا تو کوئی نقصان نہیں ثواب ہی ملے گا۔"

نادیہ نے پلٹ کر منصور کو گھورا پھر آہستہ سے بولی۔

"شاید یہی خدمت خلق کا جذبہ ریاض بھائی کے دل میں بھی امڈ پڑا تھا۔ جب ہی وہ بازی مار لینا چاہتے تھے۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ وقت سے پہلے ہی مجھے عقل آ گئی اور بال بال بچ گئی۔" وہ کھڑی ہو گئی منصور نے جلدی سے اٹھ کر اس کی گردن دبا لی۔

"یہ بھول جاؤ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔"

اس نے منصور کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "اس غلط فہمی میں نہ رہیے گا۔"

نادیہ کی سنجیدگی پر منصور زور سے ہنس پڑا۔ "ڈاکٹر بن گئی پر عقل نہ آئی۔"

"بیرسٹر بن کر آپ کے پاس کون سا آ گئی۔" اس نے جاتے جاتے پلٹ کر جواب دیا۔

منصور کتنی دیر تک ہنستا رہا۔

رات کی دعوت خاصی شاندار تھی۔ رشید احمد نے بے شمار لوگوں کو مدعو کر لیا تھا۔ نادیہ سیاہ شفون کی کامدار ساڑھی پہنے خلاف معمول بے حد خاموش اور سنجیدہ لگی۔ نجمہ بیگم بھی اختر حسین اور ریاض کے ساتھ تقریب میں شریک تھیں۔ اسی پرانے انداز میں خوش وخرم ہشاش بشاش۔ نادیہ کو دیکھتے ہی بڑی محبت سے گلے لگایا۔ پیار کیے مبارک باد دی۔ نادیہ نے محسوس کیا حالات خاصے نارمل ہو چکے ہیں۔

"آپ کیسی ہیں چھوٹی پھوپھو؟" نادیہ نے دھیرے سے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹی میں تو تم کو مبارک باد دینے ہوسٹل آ رہی تھی کہ آپا بیگم کا فون ملا کہ تم ان کے پاس آ گئی ہو۔"

"جی ہاں اب زبردستی لے آئیں۔"

عابدہ بیگم نے دور سے اسے دیکھ کر آواز دی کسی سے ملانا چاہتی تھیں۔ نادیہ معذرت کر کے آگے بڑھ گئی۔

جانے سے کچھ دیر پہلے وہ بیگم ریحان سے باتوں میں مصروف تھی کہ اچانک اس کی نظر گیٹ پر پڑی عامر گاڑی سے اتر رہا تھا۔ بیگم ریحان سے معذرت کر کے وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

"ہیلو ڈاکٹر عامر۔"

"ہیلو ڈاکٹر نادیہ! بہت بہت مبارک ہو۔" عامر نے چھوٹا سا پیکٹ اسے تھما دیا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی ڈاکٹر عامر! آپ آ گئے یہی میرے لیے بہت بڑا تحفہ تھا۔"

"بھلا یہ کیسے ممکن تھا آپ بلاتیں اور میں نہ آؤں۔"

"بہت بہت شکریہ۔" دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لان میں آ گئے۔

دور اپنے دوست سے باتیں کرتے ہوئے منصور نے نادیہ اور عامر کو گرمجوشی سے ملتے پھر ساتھ آتے ہوئے دیکھا۔ نادیہ کا چہرہ جو تھوڑی دیر پہلے بے انتہا سنجیدہ ہو رہا تھا منصور نے محسوس کیا خوشی سے تمتما رہا تھا۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ منصور نے بڑی ناگواری سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ "تو یہ ڈاکٹر عامر تھا جسے یہ اتنے اصرار سے بلا رہی

تھی۔" ایک نامعلوم سی خلش نے اسے بے چین کر دیا۔ عین اسی لمحے نادیہ، عامر کو لیے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئی۔

"ہیلو منصور۔" عامر اس سے لپٹ گیا۔ "کتنے نالائق دوست ہو۔ لندن سے آنے کے بعد کبھی ملنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔"

منصور زبردستی ہنس پڑا۔ "آتے ہی تو پریکٹس کے جھنجٹ میں پھنس گیا ملنے ملانے کا وقت ہی نہیں مل سکا اور بتاؤ کہاں ہو آج کل پریکٹس کیسی چل رہی ہے۔"

تینوں کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"ہوتا تو گلزار نگر ہی میں ہوں مس نادیہ سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔"

"ہوں...... اچھا اچھی بات ہے۔" وہ بہک سا گیا۔

"کیوں گپ مارتے ہیں ڈاکٹر عامر کتنے دنوں بعد تو اس روز آپ آئے تھے وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے۔"

"یقین مانئے آپ کے پاس آنے کے لیے سوچتا روز تھا۔"

"ہاؤس جاب کے لیے تو میں گلزار نگر ہسپتال میں ہی آ رہی ہوں پھر تو روز ملاقات رہے گی۔"

"اچھا تو آپ وہیں ہاؤس جاب کریں گی یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔" عامر خوش ہو گیا۔

منصور خاموش بیٹھا دونوں کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ نادیہ نے دو ایک بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی دلی کیفیت چہرے سے عیاں تھی۔ نادیہ کو ہنسی آ رہی تھی۔ "عجیب گھامڑ انسان ہے۔" اس نے سوچا۔

"تم بھی تو کچھ بولو۔" ڈاکٹر عامر نے براہِ راست منصور کو مخاطب کیا۔ "پہلے تو تم اتنے سنجیدہ، بردبار قسم کے نہیں ہوتے تھے کیا پریکٹس نے تم کو اتنا سنجیدہ بنا دیا؟"

منصور مسکرا دیا۔ "دراصل تم دونوں کی دلچسپ باتیں سن رہا تھا۔"

"ڈاکٹر عامر! آپ کے دوست اور میرے کزن سنتے زیادہ ہیں بولتے کم ہیں۔" نادیہ نے چوٹ کی۔ عامر زور سے ہنس پڑا۔ منصور بھی تکلفاً مسکرا دیا۔

"کیوں منصور! پہلے تو تمہیں ایسی کوئی تکلیف نہیں تھی۔"

"اب بھی کوئی ایسی بیماری نہیں ہے۔ اصل میں اناڑی ڈاکٹروں کی تشخیص ہمیشہ غلط

ہوتی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تم دونوں باتیں کرو میں دیکھتا ہوں کھانا لگا یا نہیں۔" وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

منصور پر ضرورت سے زیادہ ہی سنجیدگی طاری ہوگئی تھی۔ نادیہ نے گردن موڑ کر دیکھا وہ ڈائننگ ہال کی طرف جانے کے بجائے اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا۔ "بیرسٹر بن گئے عقل نہ آئی۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائی اور خود بھی عامر سے اجازت طلب کر کے کھڑی ہوگئی۔

☆

نادیہ کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ جب وہ گلزار ہسپتال میں ہاؤس جاب کے لیے اجازت مانگے گی تو اسے اتنی شدید مخالفتوں اور خفگیوں کے طوفان سے دو چار ہونا پڑے گا۔ وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ نوابیت کا محل مسمار ہو گیا تو کیا اس کے کھنڈرات تو ابھی تک موجود ہیں۔ ماضی پرست ذہنوں کے نزدیک اس چونے اور گارے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا اپنا حال کچھ نہیں ہوتا وہ اپنے آباؤ اجداد کی ہڈیوں کو شوپیس بنا کر اپنی انا کی تسکین کے لیے ڈرائنگ روم کی زینت بنا لیتے ہیں۔

دعوت کے ایک ہفتے بعد صبح ناشتے کی میز پر اس نے بنا سوچے سمجھے بڑے آرام سے عابدہ بیگم کو بتایا کہ وہ کل گلزار نگر واپس جارہی ہے۔ تو گویا آتش فشاں پھٹ پڑا۔

"گلزار نگر جارہی ہو مگر کیوں اب وہاں جانے کی کیا ضرورت؟" رشید احمد نے بڑے تعجب اور حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

"پھوپھا حضور! مجھے گلزار ہسپتال میں ہاؤس جاب کرنی ہے۔"

عابدہ بیگم نے پیالی واپس میز پر رکھی۔ گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کس نے کہا ہے تم سے ہاؤس جاب کرنے کے لیے؟" ان کے لہجے میں دبے دبے غصے کی آنچ تھی۔ نادیہ اس تپش کو محسوس نہ کرتے ہوئے مسکرا دی۔

"پھوپھی حضور! یہ تو ضروری ہے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ایک سال کسی بھی ہسپتال میں ہاؤس جاب کرنا ضروری ہے۔"

"لوگوں کے لیے ہوگا ضروری۔ تمہارے لیے نہیں ہے۔" انہوں نے اتنے روکھے پن سے جواب دیا کہ نادیہ حیران رہ گئی۔

"میرے لیے کیوں ضروری نہیں؟ میں کوئی آسمانی مخلوق ہوں۔" اس نے کچھ نہ سمجھتے

ہوئے نہایت معصومیت سے پوچھا۔

"تم جانتی ہو ہسپتال میں نوکری کرنا ہمارے خاندانی وقار کے خلاف ہے۔"

"کون سا خاندانی وقار؟" اس نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

"بحث کی ضرورت نہیں تم نے ڈاکٹری پڑھ کر اپنا شوق، اپنی ضد پوری کر لی یہی کافی ہے۔ اب ہسپتال جا کر وہاں کام کرنے کی تمہیں اجازت نہیں مل سکتی۔" عابدہ بیگم کا انداز تحکمانہ تھا۔

"لیکن پھوپھی حضور!" نادیہ نے بڑی بے بسی سے پہلے عابدہ بیگم پھر رشید احمد کی طرف دیکھا۔

"تمہاری پھوپھی ٹھیک کہہ رہی ہیں بیٹی! نوکری تمہارے لیے زیب نہیں۔ آج اگر وجاہت زندہ ہوتے تو اس کو کبھی پسند نہیں کرتے۔ خاندان کا بھی کوئی بھرم ہوتا ہے۔"

"ابا حضور مجھے کبھی منع نہیں کرتے۔"

"اس سے مجھے سروکار نہیں۔" عابدہ بیگم تیزی سے بولیں۔ "میں منع کر رہی ہوں لہٰذا تم وہاں جا کر جاب کرنے کا خیال چھوڑ دو اس میں بہتری ہے۔"

نادیہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ پھر بھی بڑے ضبط سے کام لے کر آہستہ سے بولی۔

"ایم بی بی ایس کر کے گھر میں پڑے رہنا تو سراسر حماقت ہوگی۔"

"حماقت کی کوئی بات نہیں ہمارے خاندان کی کوئی لڑکی نوکری کرے یہ ہمارے لیے باعث شرم ہے۔ ویسے بھی نجمہ سے میری بات ہوگئی ہے۔ ان لوگوں کو اب اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے سوچا ہے کہ جلد سے جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں پھر اپنا گھر سنبھالنا۔"

نادیہ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا پھر دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

"اچھا! چھوٹی پھوپھو بڑی آسانی سے اپنے حق سے دستبردار ہوگئیں تعجب ہے۔ بہرحال بقیہ معاملات میں آپ لوگوں کا جو دل چاہے کیجیے حکم ماننا ہی پڑے گا لیکن ہسپتال جانے سے مت روکیے گا یہ میری گزارش ہے۔"

"وہ میرا حکم ہے اور تمہیں ماننا پڑے گا۔" عابدہ بیگم کا پارہ آخری ڈگری پر پہنچ چکا تھا

وہ کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ساتھ رشید احمد بھی کھڑے ہو گئے۔ نادیہ نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی منصور اور فوزیہ خاموش اپنی اپنی کرسیوں پر جمے بیٹھے تھے۔

"پھوپھی حضور! ایسا غلط حکم مت دیجیے جس کی حکم عدولی آپ برداشت نہ کر سکیں۔"

وہ بھی نواب وجاہت علی کی بیٹی تھی جنہوں نے ایک فیصلہ کر لینے کے بعد پیچھے ہٹنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ عابدہ بیگم نے جاتے جاتے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا پھر جواب دیئے بغیر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ نادیہ چند سیکنڈ تک خاموش کھڑی سامنے ہلتے ہوئے پردے کو تکتی رہی پھر دھم سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"مجھے اس جھوٹی شان اور تکبر سے نفرت ہے۔" پھر منصور کی موجودگی محسوس کر کے جلدی سے اس کی طرف پلٹی۔ "آپ کا کیا خیال ہے منصور بھائی! آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟"

"میں مجبور ہوں۔" منصور نے ڈھیلا سا کھینچ مارا نادیہ کا جسم کانپ اٹھا۔

"تو میں بھی مجبور ہوں۔"

"میں جانتا ہوں نادیہ وجاہت علی! تم اتنی سعادت مند بھی نہیں ہو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے آگے تمہیں کسی کی پرواہ نہیں ہے۔"

"مجھے کس کی پرواہ ہے کس کی نہیں ہے یہ میں بخوبی جانتی ہوں لیکن خدا کے لیے یہ تو بتائیں اگر ایک سال ہاؤس جاب کر لوں گی تو اونچے خاندان کی اونچی حویلی کا کون سا مینارہ گر جائے گا۔"

"یہ بات تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔ نہ ہی تمہارے لیے اتنی اہم ہے لیکن اس خاندان کے بزرگوں کے ذہن سے سوچو جن کے نزدیک اس خاندان کی کسی بھی لڑکی کا نوکری کرنا قیامت سے کہیں زیادہ ہے۔"

نادیہ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہم لوگ بھی کتنے مردہ پرست ہیں ابا حضور ختم ہو گئے ان کے ساتھ ہی نوابیت کا محل بھی ڈھے گیا اور ہم ہیں کہ اس جلی ہوئی رسی کے سہارے اکڑ اکڑ کر آگے بڑھنا چاہ رہے ہیں۔ خواہ اوندھے منہ ہی کیوں نہ گر پڑیں۔"

"نادیہ۔" منصور نے گمبھیر نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے اگر جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو چلی جاؤ کسی کی پرواہ نہ کرو لیکن ایسی کوئی بات نہ کہنا جس سے بابا جان

اور اماں جان کے وقار اور ان کی آن کو ٹھیس پہنچے۔"

نادیہ سمجھ گئی کہ منصور کو قائل کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا نہایت دھیمے پن سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"سمجھنے کی کوشش تو کریں منصور بھائی! میں وعدہ کرتی ہوں ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی واپس آ جاؤں گی۔ آپ سب کو چھوڑ کر جا بھی کہاں سکتی ہوں؟ مہربانی سے آپ پھوپھی حضور کو سمجھائیں۔"

"تم انہیں نادان سمجھتی ہو؟ ٹھیک ہے تم جو چاہو کرو۔ اے عقل مند خاتون!"

"منصور۔" نادیہ چلا پڑی۔

"چلانے کی ضرورت نہیں نادیہ بیگم میں جانتا ہوں جو فیصلہ آپ کر لیں اسے واپس لینا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ حکم عدولی تو آپ کی فطرت میں ہے۔"

"فطرت کبھی نہیں بدلا کرتی بیرسٹر صاحب اور مجھے اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہے۔"

"کوئی اچھی چیز حاصل کرنے کی کوشش کی ہوتی۔"

"آپی!" بڑی دیر بعد فوزیہ نے مداخلت کی۔ "خدا کے لیے اب بس کریں۔ آپ لوگ بھی جھگڑنے لگے۔ پھوپھی حضور پہلے ہی ناراض ہو کر چلی گئی ہیں۔"

"تمہاری آپی کو کسی کی ناراضگی کی کیا پرواہ وہ تو خوش ہیں یہی کافی ہے۔" منصور اٹھتے ہوئے بولا۔

"آپ کو شاید یہ معلوم نہیں ہے منصور صاحب کہ میں ہر حال میں خوش رہنا سیکھ چکی ہوں۔ آپ کی اس دنیا کے لوگوں کی بے شمار نوازشوں کا بوجھ سہارتے سہارتے میں پتھر بن چکی ہوں۔"

"بڑی اچھی خبر ہے۔" منصور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"آپی!" منصور کے چلے جانے کے بعد فوزیہ اپنی جگہ سے اٹھ کر نادیہ کے قریب آئی۔ "آپ اپنی یہ ضد چھوڑ دیں نا۔ دیکھئے نا پھوپھی حضور کے ساتھ ساتھ اب منصور بھائی بھی خفا ہو گئے۔"

"فوزی میری جان!" نادیہ نے پیار سے اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔

"تم اتنا کیوں پریشان ہوتی ہو یہ میرا مسئلہ ہے۔ وہ لوگ مجھ سے خفا ہیں ہونے دو۔ تم تو جانتی ہو ہمارا ماضی کیا تھا حال کیسا رہا اور اب اگر میں اپنا مستقبل سنوارنا چاہتی ہوں تو یہ لوگ...... مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ بھاڑ میں جائیں یہ رشتے دار، انہوں نے پہلے ہمیں کون سا تحفظ دیا تھا جو اب ہمارے اعمال کے ٹھیکیدار بن رہے ہیں۔ میں تو گلزار نگر ضرور جاؤں گی اور ہاؤس جاب بھی ضرور کروں گی۔"

فوزیہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی ڈول رہے تھے۔ نادیہ نے اس کی طرف دیکھا ٹوٹی پھوٹی مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیل گئی آگے بڑھی اور اس کی نمناک آنکھیں چوم لیں۔

"بے وقوف لڑکی اتنی معمولی معمولی باتوں پر یہ قیمتی سرمایہ ضائع مت کرو۔ بہادر بنو۔ تم تو ایک نام نہاد نواب خاندان کی بیٹی ہو جس کو ان لوگوں کی جھوٹی انا کی تسکین کے لیے پتا نہیں کیا کچھ نہ کرنا پڑے۔" پھر فوزیہ کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔

دوپہر کھانے کی میز پر صرف عابدہ بیگم فوزیہ اور نادیہ تھیں۔ منصور اپنے کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا اور رشید احمد نے کھانا کمرے میں منگوا لیا تھا۔ تینوں نے نہایت خاموشی اور بیزاری سے کھانا کھایا اور ایک دوسرے سے بات کیے بغیر ہی اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔

رات کھانے کے بعد نادیہ نڈھال قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں جانے کے بجائے لان کی طرف نکل گئی۔

گھر بھر کے اس نفرت آمیز سلوک نے اسے عجیب کشمکش اور ذہنی کھنچاؤ میں مبتلا کر دیا۔ عابدہ بیگم اس حد تک خفا تھیں کہ انہوں نے صبح کے بعد سے رات کے کھانے تک اس سے بات کرنا تو کجا اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ تمام دن کے بعد منصور نظر آیا بھی تو اس طرح گویا نادیہ کی موجودگی اس کے لیے کوئی اہمیت کی حامل نہ ہو۔ ایک سرسری نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

"منصور تم سے تو یہ امید تھی کہ میرا ساتھ دو گے لیکن تم نے بھی کس آسانی سے میرے اعتماد کا بھرم توڑ ڈالا۔" پتھر کی ٹھنڈی بنچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ "گلزار نگر جانا ہاؤس جاب کرنا اتنا سنگین جرم تو نہیں تھا کہ سب کے سب اتنے خفا ہو گئے۔"

"ہنہ...... ہو جائیں خفا، مجھے ان کی پرواہ نہیں۔ میں کل صبح ضرور چلی جاؤں گی۔"
ساتھ ہی اسے نواب وجاہت علی اور ثریا بیگم یاد آ گئے۔

"آج اگر امی اور ابا حضور زندہ ہوتے تو کیا وہ بھی اتنے ناراض ہو جاتے؟ اتنے ہی سخت دل ہو جاتے؟" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

طوفان آ چکا تھا شکستہ بند ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کونوں سے آنسوؤں کے قطرے رک رک کر دھیرے دھیرے بہتے رہے۔

"مجھے سہارا دیجیے ابا حضور!" اس نے بے چین ہو کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ "اگر واقعی میں غلطی پر ہوں تو کسی طرح بھی آگاہ کر دیجیے۔ خدا کی قسم میں گھر سے قدم نہیں نکالوں گی لیکن میں مجبور ہوں میں کیا کروں گلزار نگر چھوڑنا بھی چاہوں تو نہیں چھوڑ سکتی وہاں آپ کی خوشبو میں امی حضور کا وجود ہے اور ایک غیر یقینی سا بھروسہ کہ شاید وہ کسی لمحہ مل جائیں۔ یہ لوگ نہیں سمجھتے انہیں کیسے سمجھاؤں کس طرح خوش رکھوں ابا حضور!"

"آپی!" فوزیہ کی سہمی سہمی دھیمی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کون فوزی؟"

"آپ اتنی رات گئے یہاں تنہا بیٹھی ہیں۔"

نادیہ نے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر جلدی جلدی آنسو پونچھے اور ہنستے ہوئے بولی۔

”کیا کروں فوزیہ کمرے میں پڑے پڑے اکتا گئی تھی تو یہاں آ گئی ذرا یہاں میرے پاس بیٹھ کر دیکھو اس گھپ اندھیرے میں ان درختوں کے چمکتے ہوئے پتے کتنے حسین لگ رہے ہیں۔“

”آپی!“ فوزیہ اس کے نزدیک ہی بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آپ رو رہی تھیں؟“

”توبہ کرو بھلا میں کیوں روؤں گی۔“ وہ زور سے ہنس پڑی۔

فوزیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنی تنہائی پر نہیں بہن کی بے بسی پر۔

”آپ سچ مچ کل چلی جائیں گی۔“

”ہاں فوزیہ مجھے جانا ہی ہے۔“

”آپ جانتی ہیں پھوپھی حضور بہت ناراض ہیں۔“

”میں جانتی ہوں پھر بھی یہ میری مجبوری ہے کچھ دن بعد خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”اور منصور بھائی بھی تو۔“

”اس کی بات چھوڑو فوزیہ! ویسے مجھے دکھ ہے کہ ایک بیرسٹر ہو کر بھی وہ صرف ایک مرد ہی رہا۔ احساس برتری اور کمتری کا شکار۔ بڑا آزاد خیال بنتا تھا۔ اپنی منگیتر کو ایک سال کی آزادی نہ دے سکا۔“

”ابھی پھوپھی حضور سے کہہ رہے تھے کہ۔“ وہ رک گئی۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“ نادیہ نے بنا کسی تجسس کے سکون سے پوچھا۔

”کہ اتنی ضدی اور نافرمانی لڑکی کے ساتھ ساری زندگی گزارنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔“

نادیہ مسکرا دی اندھیرے نے لاج رکھ لی تھی ورنہ فوزیہ دیکھتی کہ اس جملہ نے ایک لمحہ کے اندر اس کے چہرے کو خوفناک حد تک سفید اور بے جان کر دیا تھا۔

اس نے ہونٹ بھینچ کر پلکوں پر آتے آنسوؤں کو بمشکل روکا پھر آہستہ سے بولی۔

”یہ تو بڑا اچھا ہوا فوزی کہ وقت سے پہلے ہی اسے میری کمزوری کا علم ہو گیا۔ ورنہ مجھ جیسی غلط قسم کی لڑکی کے پھندے میں پھنس کر بے چارہ ساری زندگی پچھتاتا۔“

”لیکن آپی میں جانتی ہوں کہ انہوں نے یہ سب دل سے نہیں کہا ہوگا۔ اس لیے کہ وہ آپ کو بہت پسند کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ آپ اب یہیں رہیں ان کے پاس۔“

نادیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

لیکن بڑا کھوکھلا پن تھا اس ہنسی میں۔

اس ہنسی میں بے آواز چیخیں پنہاں تھیں، شکست خوردگی تھی۔

”فوزیہ! میری جان! میری یہ بات یاد رکھنا کہ پسند اور محبت میں بڑا فرق ہے پسند بدل بھی سکتی ہے لیکن محبت کے نقوش ہر حال میں انمٹ ہوتے ہیں۔ اگر اس کے بیچ میں انا آ جائے تو وہ محبت تو نہ ہوئی بہر حال۔“

بہت عزیز سہی اس کو میری دلداری
مگر یہ ہے کہ وہ میرا ہی دل دکھا بھی گیا

”شاید میں رک ہی جاتی لیکن اب قطعی ناممکن ہے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”تم آرام سے جا کر سوؤ فوزی جان! میری فکر نہ کرو میں تو ایسے ایسے کتنے ہی دکھوں کو برداشت کرنے کی عادی ہو چکی ہوں۔ پھر شادی زندگی کی اہم ضرورت بھی نہیں ہے۔ میرے سامنے تو اس سے بڑھ کر کئی اہم مسائل ہیں دعا کرو۔“ اس نے بڑے پیار سے اس کی پیٹھ تھپ تھپائی ”کہ میں اپنی زندگی کے سب سے بڑے اور اہم مقصد کو حاصل کر لوں۔“ اس نے سہارا دے کر فوزیہ کو اٹھایا۔

دونوں خاموش بنا کسی بات چیت کے چلتی ہوئی اندر آ گئیں۔

فوزیہ کو کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اندر آن کر لیٹنے کے بجائے کھڑکی سے ٹک گئی۔ خدا معلوم کب تک نامعلوم سوچوں میں غرق باہر پھیلے اندھیروں کو تکتی رہی۔

کانوں میں فوزیہ کا جملہ گونج رہا تھا۔

”ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔“

”ہنہ...... ناممکن۔“ اس نے اپنا سر سلاخوں پر ٹکا دیا۔

”تو یہ ہو تم منصور رشید احمد خان! ایک مرد جس نے کس آسانی سے بائیس سال کا راستہ کس آسانی سے طے کر کے فیصلہ سنا دیا۔ تم لوگ تو ازل سے دوٹوک فیصلہ کرنے والے لوگ ہو طویل رفاقتیں زندگی بھر کا ساتھ بھی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ واہ اللہ میاں اس جنس کو بھی آپ نے کتنا ناقابل اعتبار بنایا ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ اپنی بے وقوفی سے جس جذبہ کو پتھر کے نقش کی طرح اپنے سینے میں چھپا لوں گی۔ وہی تمہارے نزدیک

ریت کے گھروندے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھے گا۔ ٹھیک ہے منصور احمد خان ایسا ہی ہوتا ہوگا اور اچھا ہی ہوا مجھے بہت پہلے پتا چل گیا ورنہ بلاوجہ ایک جان کا زیاں ہوتا۔ مجھے پریکٹس کرنا ہے اور اس کے لیے گلزار نگر ضرور جاؤں گی لیکن یہ کسی لمحے بھی نہیں بھولوں گی کہ تم، تم کتنے خود غرض ہو، خود پرست ہو۔''

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی مسہری کے قریب آئی کپڑے تبدیل کیے بغیر جوتوں سمیت چپ چاپ لیٹ گئی۔

کتنے اچانک طور پر زندگی کا دھارا پلٹا تھا۔ اسے ہنسی آ گئی۔

''پھر یہ کوئی انہونی بات تو نہیں۔ ایسے خطرناک موڑ تو ہمیشہ ہی میری زندگی میں آئے ہیں۔ اب میرے سامنے صرف ایک مقصد ہوگا جسے یا تو حاصل کر لوں گی یا.....''

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن نیند غائب تھی۔

ذہن پر غیر یقینی خیالات کی یلغار ہو تو نیند کسے آتی ہے۔

☆

صبح ناشتہ کی میز پر نادیہ موجود تھی۔

آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ غیر معمولی طور پر زرد تھا۔

عابدہ بیگم نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی اور دھک سے رہ گئیں۔

رشید احمد غالباً ایک دن پہلے ہونے والی بحث و مباحثہ کو بھول چکے تھے۔ تب ہی اس پر نظر پڑتے ہی حیرانی سے بولے۔

''بیٹی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، تم کمزور لگ رہی ہو۔''

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں پھوپھا حضور!'' وہ مسکرا دی۔

منصور نے بھی ناشتہ کرتے کرتے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ گردن جھکائے خاموشی سے پیالی میں چمچہ چلا رہی تھی۔

چند لمحوں تک وہ بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر توسٹ اور انڈے کی پلیٹ ایک طرف ہٹا کر اس نے آہستہ سے چائے کی پیالی اٹھا لی۔

''بیٹی کچھ کھاؤ بھی تو انڈا یونہی پڑا ہے۔'' خالی چائے پیتے دیکھ کر رشید احمد نے پوچھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے پھوپھا حضور پھر ابھی دو گھنٹہ کا سفر بھی کرنا ہے۔''

اس نے نہایت رسانیت سے اعلان کیا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' وہ قطعی بھول چکے تھے۔

''میں گلزار نگر جا رہی ہوں۔'' اس کا لہجہ بڑا پُرسکون تھا۔

رشید احمد نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ عابدہ بیگم جو چند سیکنڈ پہلے بھتیجی کی ایسی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھ رہی تھیں معاً اس جملے پر ان کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ انہوں نے گھور کر نادیہ کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے نادیہ نے بھی سر اٹھا کر پھوپھی کی طرف دیکھا پھر ان کی قہر آلود نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

''پھوپھی حضور آپ خوشی سے مجھے جانے کی اجازت دے دیں اس لیے کہ.....''

''نادیہ!'' انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تمہیں کسی کی خوشی اور ناخوشی سے کیا سروکار جانا چاہتی ہو جا سکتی ہو لیکن یاد رکھو میرے حکم کے خلاف جا کر اچھا نہیں کرو گی۔''

نادیہ نے سر جھکا لیا۔ اس لمحے وہ کچھ بولی نہیں بولنا بھی نہیں چاہتی تھی مبادا پھوپھی حضور کا غصہ انتہا کو پہنچ جائے۔

''بیگم صاحبہ!'' رشید احمد کو عابدہ بیگم کا سخت لہجہ اور زبردستی پسند نہیں آئی۔ ''اب اس غصے اور ضد کو ختم بھی کیجیے۔ اگر وہ ہاؤس جاب کرنا چاہتی ہے تو کرنے دیجیے۔ یہ بھی تو اس کی پڑھائی کا ایک حصہ ہے۔ ایسا کرنے میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔''

ایک سیکنڈ کے لیے پھوپھا کی حمایت پر نادیہ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے عابدہ بیگم کی آواز نے اسے دوبارہ اسی تلخ ماحول میں لا پھینکا۔

''اس میں کیا برائی ہے کیا نہیں یہ میں جانتی ہوں۔ آپ یہ بات نہیں سمجھ سکتے بہرحال یہ جا سکتی ہیں لیکن یوں جانے کے بعد پھوپھی سے کسی قسم کی توقعات وابستہ نہ رکھیں۔ سمجھ لینا کہ..... میں بھی مر چکی ہوں اور تم..... اپنے معاملات میں آزاد ہو۔''

وہ کھڑی ہو گئی۔ نادیہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

کچھ کہنا چاہا لیکن اس کو بات کرنے کا موقع دیے بغیر ہی وہ کمرے سے جا چکی تھیں۔

رشید احمد دھیرے سے اٹھے۔ نادیہ کے قریب آئے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''تم..... پریشان نہ ہونا بیٹی! تمہاری پھوپھی کا غصہ دیرپا نہیں ہوتا۔ ایک دم بھڑکتی

ہیں اور ایک دم ہی ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

نادیہ نے جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر دھندلکوں میں سے پھوپھا کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

"میں جانتی ہوں پھوپھا حضور...... انہیں...... مجھ سے...... محبت بھی تو بہت ہے۔"

"ہاں...... آں...... بہت زیادہ۔" اور وہ جلدی سے باہر چلے گئے۔

فوزیہ سر جھکائے چپکے چپکے روئے جا رہی تھی۔ نادیہ اپنی جگہ سے اٹھی...... اس کے قریب آئی...... دونوں ہاتھ اس کے گلے میں ڈال کر پیار کرتے ہوئے بولی۔

"پگلی...... اس میں بھلا رونے کی کیا ضرورت ہے۔ پھوپھی حضور مجھ سے ناراض ہو گئی ہیں، تم سے تو نہیں...... تم کوشش کرنا...... تم سے ہمیشہ خوش رہیں۔"

"نادیہ!" منصور چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتار کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "اتنی خود سری کبھی کبھی بڑے تلخ حالات سے دو چار کر دیتی ہے۔ جانے سے پہلے سوچ لو۔ کہیں ساری زندگی پچھتانا نہ پڑے۔"

نادیہ کے ہونٹوں پر بھیگی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"عجیب خوش فہمی تھی کہ...... سب لوگوں کی مخالفتوں کے باوجود صرف تم...... ہر حال میں میرا ساتھ دو گے لیکن......" وہ ہنس پڑی۔ "اپنی بے وقوفی سے ہم جیسے لوگ ہی دوسروں سے غلط توقعات وابستہ کر کے کتنی بڑی چوٹ کھاتے ہیں، ممکن ہے میں غلطی پر ہوں...... ممکن ہے مجھے پچھتانا ہی پڑے۔ اس کے باوجود...... جاتے ہوئے خوش ہوں منصور کہ اس بہانے بہت سوں کی محبت کا بھرم تو کھل گیا۔"

"اپنی غلطی نہیں مانو گی۔ دوسروں کو قصوروار ٹھہراتی رہو گی۔"

"ضدی اور نافرمان جو ٹھہری۔" اس نے طنز کیا۔

"نادیہ!" منصور چلا پڑا۔ "تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو؟ یاد رکھو تمہیں اپنے آپ کو بدلنا پڑے گا اس لیے کہ......"

اس نے منصور کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی جواب دیا۔

"ہاں...... اس لیے کہ اس دنیا میں اس گھرانے کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔"

"اماں جان کو تم سے کتنی محبت ہے۔ اس کا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ جان بوجھ کر

ان کا حکم نہ مان کر جاتی ہو انہیں کتنا دکھ دے رہی ہو۔"

وہ مسکراتی رہی۔ "جانتی ہوں...... یہ بھی کہ یہ محبت تو پھوپھا حضور اور آپ کو بھی ہے لیکن اتنی کمزور کہ ایک جھٹکے ہی سے......"

"تم غلط سمجھیں۔"

"مجھے صحیح سمجھانے کی کوشش بھی مت کیجیے۔"

"میں جانتا ہوں...... پھر بھی اگر کسی کمزور سے رشتے کے ناتے یہ کہوں کہ تم نہ جاؤ تو رک جاؤ گی۔"

"یہی تو دکھ ہے منصور کہ تم میں سے کوئی بھی کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتا۔ اگر ایک سال جاب کر لوں گی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ کون سا ہمارے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا۔ اس کے بعد تو...... پھر یہیں واپس آؤں گی۔ کہیں اور جا بھی کہاں سکتی ہوں۔"

"ایک سال میں حالات بدل بھی سکتے ہیں۔"

"بدلتے ہوئے حالات کو میں روک بھی نہیں سکتی۔ نہ روکنا چاہتی ہوں۔"

"نادیہ! میں بھی بہت ضدی ہوں۔" منصور کا چہرہ غصہ سے سرخ تھا۔

"جانتی ہوں...... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے رسانیت سے پوچھا۔

"صرف اتنا کہ...... وقتی جوش اور ضد میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھا لوں کہ...... ہم دونوں کو زندگی بھر پچھتانا پڑے۔" منصور نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"منصور!" نادیہ نے بڑے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ "مجھے اپنے آپ پر اور اپنے جذبہ کی صداقت پر بھروسہ ہے۔ میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گی کہ پچھتانا پڑے۔" اس نے دھیرے سے منصور کا ہاتھ ہٹا دیا۔ "میں واقعی بہت بری ہوں...... ضدی...... خودسر...... نافرمان...... اس لیے...... ابھی وقت ہے اچھی طرح سوچ لو شاید...... تمہارے لیے مجھ جیسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے اور تم......" وہ جملہ مکمل کیے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔

منصور چند سیکنڈ تک اسے جاتا دیکھتا رہا۔ پھر دھیمے دھیمے قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں آ گیا۔

اسے دکھ بھی تھا اور...... غصہ بھی۔

دکھ اس بات کا کہ نادیہ کے نزدیک اس کا خلوص اور جذبات کتنے غیر اہم ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اسے ان کی سچائی پر یقین ہی نہیں ہے۔

اور غصہ...... کہ آخر وہ اپنی بات منوانے کے لیے دوسروں کی اہمیت کو کیوں نظر انداز کر رہی ہے۔

گھنٹہ بھر بعد...... نادیہ، عابدہ بیگم کو خدا حافظ کہہ کر فوزیہ کے ساتھ جب منصور کے کمرے میں آئی تو وہ چپ چاپ آنکھیں بند کیے کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔

''خدا حافظ......منصور...... میں جا رہی ہوں۔''

لبوں پر مسکراہٹ کے باوجود اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ آنکھوں کے سامنے کہر کا جال سا تن گیا تھا۔ منصور نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

چند سیکنڈ تک شکایت آمیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ نادیہ نے اپنا ٹھنڈا برف جیسا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا...... پھر فوراً ہی مڑ کر کمرے سے باہر آگئی۔ اس نے منصور یا پھوپھا حضور کی گاڑی بھی نہیں لی تھی۔ بلکہ ٹیکسی میں نوکر کے ساتھ گلزار نگر جا رہی تھی۔

عابدہ بیگم دور سے اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی اسے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ان کا دل اتنے شدید غصہ کے باوجود اس کے لیے رو رہا تھا۔ لیکن شاید یہ ان کے بڑے پن کا گھمنڈ تھا یا وہ جھوٹی انا جس نے آگے بڑھ کر بھتیجی کو گلے سے لگانے سے روک لیا تھا۔

نادیہ نے فوزیہ کو بہت سے پیار کیے۔ تسلی دی اور دوپٹہ کے آنچل سے اس کی بھیگی آنکھیں خشک کیں پھر چپ چاپ ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گئی۔

منصور بڑی دیر سے برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ لیکن آگے بڑھ کر خدا حافظ کہنے میں اس کے بیچ بھی کوئی چیز حائل تھی۔ ٹیکسی مڑتے ہی نادیہ کی نظر اس پر پڑی اس نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلایا۔ جواب میں منصور نے بھی جلدی سے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دیا لیکن اتنی دیر میں ٹیکسی گیٹ کے باہر نکل چکی تھی۔

نادیہ نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

''بیرسٹر منصور احمد خان تم نے مجھے بہت مایوس کیا۔ تم نہیں جانتے کہ محبت کے بیچ لین

دین کا سودا نہیں ہوتا۔ یہ تو ایسا کاروبار ہے جس میں سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر ہی بندہ بھڑکتی آگ میں کود پڑتا ہے۔ تم تو اپنی ہر خواہش، ہر حکم کی تکمیل چاہتے تھے جو نادیہ وجاہت علی کے لیے ناممکن ہے۔ یقین مانتا تم سے بچھڑنے کا دکھ نہیں ہے۔ دکھ تو اس رشتہ کی کمزوری کا ہے جو برسوں کی رفاقت کے بعد ایک پل ہی میں ٹوٹ گیا۔''

اسے ہنسی آگئی۔

آنکھیں کھول کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔

اسلام پور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

☆

''کبھی کبھی بزرگانہ وقار، انا اور خودداری میں بھی کتنی بناوٹ اور تصنع ہوتا ہے کہ دلوں میں اٹوٹ محبت ہونے کے باوجود ان کے بیچ ایسی دیوار حائل ہو جاتی ہے جو کبھی ناقابل عبور ہوتی ہے۔ بڑھتے قدموں کو روک دیتی ہے۔ جذبے بڑی حد تک سرد پڑ جاتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا نہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ جھوٹی آن اور عزت و وقار کا یہ ڈھونگ کتنے دلوں کو ڈھا دے گا۔ اعتماد اور بھروسہ کی نازک سی ڈور کسی آسانی سے ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔

عابدہ بیگم کا شمار بھی انہی لوگوں میں تھا جو ماضی کے کھنڈرات پر بڑا فخر کرتے ہیں لیکن حال کی بوسیدہ عمارت کو استوار کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اسلاف کے کارنامے تو قیمتی ورثہ ہوتے ہیں لیکن ان کے اپنے وجود کی کیا حیثیت ہے اس حقیقت سے نظریں چرا لیتے ہیں۔ طمع کے اس جال میں لپٹے ہوئے ایسے لوگ قابل رحم ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہی نہیں کہ دنیا والوں کے نزدیک عالیشان مقبرے قابل تحسین ضرور ہیں لیکن یہ وہ سرمایہ نہیں ہیں جو انسانی زندگی کو خوشیاں اور سکون دے سکے۔

نوابیت کا محل گر چکا تھا۔ ریاست ختم ہو چکی تھی۔ ٹھاٹ باٹ رعب و دبدبہ کب کا رخصت ہو چکا تھا لیکن ان ذہنوں پر گرے ہوئے ایوانوں کا گرد و غبار اس حد تک چھا گیا تھا کہ اصل حقائق معدوم ہو چکے تھے۔

نواب وجاہت علی کی زبان سے نکلا ہوا لفظ پتھر کی لکیر بن سکتا تھا تو عابدہ بیگم بھی انہی کی بہن تھیں۔

نواب وجاہت علی کے حکم کی خلاف ورزی باعث گردن زدنی تھی تو عابدہ بیگم کی حکم

عدولی بھی باعث جلاوطنی ہوسکتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ نواب وجاہت علی ایک بار فیصلہ کر لیتے تو پچھتاتے نہیں تھے۔ لیکن عابدہ بیگم بھتیجی کے خلاف فیصلہ صادر کر کے ٹوٹ کر رہ گئی تھیں۔

نادیہ کے جانے کے کئی روز بعد تک وہ اپنے کمرے میں مقید ہو کر رہ گئی تھیں۔

انہوں نے کمرے سے باہر نکلنا...... گھر کے دوسرے افراد سے بات کرنا تک چھوڑ دیا تھا۔ کھانا اور ناشتہ ان کے حکم کے مطابق ان کے کمرے ہی میں پہنچا دیا جاتا۔

کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کو ان کی مرضی کے خلاف کمرے سے باہر لے آنے کی کوشش کرتا۔ دکھ اور غصہ دونوں نے مل کر انہیں چار دن میں برسوں کا بیمار بنا ڈالا تھا۔ جاتے ہوئے نادیہ کی آنکھوں کے آنسوؤں اور چہرے پر پھیلی ہوئی افسردگی نے انہیں بے کل کر دیا تھا۔ لیکن انا بھی کوئی چیز ہے وہ جوان کے حکم اور مرضی کی پرواہ کیے بغیر چلی گئی تھی اس آگ نے ان کے جسم کو اندر ہی اندر جھلسا دیا تھا۔

چوتھے روز رات کھانے کے بعد جب منصور اپنی سوچوں میں گم چہل قدمی میں مصروف تھا، خادمہ نے ان کو اطلاع دی۔

"بیگم صاحبہ آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔"

"مجھے؟" منصور چونکا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ان گزرے دنوں میں انہوں نے ہر فرد کو اپنے کمرے میں آنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔

اس نے سگریٹ بجھائی۔ اور اس غیر متوقع بلاوے پر سوچتا ہوا ان کے کمرے تک پہنچ گیا۔

"میں...... اندر آ سکتا ہوں...... اماں جان؟" اس نے دروازے پر رک کر اجازت طلب کی۔

"ہاں...... آ جاؤ۔" عابدہ بیگم اپنے تخت پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔

منصور نے بغور ان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ بے حد کمزور اور زرد نظر آ رہی تھیں۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ ٹھیک تو ہیں؟" وہ ان کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔

"ہاں...... ٹھیک ہوں۔" روکھا سا جواب ملا۔

منصور خاموش رہا۔ وہ بھی چند لمحوں تک چپ چاپ بیٹھی کچھ سوچتی رہیں۔ کوئی فیصلہ کرتی رہیں...... پھر نہایت ٹھہرے ہوئے اور فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

"منصور! میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ...... آئندہ اس گھر میں نادیہ کا نام نہ سنوں۔"

"اماں...... جان!" منصور حیران رہ گیا۔

معمولی سی بات...... ننھا سا تنازعہ اتنی خوفناک شکل اختیار کر لے گا اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔ اماں جان کا یہ غلط فیصلہ کس حد تک خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یوں اس کو دیکھے بنا جی سکیں گی۔ انہیں تو اپنی اس بھتیجی سے غیر معمولی محبت ہے۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ نادیہ کی جیتی جاگتی ہستی کو وہ یوں ہمیشہ کے لیے اپنے صفحہ زندگی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیں۔

کیا بڑوں کی محبتیں اتنی ناپائیدار اور کھوکھلی ہوتی ہیں کہ ذرا سی نافرمانی انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔

منصور کی سوالیہ نظریں عابدہ بیگم کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"اور...... یہ...... کہ......" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ پھر بولیں۔ "میں نے اپنی مرضی اور خوشی سے جو رشتہ نادیہ کے ساتھ قائم کیا تھا اسے...... اب ختم کر دیا ہے...... اس لیے کہ...... منصور میاں مجھے ایک سعادت مند بہو چاہیے۔ خودسر اور نافرمان ڈاکٹر کی میرے یہاں جگہ نہیں ہے۔"

"اماں...... جان......" منصور بے چین ہو اٹھا۔

یہ...... کیسا یک طرفہ فیصلہ تھا۔ ہم کپڑوں کے گڈے گڑیا تو نہیں ہیں جب چاہا بیاہ رچا لیا اور جب چاہا توڑ پھوڑ ڈالا۔

اسے بھی نادیہ پر غصہ تھا۔ اسے بھی اس کے یوں اپنی مرضی سے چلے جانے پر تاسف تھا لیکن...... ایسا بھی نہیں کہ...... ہمیشہ ہی کے لیے کھو دے...... "یہ...... یہ ناممکن ہے۔"

"گستاخی معاف...... اماں جان!" وہ بڑے سنبھلے انداز میں گویا ہوا۔ "اس نے اتنا بڑا گناہ بھی نہیں کیا ہے۔ جس کی اتنی سخت سزا دی جائے۔"

"یہ...... ناقابل معافی گناہ ہی ہے منصور!...... ہمارے خاندان میں...... کبھی ایسا نہیں ہوا کہ چھوٹوں کی...... "نہیں" اور ان کی ہٹ دھرمی برداشت کی جائے۔"

"وہ...... زمانہ گزر چکا ہے۔"

"وہ...... لوگ تو موجود ہیں...... ابھی مرے نہیں۔"

"زمانے...... وقت اور حالات کے ساتھ ان لوگوں کو بھی بدلنا پڑے گا۔"

''منصور......'' عابدہ بیگم کی آواز میں سرزنش تھی۔

''مجھے تمہاری دلیلوں...... اور بحث کی ضرورت نہیں میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میرے نزدیک...... بلکہ یہ فیصلہ ہے کہ تمہارے لیے اب نادیہ سے کہیں زیادہ نیک اور سمجھدار...... فوزیہ موجود ہے۔ میں اسے اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔''

''خدا...... کے لیے...... اماں جان۔'' منصور تڑپ اٹھا۔ ''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ ویسے آپ نے اگر یہ رشتہ جو بقول آپ کے آپ کی خوشی اور مرضی سے قائم ہوا تھا آپ ہی کی مرضی سے ختم ہو گیا ہے......تو...... ممکن ہے آپ نے ٹھیک کیا ہو گا لیکن اماں جان...... میری اس جرأت اور نافرمانی پر معاف کر دیجیے گا۔ کہ مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں...... کیونکہ...... اس رسمی رشتے کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی ہم دونوں کے درمیان جو اٹوٹ رشتہ قائم ہے۔ وہ کبھی بھی...... کسی حال میں بھی توڑا نہیں جا سکتا۔ اس کی بنیاد ہمارے بچپن میں پڑی تھی۔ اور اب...... نادیہ میری زندگی ہے۔''

''منصور!'' عابدہ بیگم کا چہرہ غیر معمولی طور پر آگ کی طرح تپ اٹھا تھا۔ ان کی آواز کی طرح جسم میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

''اگر...... یہ میری خطا اور نافرمانی ہے تو سزا کے لیے حاضر ہوں۔''

منصور نے ان کے نزدیک آ کر سر جھکا دیا۔

عابدہ بیگم پتھر کی طرح ساکت چند لمحوں تک اس کے جھکے سر کو تکتی رہیں۔

پھر اسی پر وقار لہجہ میں حکم دیا۔

''جاؤ...... اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔''

منصور نے گردن اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

وہ گاؤ تکیے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی تھیں۔

منصور نے جھک کر ان کی پیشانی چومی اور باہر آ گیا۔

☆

ذہنی تفکرات...... بے شمار الجھنوں اور دکھوں سے نجات پانا ہو تو بندہ اپنے آپ کو اس حد تک مصروف کر لے کہ دن اور رات میں امتیاز نہ کر سکے۔ ہر خواہش فراموش کر دے، ہر تصور مٹا دے، ہر تمنا کو زندہ دفن کر دے۔ یہاں تک کہ خود اپنے آپ کو بھی بھلا دے۔ تب

کہیں جا کر سکون کی اس منزل تک پہنچتا ہے جہاں زندگی محض زندہ رہنے اور سانس لینے کا نام بن جاتی ہے۔

اسلام پور سے آنے کے بعد یہی کچھ نادیہ نے بھی کیا تھا۔

اس کی زندگی کے معمولات میں فرق آ گیا تھا۔ حالات بدل چکے تھے۔ اس کے ساتھ اس نے اپنا آپ بھی بدل لیا تھا۔ اب زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ ہسپتال اور دکھی انسانوں کی خدمت...... بیمار...... پژمردہ اور زندگی سے ہارے ہوئے انسانوں کو حوصلہ دینے کے لیے اسے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے، تب کہیں جا کر دس میں سے ایک چہرے پر تروتازگی کی ہلکی سی رونق نظر آتی۔ یہی اس کی کامیابی تھی۔

اپنے آرام کے لیے بمشکل ایک گھنٹہ نکال پاتی۔ وہ بھی اس طرح کہ اوور آل اور جوتے پہنے پہنے ہی وہ ذرا کی ذرا مسہری پر ٹکتی، جلتی ہوئی آنکھوں کو سکون دینے کے لیے بند کرتی تو سامنے پھوپھی حضور کا غضب ناک چہرہ آ جاتا...... ساتھ ہی منصور کی شکایت آمیز بے گانی نظریں پھر سب سے زیادہ جان لیوا فوزیہ کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں...... اسے بے چین کر دیتیں۔ وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ پھر خود بھی بستر چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی۔

بکھرے ہوئے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اسٹیتھوسکوپ ہاتھ میں لیے دوبارہ راؤنڈ پر نکل جاتی۔ یوں چار ماہ گزر چکے تھے۔

اس عرصہ میں اسلام پور سے کسی نے بھی تو اسے یاد نہیں کیا تھا۔

پھوپھی حضور کے ساتھ ساتھ فوزیہ اور منصور تک نے اسے یکلخت فراموش کر دیا تھا۔

اس نے پھوپھی اور منصور کی بات نہ مان کر بہت بڑا جرم کیا تھا نا۔ شاید اسی لیے وہ اس سزا کی مستحق تھی۔ ایک بار اس نے فون کرنا چاہا تو نمبر نہیں ملا دوسری بار نمبر ملا تو نادیہ کا نام سنتے ہی کسی نے ریسیور پٹخ دیا۔

وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ قریب پڑی آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

''چلو...... یہ بھی ٹھیک ہے۔'' ہونٹوں پر شکست خوردہ مسکراہٹ تھی۔

''وہ لوگ سمجھ لیں...... نادیہ مر چکی ہے۔''

اور تب ہی سے اس نے اسلام پور کا نام تک لینا چھوڑ دیا تھا۔

اکثر فوزیہ یاد آتی۔ آنکھیں دھندلا جاتیں۔ دل کے اندر کوئی چیز ڈوبتی اور ٹوٹتی ہوئی

محسوس ہوتی۔ تو آنکھیں بند کر کے صرف دعا مانگ لیتی۔

"خدا کرے تم پھوپھی حضور کے پاس ہمیشہ خوش رہو۔ میرا کیا ہے کسی نہ کسی طرح جی کر خوش رہنا سیکھ ہی لوں گی۔"

منصور کی یاد کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر شکست خوردہ مسکراہٹ پھیل جاتی۔

"تم...... بھلا اس جذبہ کی قدر کیا جانو منصور احمد خان! اس کی جڑیں تو اب اتنی گہرائی تک جا چکی ہیں کہ میں اکھاڑنا بھی چاہوں تو نہیں اکھاڑ سکتی۔ مجھے معلوم ہے تم بہت خفا ہو...... اور بقول تمہارے...... تمہیں کھو کر ممکن ہے ساری زندگی پچھتاؤں...... لیکن اگر پچھتانا بھی پڑا تو شکایت نہیں کروں گی کہ میں نے تو زندگی میں پچھتانا سیکھا ہی نہیں صرف تلخ حقائق کا مقابلہ کرنا سیکھا ہے۔ سو اب بھی تمہارے تصور اور تلخیوں کے امرت کے سہارے بقیہ زندگی بھی گزار لوں گی۔ ویسے تمہیں ضرور یاد ہوگا تم جو اکثر یہ کہہ کر مجھے چھیڑا کرتے تھے۔ نادیہ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تمہاری قسمت اماوس کی رات کی طرح سیاہ اور ڈراؤنی ہے تو...... منصور...... اب مجھے یقین آ گیا۔ سچ ہے نادیہ وجاہت علی کی زندگی میں پونم کی رات کہاں سے آ سکتی ہے۔ کیسے آئے گی۔

وہ راؤنڈ پر تھی کہ نرس نے بتایا ڈاکٹر عامر کاریڈور میں آپ کے منتظر ہیں مریضوں سے نمٹ کر باہر آئی تو عامر ٹہل رہا تھا۔

"اف ڈاکٹر نادیہ...... کب سے آپ کی تلاش ہو رہی تھی۔ نرس کو سختی سے ہدایت دی تھی کہ آپ جہاں بھی ہیں فوراً آئیں اور آپ ہیں کہ گھنٹہ بھر بعد آ رہی ہیں۔"

"سوری ڈاکٹر عامر...... مجھے دیر ہو گئی ہو گی لیکن...... جنرل وارڈ کے مریضوں کو دیکھنا بھی...... بہت اہم ہے۔"

"خیر...... خیر...... وہ تو مجھے معلوم تھا کہ آپ جنرل وارڈ کا راؤنڈ لیے بغیر آ ہی نہیں سکتیں۔"

"پھر...... تاخیر ہوئی تو...... وجہ تاخیر...... بلاوجہ تو نہیں تھی۔"

ڈاکٹر عامر کو ہنسی آ گئی۔ "آپ سے جیتنا مشکل ہے۔ دراصل مس نادیہ آدھ گھنٹہ سے زیادہ ہوا میرے پاس سرجن شوکت کا فون آیا تھا کہ میں اور آپ، دونوں فوری طور پر آپریشن تھیٹر پہنچیں۔ ایمرجنسی ہے کسی مریض کا بہت سیریس اور فوری آپریشن کرنا ہے۔"

"تب تو...... سرجن شوکت اب تک خفگی کی آخری ڈگری پر ہوں گے۔ جلدی بھاگیں۔" دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے آپریشن تھیٹر میں آ گئے۔

سرجن شوکت نے پلٹ کر دونوں کو دیکھا...... پھر گھڑی پر ایک نظر ڈال کر تیز لہجہ میں بولے۔

"ایمرجنسی تھی...... اور آپ دونوں پون گھنٹہ بعد تشریف لا رہے ہیں۔"

"سوری ڈاکٹر......" نادیہ نے سر جھکا کر معذرت کی۔

سرجن شوکت دوبارہ آپریشن میں مصروف ہو گئے۔ نادیہ اور ڈاکٹر عامر تیار ہو کر آپریشن ٹیبل پر آ گئے...... نادیہ نے جھک کر مریض کے چہرے پر نظر ڈالی۔

وہ ایک ضعیف العمر عورت تھی۔ پیٹ کا آپریشن تھا۔ دوسرے ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ کینسر ہے لیکن سرجن شوکت مصر تھے معمولی پھوڑا ہے۔ آپریشن کے بعد ٹھیک ہو جائے گا اسی لیے انہوں نے وقت ضائع کیے بغیر مریضہ کو فوراً داخل کر کے آپریشن کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ دو گھنٹہ مسلسل آپریشن کرنے کے بعد سرجن شوکت ہٹ گئے۔ نادیہ اور ڈاکٹر عامر نے ٹانکے لگائے۔ پٹیاں باندھیں اور مریضہ کو چادر سے ڈھانپ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔

مریضہ بدستور بے ہوش تھی۔ تھیٹر سے باہر آتے ہی نادیہ چائے پینے کے لیے ڈیوٹی روم کی طرف ہو لی۔

ڈاکٹر عامر کے باہر آتے ہی دروازے کے باہر بیٹھے بوڑھے نے روک لیا۔ غالباً وہ مریضہ کے ساتھ آیا تھا۔

"ڈاکٹر جی...... اب وہ کیسی ہیں؟" لہجہ میں بڑی بے چارگی تھی۔

"آپ فکر نہ کریں بابا جی...... وہ ٹھیک ہیں۔ آپریشن ہو چکا ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی ہوش میں آ جائیں گی۔"

"کیا میں...... انہیں ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟" وہ گڑگڑایا۔

"مجھے افسوس ہے۔ ہاں کل آپ ان سے مل سکیں گے۔" عامر نے معذوری ظاہر کی۔

"بہت...... بہتر۔" بوڑھا وہیں کمرے کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر عامر نے ایک سیکنڈ کے لیے کچھ سوچا...... کچھ سوچنا چاہا...... لیکن بات کیے بغیر ہی اپنے کمرے میں آ گئے۔

☆

تمام دن کی مصروفیات اور بھاگ دوڑ کے بعد جب رات گئے وہ اپنے کمرے میں آئی تو مریم سو چکی تھی۔

"بے ایمان...... میرا انتظار کیے بغیر ہی سو گئی۔" نادیہ بڑبڑائی۔ پھر کوٹ اتارا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ منہ دھو کر لیٹنے ہی جا رہی تھی کہ سامنے میز پر پڑے لفافے پر نظر پڑتے ہی اس نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔ لکھنے والے کے نام پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ہونٹوں پر مسرت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن جیسے جیسے خط کا مضمون پڑھتی گئی۔ ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئی۔ خوشی سے کھلتی آنکھیں دھندلا گئیں چہرے پر پھیلی سرخ رنگت زردیوں میں بدل گئی۔ اس کے باوجود اس نے وہیں کھڑے کھڑے ہی بڑے سکون و اطمینان سے پورا خط ختم کیا۔ پرچہ لفافے میں دوبارہ رکھ دیا اور خاموش گم سم سی سر جھکائے دھیرے دھیرے چلتی مسہری پر آن کر بیٹھ گئی۔

"ہوں...... تو یہ بھی ہونا تھا۔" اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔

فوزیہ نے لکھا تھا۔

"آپی...... خوش رہیے!

چار ماہ بعد شدید انتظار کے بعد جب مایوسیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں تب یہ خط آپ کو لکھ رہی ہوں۔ ورنہ میں تو اپنی نا سمجھی سے یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ امی حضور کے بعد جو جگہ آپ نے لی ہے اس کے ناتے خواہ کچھ بھی ہو جائے دنیا والے کچھ بھی کہیں آپ تو کم از کم مجھے یوں فراموش کر کے نہ بیٹھ جائیں گی لیکن میں بھی کتنی بے وقوف ہوں آپی کہ یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ آپ کو کسی کی کیا پرواہ، نہ کسی کی ناراضگی کی نہ کسی کی محبت کی۔ آپ کو تو محض اپنی ذات اور اپنے اصولوں سے پیار ہے۔ مانا کہ پھوپھی حضور نے آپ سے سختی کا برتاؤ کیا۔ یہ بھی مانا کہ وہ آپ سے بے حد خفا تھیں اور اب بھی ہیں لیکن آپی! اگر اس وقت ان کا مان رکھ کر حکم عدولی نہ کرتیں اور صرف ایک دن کو رک جاتیں تو آپ کا کون سا نقصان ہو جاتا۔ ہاں پھوپھی حضور کی بات ضرور رہ جاتی۔ ان کا بھرم تو نہ ٹوٹتا۔ پر آپ کو ان چیزوں سے کیا سروکار۔

یاد ہے آپ کو گئے ہوئے کتنے مہینے گزر چکے ہیں اس عرصہ میں پھوپھی

حضور کو خط نہ لکھتیں لیکن کیا آپ یہ بھول گئیں کہ میں بھی تو اس گھر میں موجود ہوں جسے ماں باپ کے بعد آپ کی ضرورت ہے۔ آپی...... یہ شکایت نہیں بلکہ یاد دہانی ہے کہ آپ وہاں کی دلچسپیوں میں مگن ہو کر کہیں یہ نہ بھول بیٹھیں کہ آپ کی ایک بہن ابھی زندہ ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا کرے وہ دن جلد آئے جب آپ گلزار ہسپتال کی بہت بڑی اور کامیاب ڈاکٹر بن جائیں۔ لوگ آپ کو محبت، عزت و احترام کے ساتھ یاد کریں۔ لیکن یہ نہ بھولیے آپی! کہ دنیا بھر کی دولت...... بے پناہ عزت و شہرت بھی آپ کو وہ سکون اور مسرت نہیں دے سکتی جو اپنوں میں رہ کر اپنوں کے پیار میں مل سکتی ہے۔ یہ خط اس امید پر نہیں لکھ رہی ہوں کہ جواب دیں۔ اپنے قیمتی وقت میں سے ایک لمحہ ضائع کر کے اگر پڑھ ہی لیں گی تو میرے لیے خوشی کا باعث ہو گا۔ منصور بھائی ایک سال کے لیے انگلینڈ چلے گئے ہیں۔"

آپ کی فوزیہ

لفافہ مٹھی میں دبائے وہ تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

بنا کسی سوچ اور بنا کسی خیال کے وہ چپ چاپ پڑی۔ آنکھیں کھولے چھت کو تکے جا رہی تھی۔ فوزیہ کا خط ایک ایسا تازیانہ تھا جس کی چوٹ کھا کر اس کا دل ٹوٹ تو سکتا تھا لیکن پگھل کر آنکھوں کی راہ بہہ جانا بڑا مشکل تھا۔

کوئی دھیرے دھیرے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہ خیال اور سوچ کی دنیا سے واپس پلٹ آئی۔

"کون...... ہے۔" اس وقت یہ مداخلت سخت ناگوار گزری۔

"ڈاکٹر...... نادیہ!" دروازے پر غالباً ڈیوٹی نرس تھی۔

"جس مریضہ کا آپریشن ہوا تھا۔ اس وقت اس کی حالت بہت خراب ہے۔"

نادیہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"تو میں کیا کروں...... کسی اور ڈاکٹر سے کہو جا کر...... میں اس وقت نہیں آ سکتی۔"

نرس حیران رہ گئی۔ ڈاکٹر نادیہ پہلے تو کبھی اتنی تلخ نہیں ہوئی تھی۔ نرس نے ذرا توقف کیا پھر واپس پلٹ گئی۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد نادیہ نے گردن موڑ کر دروازے

کی طرف دیکھا۔ اسے یقین تھا وہ ساتھ چلنے پر اصرار کرے گی لیکن وہ اس کا تلخ جواب سن کر جا چکی تھی۔

"ہنہ..... چلی جائے۔ میں جیسے اس کام کے لیے رہ گئی ہوں۔ اس ہسپتال میں اتنے ڈاکٹر موجود ہیں کوئی اور جا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میری بلا سے..... کوئی مرتا ہے..... تو....." جملہ پورا کیے بغیر ہی وہ رک گئی۔ آخری الفاظ جیسے حلق میں اٹک کر رہ گئے تھے۔

"اللہ..... مجھے معاف کرے۔" وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یہ تو میرا فرض ہے۔ پھر کون جانے وہ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے اور کسی کے لیے اس کی زندگی قیمتی ہو۔" فوزیہ کا خط تکیے کے نیچے رکھ کر وہ کھڑی ہو گئی کوٹ پہن کر اسٹیتھسکوپ گلے میں ڈال کر تیز تیز قدم اٹھاتی جنرل وارڈ کی طرف ہو لی جب نادیہ وارڈ میں داخل ہوئی تو ڈاکٹر عامر جھکے ہوئے مریضہ کا معائنہ کر رہے تھے۔ ایک ثانیہ کے لیے نادیہ کے قدم رکے۔ اسے ندامت سی ہوئی، پھر نپے تلے قدم اٹھاتی وہ بیڈ کے قریب آئی۔ مریضہ کا چہرہ خوفناک حد تک سفید ہو رہا تھا۔ سانس کی رفتار بگڑی ہوئی تھی۔ آہٹ پر ڈاکٹر عامر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کوئی امید نہیں..... خدا رحم کرے۔" نبض پر سے ہاتھ ہٹا کر وہ الگ کھڑا ہو گیا۔

"ڈاکٹر..... نادیہ....." کچھ سوچ کر تیزی سے پلٹا۔ "آپ..... یہ انجکشن لگائیں..... یہ ہماری آخری کوشش ہے۔ میں خون کا انتظام کر کے ابھی آیا۔" اس کے جاتے ہی نادیہ نے بڑی تیزی سے انجکشن تیار کر کے لگایا۔ پھر دوا کے چند قطرے پیالی میں ڈال کر قطرہ قطرہ اس کے حلق میں ٹپکانے لگی۔ آدھ گھنٹہ بعد ہی ڈاکٹر عامر تقریباً بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ساتھ ہی وارڈ بوائے خون کی بوتلیں لیے ہوئے تھا۔ عامر نے ایک اور انجکشن لگایا..... اسٹینڈ پر خون کی بوتل لٹکا کر..... ڈرپ لگا دی۔

کچھ دیر تک دونوں خاموش کھڑے خون کے قطروں کی بوند بوند اس کے جسم میں داخل ہوتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر عامر قریب کھڑی نرس سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سسٹر! جب تک خون دیا جا رہا ہے تم..... یہیں..... ان کے پاس رہو گی۔"

"بہتر ہے..... ڈاکٹر۔"

"نہیں ڈاکٹر عامر..... میں واچ کروں گی۔ یہاں میری ضرورت ہے۔ سسٹر کو اور بھی

کئی کام ہوں گے۔"

"لیکن..... آپ..... کیسے؟" عامر نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔" نادیہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور بیڈ کے قریب پڑی چھوٹی سی بنچ پر بیٹھ گئی۔

"کون جانے ان کی حالت کب بگڑنے لگے۔ ڈاکٹر کے آنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ ڈرپ ختم ہونے تک میں یہیں رہوں گی۔ مجھے ان کی حالت ٹھیک نہیں لگتی ہے۔"

"لیکن..... ڈاکٹر نادیہ۔" عامر نے کچھ کہنا چاہا۔ اس نے بات کاٹ دی۔

"آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ دراصل میں عادت سے مجبور ہوں۔ کسی بھی مریض کو اس نازک حالت میں چھوڑ کر خود آرام سے سو بھی نہیں سکتی۔"

"تو یوں کریں۔ آرام کرسی ڈلوا لیں۔ اس بنچ پر تو رات نہیں گزر سکتی۔"

"شکریہ ڈاکٹر..... ٹھیک ہے کرسی بھجوا دیں۔" عامر چلا گیا۔

اور نادیہ نے تمام رات وہیں کرسی پر بیٹھ کر گزار دی۔ صبح آٹھ بجے بوتل ختم ہونے پر اس نے نڈل نکال کر نبض دیکھی۔ تفصیلی معائنہ کیا۔ حالت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ نرس کو ضروری ہدایات دے رہی تھی کہ مریضہ نے آنکھیں کھول دیں۔

نادیہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

"خدا کا شکر ہے۔ آپ ہوش میں آ گئیں۔ کیسی طبیعت ہے۔ اب آپ کی؟" نادیہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر رسانیت سے پوچھا۔

"اچھی..... ہوں۔" نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

نادیہ نے میز پر سے فیڈر اٹھایا۔ اس میں تھوڑا دودھ ڈال کر گلوکوز ملایا اور قریب آن کر بولی۔ "یہ پی لیجیے۔ بہت ضروری ہے۔"

مریضہ نے بغیر کسی پس و پیش کے منہ کھول دیا۔ نادیہ نے بہت آہستہ آہستہ سارا دودھ اسے پلا دیا۔

"سسٹر! اب انہیں دوا دے دینا۔ ان شاء اللہ یہ دن بھر آرام سے سوتی رہیں گی۔"

اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے گھڑی دیکھی۔ راؤنڈ کا وقت ہو چکا تھا۔

وہ دوسرے مریضوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ آخری بیڈ کے مریض کا حال پوچھ رہی تھی

کہ ڈاکٹر عامر سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

"ڈاکٹر نادیہ......" عامر نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ سے کس نے کہا تھا کہ راؤنڈ پر آئیں۔"

"اس وقت میری ڈیوٹی تھی۔"

"مائی گاڈ......آپ ضرورت سے زیادہ ہی فرض شناس ہیں۔ اب ہوگئی فرض شناسی۔ خاموشی سے کمرے میں تشریف لے جائیں۔ میں بھی تھوڑا بہت فرض شناس ضرور ہوں۔ انکار سننے کا عادی بھی نہیں ہوں۔"

وہ مسکرا دی۔ "اس طرح آنکھیں نکال کر تو نہ گھوریں۔ میں اب کمرے ہی میں جا رہی تھی۔"

"وہ میں...... جانتا ہوں۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اچھا......میرے ساتھ آیئے۔" عامر نے حکم دیا۔ جیسے اسے اعتبار نہ ہو۔

نادیہ خاموشی سے ساتھ ہو لی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ نوکر سے گرم گرم چائے منگوائی اور اپنے ہاتھ سے ایک پیالی بنا کر سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"فرض شناس ڈاکٹر صاحبہ! یہ گرم گرم چائے پیجئے اور جا کر آرام سے سو جایئے۔ کل صبح سے پہلے آپ کو وارڈ میں نہ دیکھوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "اتنی سختی۔"

"آپ جیسوں کے ساتھ ایسی ہی سختی کرنے کی ضرورت ہے۔" جب تک نادیہ چائے پیتی رہی عامر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

چائے ختم کر کے وہ کھڑی ہوگئی۔ "چائے پلانے کا بے حد شکریہ ڈاکٹر عامر!"

"آیئے چلیں۔" دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔

"میں چلی جاؤں گی۔ آپ یقین رکھیں۔"

"اوہنہ......کمرے کے اندر پہنچا کر ہی ڈیوٹی پر جاؤں گا۔"

کمرے کے دروازے ہی پر مریم مل گئی۔

"ارے آپ دونوں اتنی پٹی پٹائی شکلیں لیے کہاں سے آ رہے ہو۔"

"آپ کی دوست کو خدمت خلق کا مالخولیا ہوگیا ہے۔ تمام رات بیڈ نمبر 8 کی خاطر

جاگتی رہی ہیں۔ ان کے لیے سونا بے حد ضروری ہے۔ اسی لیے کمرے کے اندر دھکیل کر ہی جاؤں گا۔" مریم ہنس پڑی۔

"لگ تو ایسا رہا ہے جیسے آپ انہیں تھپک تھپک کر سلانے جا رہے ہوں۔"

نادیہ کا چہرہ لال پڑ گیا۔ ڈاکٹر عامر بھی جھینپ سا گیا۔

"اللہ حافظ ڈاکٹر عامر...... آپ تو جانتے ہیں مریم کی زبان کا ٹانکا ٹوٹ چکا ہے۔" اور جلدی سے اندر آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے مریم بھی اندر آ گئی۔

"یہ بات ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر نادیہ صاحبہ...... بے چارہ کہیں کا نہیں رہے گا۔" مریم نے ڈانٹا۔

"فضول باتوں کے لیے تمہارا ذہن بڑا شارپ ہے۔"

"یہ فضول باتیں ہیں۔ ارے لڑکی اگر منصور بھائی کو پتا چل گیا نا تو تمہارے ساتھ اس غریب ڈاکٹر کا بھی گلا دبا دیں گے۔ وہ بے چارہ مفت میں مارا جائے گا۔"

نادیہ نے کوٹ اتارتے ہوئے مڑ کر مریم کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ اس نے سوچا۔

'مریم کو بھلا کیا معلوم کہ حالات کتنے بدل چکے ہیں۔ پھوپھی حضور اس قدر سخت خفا ہیں کہ نام سننا بھی گوارا نہیں کرتیں۔ فوزیہ کو مجھ سے بے شمار شکایات ہیں اور......منصور ایک سال کے لیے انگلینڈ چلا گیا ہے۔'

"اچھا......تم یہاں سے دفعان ہو۔ میں سونے جا رہی ہوں۔ جانتی ہو ساری رات کرسی پر بیٹھ کر گزاری ہے۔"

"تو سویئے مہارانی جی...... خدمت خلق کا تو بڑا شوق ہے۔ حوصلہ نہیں ہے۔"

وہ اپنا اسٹیتھسکوپ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

نادیہ نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گئی۔

☆

طوفان اتنا شدید اور غضبناک تھا کہ بڑے بڑے درخت جڑوں سے اکھڑے جا رہے تھے۔ بجلی چمکتی تو دن کا گمان ہونے لگتا اور بادلوں کی گرج سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بیک وقت کئی آتش فشاں پھٹ پڑے ہوں۔ ایسا ہی طوفان سرخ حویلی میں بھی آیا ہوا تھا۔ اس طوفان کی آمد اس رات کی مرہون منت نہیں تھی بلکہ اس نے تو عرصہ چھ ماہ سے

اسی جگہ ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔

اکثر ایسے خاموش طوفان زیادہ ہی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

سرد جنگوں میں لوگوں کی زندہ لاشیں نظر آتی ہیں اور نہ نظر آنے والی آگ بڑے دھیرے سے ان سے جلا کر سب کچھ راکھ کر دیتی ہے۔

عابدہ بیگم نماز پڑھ کر وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔

نوکر چند منٹ قبل ہی اوولٹین کا گلاس رکھ کر گیا تھا۔

سونے سے پہلے حسب عادت اس طوفانی رات میں بھی فوزیہ انہیں شب بخیر کہنے آئی تو انہوں نے اس کی طرف دیکھے بنا ہی سر کے اشارے سے جواب دے دیا۔

فوزیہ الٹے قدموں واپس آ گئی۔

آج کی نئی بات نہ تھی۔ انہوں نے اسی روز اس سے لاتعلقی کا اظہار شروع کر دیا تھا جب سے نادیہ ان کی مرضی کے خلاف گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

"لیکن بھلا اس میں میرا کیا قصور۔" وہ اکثر سوچتی۔

رشید احمد نے بھی کئی بار عابدہ بیگم کو سمجھانا چاہا لیکن انہوں نے تو جیسے اس موضوع پر گفتگو ہی نہ کرنے کی قسم کھالی تھی۔ نادیہ کے متعلق بات کرنا تو کجا وہ اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی تھیں۔

منصور انگلینڈ جا چکا تھا۔

اور یہ چوٹ نادیہ کی نافرمانی سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ منصور کے جانے کا سبب بھی نادیہ ہے۔ اس یقین نے انہیں اور زیادہ شدید غم و غصہ میں مبتلا کر دیا تھا۔

اب اس کی سزا فوزیہ بھگت رہی تھی۔ نازلی ہوتی تو اس سے باتیں کر کے دل کی بھڑاس نکال لیتی۔ لیکن وہ بھی شہر سے دور اپنے ہی جھگڑوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ نادیہ نے جانے کے بعد پلٹ کر خبر بھی نہیں لی تھی۔ منصور کو گئے ہوئے پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ اس عرصہ میں اس نے صرف ایک خط اپنے پہنچنے کا بھیجا تھا اس کے بعد سے وہ بھی مفقود الخبر تھا۔ نادیہ حرف غلط کی طرح اس گھر سے مٹا دی گئی تھی۔

ایک صبح ناشتے کی میز پر پژمردہ زرد زرد چہرے کو دیکھ کر رشید احمد کا دل دکھ گیا۔ وہ

عابدہ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"میں دوپہر گاڑی بھجوا دوں گا۔ آپ فوزیہ کو گلزار نگر جانے دیں۔"

عابدہ بیگم ٹوسٹ کھاتے کھاتے رک گئیں۔ نظریں اٹھا کر فوزیہ کی طرف دیکھا پھر رشید احمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"نہیں..... فوزیہ نہیں جائے گی۔ اگر وہ ہم سب سے دور ہی رہنا چاہتی ہے تو رہنے دیں۔ ہم بھی دیکھیں گے کہ اپنوں سے الگ رہ کر کتنے دن خوش اور مطمئن رہ سکتی ہے۔"

"بیگم!" رشید احمد بے حد سنجیدہ تھے۔ "میں نے کتنی بار آپ کو سمجھایا ہے کہ آپ کا یہ غصہ اور ضد بیکار ہے۔ پھر وہ بات جو اپنی حد سے تجاوز کر جائے اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ آپ نے تو اس کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ حالانکہ آپ جانتی ہیں وہ محض اپنے شوق اور پیشے کی خاطر....."

"اس ذکر کو آپ یہیں ختم کر دیں تو بہتر ہے۔" عابدہ بیگم نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ہم فقیر نہیں ہیں جو پیشوں کو اتنی اہمیت دینے لگیں۔"

"ہم بادشاہ بھی نہیں ہیں کہ شاہوں کا سا جاہ و جلال اختیار کر لیں۔" رشید احمد کو بھی غصہ آ گیا تھا۔

"نہ سہی..... لیکن یہ ہمارے خاندانی وقار کے خلاف تو ہے کہ وہ اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کے ساتھ نوکری کرے۔"

رشید احمد نے آہستگی سے پیالی پرچ میں رکھی اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

"یہ تو آپ بخوبی جانتی ہیں کہ نوابیت سے ناتہ ٹوٹ چکا ہے۔ پھر جھوٹی شان دکھانے سے فائدہ۔"

"اقتدار چھن جانے سے اصلیت تو نہیں بدل جاتی۔ نوابیت کا خون تو ہماری رگوں میں موجود ہے۔" عابدہ بیگم نے پیالی پٹخ دی۔ "ہم میں اب بھی اتنا دم خم ہے کہ ہزاروں کی پرورش کر سکتے ہیں۔"

"گستاخی معاف۔" رشید احمد نہایت سنجیدہ تھے۔ "پرورش کرنے والے نہایت منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ ان کی زبان میں نرمی ہوتی ہے۔ معاف کر دینے کا حوصلہ ہوتا ہے اور مجھ سے زیادہ تو آپ جانتی ہیں کہ بندے کی یہی ادا تو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔"

"کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ...... یہ میرا...... میرے بھائی اور بھتیجی کا مسئلہ ہے۔ میں اس کو حل کرنا آپ سے زیادہ بہتر طور پر جانتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئیں۔

رشید احمد خود بھی کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی فوزیہ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"بی بی...... تمہاری پھوپھی حضور بڑی ضدی ہیں۔ شاہی خاندان سے تعلق ہے نا اس لیے غصہ بھی زیادہ ہی ہے۔ تم رنجیدہ نہ ہونا کسی دن موقع ملتے ہی تمہیں میں خود نادیہ سے ملا کر لاؤں گا۔"

فوزیہ مسکرا دی۔

"نہیں پھوپھا حضور میں رنجیدہ تو نہیں ہوں اور میں تو خود جانا نہیں چاہتی۔"

"مگر...... کیوں؟" وہ حیران رہ گئے۔ "تم...... ملنا نہیں چاہتیں...... کس وجہ سے...... پھوپھی حضور کے ڈر سے، ان کی ناراضگی کے خوف سے؟" رشید احمد کو تعجب تھا۔

"جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ دراصل میں اپنا آپ انہیں یاد دلا کر دکھ پہنچانا نہیں چاہتی۔ پھوپھی حضور ان سے ناراض تھیں، منصور بھائی ان کے جانے پر خفا تھے۔ میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر...... اتنے مہینوں میں انہوں نے مجھے ایک فون تک نہیں کیا۔ بڑی بہن تو ماں کی جگہ ہوتی ہے اور مائیں بیٹیوں کو یوں تنہا نہیں چھوڑ دیتیں۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس نے گردن جھکا لی۔

رشید احمد اس کے قریب آئے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے بولے۔

"بیٹا...... اپنی بہن کو غلط مت سمجھو۔ وہ تو بہت محبت کرنے والی بچی ہے۔ اگر اپنے شوق اور بہترین مستقبل کی خاطر تم سب کی مرضی کے خلاف گلزار نگر چلی گئی تو...... یہ اتنا بڑا جرم نہیں۔ جس کی تلافی نہ ہو سکے۔ فوزیہ بیٹی!...... تم جانتی ہو تمہاری پھوپھی حضور جانتی ہیں اور منصور بھی بخوبی جانتا ہے کہ وہ گلزار نگر کیوں چھوڑنا نہیں چاہتی۔ نادیہ کا مزاج اور طبیعت تم سے قطعی مختلف ہے۔ وہ بنی بنائی وجاہت علی ہے۔ جس بات کا ارادہ کر لیا وہ اٹل ہے، پھر دنیا کی کوئی طاقت کوئی رشتہ اس کو متزلزل نہیں کر سکتا۔"

"میں جانتی ہوں پھوپھا حضور...... لیکن...... کیا یوں...... اس طرح امی حضور مل جائیں

گی؟"

وہ رو پڑی۔

"یاد رکھو فوزیہ...... جذبہ صادق ہو اور لگن سچی...... تو کامیابی یقینی ہے۔ اس نے جس بات کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہ اٹل ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت کوئی رشتہ اس کے ارادے کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ باپ کو کھو کر اور ماں کے ملنے کی جھوٹی آس کے سہارے تو وہ ساری زندگی گزار سکتی ہے، خواہ اس کے لیے سارے رشتے ترک کرنا پڑیں۔ بیٹا تمہیں تو اپنی بہن پر فخر کرنا چاہیے۔ میں تو اس کی مستقل مزاجی، عزم و ہمت کی داد دیتا ہوں۔ وجاہت اور ثریا بہن تو مبارک باد کے قابل ہیں جنہوں نے اس جیسی باہمت اور بلند حوصلہ بیٹی کو جنم دیا۔ میری تو دعا ہے کہ اللہ اسے کامیاب کرے۔"

وہ کچھ دیر رکے۔ کچھ سوچتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔

"عابدہ اس سے خفا ہیں۔ منصور اس رنج میں ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں یہ ان لوگوں کی نادانی ہے۔"

فوزیہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ انہوں نے پیٹھ تھپک کر تسلی دی پھر گھڑی پر نظر پڑتے ہی ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔

"مائی گاڈ...... میں کتنا لیٹ ہو گیا۔ میں جا رہا ہوں تم بھی اٹھو اور منہ ہاتھ دھو کر آرام کرو۔ اچھی بچیاں یوں روتی نہیں ہیں۔ ہمت سے کام لیتی ہیں۔"

اور باہر چلے گئے۔

انسانی قوت برداشت بھی ایک حد تک ساتھ دیتی ہے۔ جہاں یہ حدیں ختم ہو جائیں وہیں انسان جسمانی سے زیادہ ذہنی طور پر بیمار نظر آنے لگتا ہے۔ ایسی بیماری لاعلاج ہوتی ہے۔

عابدہ بیگم بھی بیمار ہو گئی تھیں۔ اپنے ہی ہاتھوں لگائی ہوئی آگ نے بہت دھیمے دھیمے انہیں اندر ہی اندر پگھلا دیا تھا۔

وجاہت علی سے انہیں بے انتہا محبت تھی۔ نادیہ اس کے بھائی کی اولاد تھی۔ اس ناتے سے اس سے شدید محبت تھی۔ محبت کی انتہا بندے کو اتنا خودغرض بنا دیتی ہے کہ اس کی ذرا سی لاتعلقی بھی برداشت کی حدوں کو توڑ دیتی ہے۔ ان کے مزاج کی سختی نے خود انہیں دکھی بنایا تھا۔ اس سکے باوجود انہوں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب کبھی بھی نادیہ کی شکل نہیں

دیکھیں گی لیکن وہ جب بھی آنکھیں بند کرتیں نادیہ مسکراتی ہوئی ان کے سامنے موجود ہوتی۔

وہ آنکھیں کھول دیتیں۔

پھر تمام رات جاگ کر ہی گزار دیتیں۔

☆

"خدا کی قسم نادیہ! اگر مجھے رتی بھر بھی اس بات کا علم ہوتا کہ تم اتنی پتھر دل ہو تو...... کاہے کو اپنا آپ یوں تباہ کرتا۔"

تمام رات جاگ کر گزارنے کے بعد وہ دھیرے سے اٹھا۔ کھڑکی کے پردے سرکا کر باہر نظر ڈالی۔ ملگجا اجالا مشرق سے ابھر رہا تھا۔

وہ خاموش کھڑا ان بڑھتی ہوئی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔

کیا زندگی کی صبحیں بھی اتنی ہی حسین اور خوابناک ہوتی ہیں۔ حالانکہ اس کی دوپہر کتنی ویران ہوتی ہے اور شامیں تو سر سے پاؤں تک تاریکیوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ وہ صبح بھی یقیناً اتنی ہی معصوم اور دل آویز ہوگی۔ جب میں نے یونہی بے خیالی اور بچپن کی حماقت کے تحت ثریا مامی کی اس گڑیا کو گود میں اٹھا کر کہا تھا۔

"مامی...... یہ گڑیا کتنی پیاری ہے۔ مجھے دے دیجیے نا۔"

میرے اس جملہ پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔ تب ہی وجاہت ماموں نے مجھے گود میں اٹھا کر ڈھیر سارے پیار کرنے کے بعد کہا تھا۔

"ہاں بیٹے...... یہ گڑیا تمہاری ہی ہے۔ بڑے ہو جاؤ پھر لے جانا۔ ابھی تو چھوٹی ہے تمہیں تنگ کرے گی۔"

"بڑے ہو کر لے جانا۔" وہ ماموں حضور کا جملہ دہرا کر خود ہی ہنس پڑا۔ دریچہ بند کر کے واپس پلٹا۔ سامنے میز پر عابدہ بیگم کا خط پڑا تھا اس مختصر سے خط ہی نے تو اس کے اندر کی بجھتی ہوئی آگ کو دوبارہ بھڑکا دیا تھا۔ یہ اس کی ناقابل برداشت تپش تھی جس نے اسے بے کل کر دیا تھا۔ منصور نے ہاتھ بڑھا کر خط اٹھا لیا۔ شام سے لے کر ساری رات گزر جانے کے بعد سینکڑوں بار وہ اس خط کو پڑھ چکا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ ازبر ہو چکا تھا لیکن پھر کچھ ہوتا...... عجیب سی الجھن...... بے چینی اور اس کا ٹھنڈا کپکپاتا ہوا ہاتھ دوبارہ اس پرچے کو اٹھا لیتا۔ نظریں الفاظ پر گڑ جاتیں۔

"منصور میاں خوش رہو۔

جب سے تم گئے ہو تمہاری طرف سے ہمیں صرف ایک خط موصول ہوا ہے۔ غالباً تمہاری سعادت مندی کا یہی تقاضا ہوگا۔ بہر حال یہ خط صرف اس لیے لکھ رہی ہوں کہ تمہاری روانگی کے وقت جو سوال تمہارے سامنے پیش کیا تھا اب اس کا فوری جواب چاہتی ہوں۔ اور تم جانتے ہو میں نا سننے کی عادی نہیں ہوں۔ آج کل میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم جتنی جلدی ہو سکے واپس آ جاؤ تاکہ تمہارے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔ فوزیہ کو اپنی بہو بنا کر میں فخر محسوس کروں گی اور مجھے یقین ہے تمہیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ مرد کو نیک اور سلیقہ شعار بیوی کی ضرورت ہوتی ہے کسی سر پھرے حاکم کی نہیں۔"

تمہاری ماں

☆

"ڈاکٹر نادیہ! خوش رہو۔

زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار تمہیں مخاطب کر رہا ہوں۔ امید ہے تم اس جسارت کو معاف کر دو گی۔

میں جانتا ہوں تمہارے نزدیک زندگی کے تقاضے اور دنیا کے بنائے ہوئے رسم و رواج کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن نادیہ...... زندہ رہنے کے لیے اور معاشرے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان چیزوں کو خوشی یا مجبوری سے بہرصورت اپنانا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ زندگی محض ایک تماشا تو نہیں جسے اسٹیج پر دیکھ کر خوش ہولیا جائے نہ ہی انسان بے جان کھلونا ہے جس سے جب دل بھر گیا تو توڑ دیا۔ میں یہ کبھی نہیں کہوں گا کہ تم سے غلط توقعات وابستہ کر کے میں نے غلطی کی کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ جس مقدس اور پُرخلوص جذبہ کی بنیاد بچپن میں پڑ گئی تھی اسے میں جھوٹا یا ناپائیدار سمجھ لوں۔ ناممکن ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس خیال کو غلط راہ پر گامزن تم نے کیا۔ میں نے بھی منزل کی تمنا نہیں کی تھی۔ اس کی آرزو تم نے پیدا کی اگر واقعی تمہیں ہمارے

گھرانے...... یا مجھ سے کوئی انسیت، کوئی دلچسپی، کوئی محبت نہیں تھی تو انکار کر دیتیں۔ اپنی اسی پرانی صاف گوئی سے کام لے کر جو مجھے ہمیشہ سے پسند ہے کم از کم میں اور اماں جان اس اذیت سے تو بچے رہتے جس میں آج ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مبتلا ہیں اماں جان کا تو بھرم ٹوٹا ہے، بات کھوئی گئی ہے لیکن انہیں اور تمہیں کیا معلوم کہ میرا اپنا کیا کھویا ہے اور کیا ٹوٹا ہے۔ اب اپنی انا کی تسکین کے لیے وہ مجھے جس منزل پر لے جانا چاہتی ہیں اس کا تصور ہی میرے لیے اذیت ناک اور تکلیف دہ ہے۔ اس کا اندازہ شاید تم نہ کر سکو۔ ان کا خط تمہیں بھیج رہا ہوں اسے غور سے پڑھو...... پھر مجھے بتاؤ نادیہ میں کیا کروں؟

منصور''

نادیہ نے دوسرا پرچہ اٹھایا پڑھا لیکن اس کے ایک ایک لفظ کے ساتھ اسے اپنا جسم، اپنا دل اور اپنا ذہن عمیق گہرائیوں میں ڈوبتا محسوس ہوا۔ کسی انہونی بلکہ اس بات پر جس کا سان و گمان بھی نہ ہو۔ انسان کا ذہن الجھ کر ٹوٹنے لگتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں اعتبار اور اعتماد کی زنجیریں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں۔ لیکن نادیہ وجاہت علی نے بڑے سکون اور حوصلہ کے ساتھ خط ختم کیا۔ واپس لفافہ میں رکھا۔ دھیرے دھیرے چلتی مسہری پر آن کر لیٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر شکست خوردہ مسکراہٹ تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو اس کا اپنا تمسخر اڑا رہی ہو۔

اس لمحہ چہرہ جن جذبات و احساسات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اس کا جواب آئینہ دے سکتا تھا یا پھر کوئی بہت اپنا۔

اس وقت وہ آئینہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

اور کسی اپنے کا نشان دور دور تک نہیں تھا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے اتنی زور سے دبایا کہ خون چھلک پڑا۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بالوں کو پیچھے کیا۔ پھر لفافہ کوٹ کی جیب میں ڈال کر کھڑی ہو گئی وارڈ میں ڈیوٹی کا وقت ہو چکا تھا۔

مریضوں سے جان چھڑا کر گرم گرم چائے پینے تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں آئی تھی۔ مریم نے راؤنڈ پر جانے سے پہلے چائے بنا کر خود بھی پی تھی اور اس کے لیے بھی ایک

پیالی چائے بنا کر رکھ گئی تھی۔

پر اس کا کیا کیا جائے کہ جب وہ منہ ہاتھ دھو کر غسل خانے سے باہر آئی تو پھر اسی نے یہ خط لا کر دیا لفافہ کے اوپر لکھی گئی تحریر اور دوسری طرف بھیجنے والے کا نام پڑھ کر اس کے چہرے پر شفق کی گلال پھوٹ پڑی تھی۔

منہ پونچھے بغیر ہی اس نے بڑی بے صبری سے لفافہ کھولا تھا۔ لیکن یہ مسرتیں بھی کتنی ناپائیدار اور ناقابل اعتماد ہوتی ہیں۔ اور انسان کتنا نادان کہ ان کی تلاش میں ساری زندگی گنوا دیتا ہے۔ یہ سود و زیاں کا سودا کسے اور کتنا مہنگا پڑتا ہے۔ یہ کوئی اس سے نادیہ وجاہت علی سے پوچھتا۔ جو زبردست گھاٹا اٹھانے کے باوجود مسکرا رہی تھی۔

وہ عام لڑکیوں کی طرح دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روئی نہیں تھی کسی سے کوئی گلہ یا شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔

اس لیے کہ گلہ بھی تو اپنوں سے کرتے ہیں۔

لیکن اس کے اپنوں نے تو اسے غیر بنا دیا تھا۔ پھر...... بھلا...... وہ کیا کرتی۔ کیا کہتی...... اور کس سے کہتی اسٹیتھسکوپ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی تو قدم ڈگمگا گئے۔ آنکھوں کے سامنے دھندسی پھیل گئی۔ حلق میں کوئی چیز اٹکتی سی محسوس ہوئی۔ پھر اپنی اس حماقت مآب حالت پر وہ خود ہی زور سے ہنس پڑی۔ ''نادیہ بیگم...... بھلا یہ کیا...... اتنی پست ہمتی تم تو چٹان کی طرح مضبوط تھیں پھر یہ ڈگمگاہٹ کیسی پہاڑ بھی کہیں یوں گرا کرتے ہیں۔''

وہ پردہ ہٹا کر تیزی سے، باہر آ گئی۔ سپیشل وارڈ کے برآمدے میں ڈاکٹر عامر سے ملاقات ہو گئی۔

''اتنی عجلت اور تیزی سے کہاں جا رہی ہیں ڈاکٹر نادیہ؟'' عامر کے اس اچانک سوال نے اس کے قدم تھام لیے۔ وہ گھبرا کر رک گئی۔ اس وقت وہ اس سے بچ کر نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ عامر سے تو کیا خود اپنے آپ سے بھی نظریں چرا رہی تھی۔

''اوہ...... بس...... وہ ذرا...... روم نمبر 4 تک جا رہی تھی۔'' وہ ہکلا گئی۔

''کیسا ہے۔ آپ کا مریض؟'' عامر نے قریب آن کر غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے بولا۔ ''سنیے...... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

''میری...... طبیعت؟'' قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ ''آپ کیا محسوس کر رہے ہیں۔ سخت

بیمار ہوں۔ غالباً بچنے کی امید بھی کم ہے۔"

"مذاق میں بات مت ٹالیے۔ خدا کی قسم آپ کا چہرہ ضرورت سے زیادہ زرد نظر آ رہا ہے۔"

"آپ کی نظر کمزور ہے۔ یا پھر...... آپ کو یرقان ہو گیا ہے اپنا معائنہ کرائیں۔"

اسپیشل وارڈ کا چکر لگانے کے بعد جب نادیہ جنرل وارڈ کی طرف آئی تو راہ میں مریم سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی غرائی۔

"تم کہاں دفعان ہو گئی تھیں کب سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ ادھر وارڈ میں آپ کے مریض آپ کی یاد میں ہڑک رہے ہیں۔"

نادیہ کو ہنسی آ گئی۔ "چہ...... چہ...... اس کے یہ معنی ہیں کہ کسی نے تمہیں لفٹ نہیں دی۔"

"ویری سیڈ۔"

"تو یہ کہ...... میں نے بھی کون سی توجہ دی۔ ایک دروازے سے داخل ہوئی اور دوسرے دروازے سے باہر نکل آئی میں۔ کس کمبخت کو سننا تھا کہ جی ڈاکٹر نادیہ کہاں ہیں آپ تو انہیں ہی بلوا دیں۔"

"مجھے افسوس بھی ہے اور...... ہمدردی بھی ڈاکٹر مریم!"

"دفعان ہو۔" مریم جلبلا کر بولی۔ "مجھے آپ کی ہمدردی اور آپ کے افسوس کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پوچھنے والے بلکہ جان دینے والے بھی بہت ہیں۔"

"بتانے کی ضرورت نہیں، میں جانتی ہوں۔ بلکہ کچھ تو خاص الخاص بھی ہیں۔"

"مار کھاؤ گی۔ بہت زبان چلنے لگی یہ۔"

"مار کر تو دیکھو...... یہ سامنے ہی وارڈ ہے۔ سارے کے سارے مریض تمہیں چمٹ جائیں گے۔"

"اللہ...... اللہ...... کتنی خوش فہمی ہے نادیہ وجاہت علی آپ کو۔" مریم نے چھیڑا۔

"اچھا...... بک بک بند...... تم اپنے رستے پر جاؤ...... میں اپنے رستے پر...... بہت خیند

آ رہی ہے۔"

"سوچیں۔ میں دیکھ لوں گی۔" نادیہ نے دھمکایا۔

"ابھی...... آدھ گھنٹہ میں سب کو نمٹا کر آتی ہوں...... آزما لینا۔"

"یہ ہی سہی...... شرط رہی۔" مریم ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

نادیہ جنرل وارڈ کے اندر چلی گئی۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" بیڈ نمبر 8 کا چارٹ دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"خدا کا شکر ہے ڈاکٹر صاحبہ...... اب تو بہت بہتر ہوں...... چھٹی کب تک مل جائے گی؟"

"چھٹی......؟" نادیہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا اتنی جلدی آپ یہاں سے گھبرا گئیں...... ابھی تو میرا خیال ہے آپ کو دو چار روز اور رہنا پڑے گا۔ جب تک آپ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جائیں ہم آپ کو جانے تھوڑا ہی دیں گے۔"

جواب میں مریضہ نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر دھیرے سے آنکھیں بند کر لیں۔

"کیوں...... آپ کو میری بات پسند نہیں آئی؟" نادیہ نے پیار سے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "دراصل چھٹی دینے یا نہ دینے کا اختیار سرجن کو ہے جس نے آپ کا آپریشن کیا ہے۔ وہ کل یا پرسوں آپ کا معائنہ کرنے کے بعد ہی یہ فیصلہ کریں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" آواز میں بلا کی مایوسی تھی۔

"اتنی پریشان نہ ہوں...... چھٹی جلد ہی مل جائے گی۔ لیکن اس کے بعد بھی معائنہ کے لیے تو ہر ہفتہ آنا پڑے گا۔ یہ تو منظور ہے نا۔"

مریضہ مسکرا دی۔ نادیہ نے چارٹ سرہانے میز پر رکھ دیا۔

"اب آپ آرام کریں۔ ابھی سسٹر آ کر انجکشن دیں گی پھر رات بھر آپ آرام سے سوئیں گی۔ ہاں......" نادیہ جاتے جاتے پلٹی۔ "کھانا ضرور کھا لیجیے گا۔ سنا ہے آپ کو ہمارے ہسپتال کا کھانا پسند نہیں آتا۔"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ڈاکٹر دراصل میرے منہ کا مزہ اتنا خراب ہو چکا ہے کہ کچھ

بھی پسند نہیں آتا۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔ یوں کریں...... آپ گھر سے اپنی پسند کا کھانا منگوا لیا کریں ہسپتالوں کا کھانا عام حالت میں بھی ذرا مشکل ہی حلق سے اترتا ہے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر...... ویسے اتنا برا بھی نہیں ہوتا۔ یہ سارا قصور تو میری زبان کا ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ بیڈ نمبر 9 کی طرف متوجہ ہوئی تھی کہ مریضہ نے نہایت دھیمی آواز سے سوال کیا۔

"میں پوچھ سکتی ہوں...... کہ...... کیا آپ کا نام نادیہ ہے؟"

"جی...... جی ہاں۔" نادیہ کے چہرے پر تجسس تھا۔ "مگر...... میرا نام آپ کو...... کس طرح معلوم ہوا؟"

"آپ کے ہسپتال کی ایک نرس سے...... آپ...... آپ کا لہجہ...... آپ کی گفتگو کا انداز اتنا اچھا لگا کہ...... نام پوچھے بنا نہ رہ سکی۔"

"اوہ...... اچھا...... شکریہ۔" نادیہ آگے بڑھ گئی۔

☆

صبح کے سلام کے لیے جب فوزیہ عابدہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے تسبیح ایک طرف رکھ دی۔ اس پر پھونکا اور اپنے ہی پاس بٹھا لیا۔

"پھوپھی حضور! کوئی خاص کام...... آپ نے یاد فرمایا تھا۔"

"ہاں فوزیہ......" انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ "خاص ہی کام ہے۔ اور یہ امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔ نادیہ نے تو مجھے وہ دکھ دیا ہے جو ناقابل برداشت ہے۔ اس دکھ کا علاج اب صرف تمہارے پاس ہے۔ میں چاہتی ہوں جو مقام میں نادیہ کو دینا چاہتی تھی وہ...... اب...... تمہیں دے دوں۔"

فوزیہ نے سکتہ کی سی حالت میں پھوپھی کی طرف دیکھا۔ اسے شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ پھر کچھ سوچے سمجھے بنا ہی الفاظ اس کے منہ سے نکلنا شروع ہو گئے۔

"پھوپھی حضور! جو کچھ آپ سوچ رہی ہیں...... جو فیصلہ آپ نے کیا ہے...... جو مقام

آپ مجھے دینا چاہتی ہیں۔ محض اپنی انا اور سکون کی خاطر وہ...... ناممکن ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ کبھی نہیں ہوگا۔ آپ کی شان میں یہ گستاخی ضرور ہے لیکن...... میں اس گستاخی پر مجبور ہوں۔"

فوزیہ کے جواب نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ اور وہ آگ پوری طاقت سے بھڑک اٹھی۔

"فوزیہ! کان کھول کر سن لو...... میں تمہاری زبان سے انکار کا ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرسکتی۔"

عابدہ بیگم بڑے غصہ اور فیصلہ کن انداز میں بولیں۔ "آج تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ......" کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"نادیہ کی سرکشی اور نافرمانیوں کے باوجود میں نے اسے منصور کے لیے صرف اس وجہ سے پسند کیا تھا کہ یہ وجاہت کی آرزو تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی ورنہ خدا شاہد ہے کہ اس کے لیے ہاں کہتے ہوئے میرا دل دھڑکا تھا۔ میں اتنی توہم پرست اور کچے اعتقاد کی مالک نہیں ہوں لیکن بہرحال ایک کمزور انسان اور عورت ہوں۔ منصور میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ نادیہ کی پیدائش پر اماں حضور کی موت ایسا ناقابل فراموش سانحہ تھا جو پتھر کی لکیروں کی طرح میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔ اس کے باوجود اور اس توہم سے نکلنے کے لیے میں نے بخوشی منصور کے لیے نادیہ کو مانگ لیا تھا لیکن اب حالات کی ان غیر متوقع اور اچانک تبدیلیوں کو دیکھ کر سوچتی ہوں شاید خدا کو ہماری بہتری منظور تھی۔"

"پھوپھی حضور!......" فوزیہ تڑپ اٹھی۔ "آپ مجھے خواہ کچھ کہہ لیں۔ مار ڈالیں لیکن خدا کے لیے آپی کے بارے میں ایسا نہ سوچیں۔ ان کی ذات کے لیے ایسے برے خیالات نہ لائیں۔ وہ منحوس نہیں ہیں۔"

"پاگل پن کی باتیں نہ کرو فوزیہ...... خدا نہ کرے میرا ایسا مطلب ہو...... بس ایک مبہم سا شک ہے جو رہ رہ کر بے چین کر دیتا ہے۔"

"شک نہیں پھوپھی حضور...... یہ آپ کا غصہ ہے جس نے آپ کو یہ سب کہنے پر مجبور کیا۔"

"ہاں...... شاید...... کیونکہ مجھے لڑکیوں کی اتنی خودسری اور نافرمانی قطعی پسند نہیں۔"

"میں بھی تو انہی کی بہن ہوں...... ممکن ہے کل آپ کو مجھ سے بھی یہی شکایت......"

"فو...... زیہ۔" عابدہ بیگم اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی چلا پڑیں۔ "چلی......

جاؤ میرے سامنے سے میں اس سے زیادہ اور کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

فوزیہ کھڑی ہوگئی۔

"لیکن جانے سے پہلے یہ کان کھول کر سن لو میں اپنے فیصلوں سے بار بار دستبردار نہیں ہوتی۔ اس گھر کی بہو اب نادیہ نہیں ہوگی۔ اس گھر کی بہو اب نادیہ نہیں فوزیہ بنے گی۔ اور یہ میرا آخری اٹل فیصلہ ہے تمہیں خوشی سے یا مجبوری سے بہرحال ماننا پڑے گا۔"

فوزیہ نے نظریں اٹھا کر ان کے پرجلال چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر خاموشی سے سر جھکائے باہر آگئی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح مسہری پر گر پڑی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپاتے ہی آنسوؤں کا طوفان اپنی پوری شدت سے امڈ پڑا تھا۔

پھر صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہوگئی۔

رات کھانے کی میز پر فوزیہ کو موجود نہ پا کر رشید احمد کو بڑا تعجب ہوا کیونکہ پچھلے کئی ماہ سے عابدہ بیگم تو اپنے ہی کمرے میں کھانا منگوا لیتی تھیں اور وہ فوزیہ ہی کے ساتھ رات کا کھانا کھاتے تھے۔

"فوزیہ بی بی کہاں ہیں؟ کھانے پر نہیں آئیں گی۔"

انہوں نے کھانا شروع کرنے سے پہلے نوکر سے دریافت کیا۔

"صاحب...... انہوں نے تو دوپہر بھی کھانا نہیں کھایا۔ ابھی بھی میں بلانے گیا تھا تو کہہ دیا...... بھوک نہیں ہے۔"

"کیوں...... کیوں بھوک نہیں ہے؟" وہ کرسی چھوڑ کر کھڑے ہوگئے۔

فوزیہ کے کمرے میں جانے سے پہلے عابدہ بیگم کے پاس آئے۔

"بیگم! کیا فوزیہ کی طبیعت خراب ہے؟ اس نے دوپہر بھی کھانا نہیں کھایا اور اس وقت بھی کھانے پر نہیں آئی۔"

عابدہ بیگم کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ انہوں نے قریب کھڑی ملازمہ کی طرف استفسارانہ نظروں سے دیکھا۔

"جی...... جی ہاں...... بیگم صاحبہ۔" ملازمہ گھبرا گئی۔

"تو...... مجھے کیوں نہیں بتایا گیا؟" انہیں غصہ آگیا تھا۔

"آپ کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ پھر...... آپ آرام فرما رہی تھیں۔"

"جاؤ...... اور اسے بلا کر لاؤ" انہوں نے حکم دیا۔

رشید احمد وہیں کرسی پر ٹک گئے۔

ٹرالی پر رکھا ہوا کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

عابدہ بیگم کسی گہری سوچ میں غرق خاموش بیٹھی تھیں۔

چند لمحوں بعد ہی فوزیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی رشید احمد دنگ رہ گئے۔ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب آئے۔

"فوزیہ! تمہیں کیا ہوا بیٹی...... یہ تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں...... بالکل ٹھیک ہوں...... پھوپھا حضور!" اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر ان کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ "مجھے بھلا کیا ہوا ہے۔"

"اسے ٹھیک کہتے ہیں...... پگلی......" انہوں نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس تھوڑی سی پیار بھری ہمدردی سے وہ رکا ہوا طوفان جسے وہ مشکل سے روکے ہوئے تھی۔ امڈ پڑا۔

"نہیں...... پھوپھا حضور...... میں ٹھیک ہوں...... بالکل...... ٹھیک۔"

اس کی سہمی کانپتی ہوئی آواز نکلی۔ پھر ان کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پڑی۔

"ارے...... ارے...... بھئی...... یہ رونا کیسا...... چھی چھی...... بھلا بہادر لڑکیاں بھی یوں روتی ہیں۔ بیٹی طبیعت خراب تھی تو مجھ سے، اپنی پھوپھی سے...... کسی سے تو کہا ہوتا۔ ڈاکٹر کے پاس لے جاتے، یوں کھائے پیئے بغیر پڑے رہنے سے تو طبیعتیں ٹھیک نہیں ہوتیں۔" انہوں نے بڑے پیار سے تسلی دے کر اپنے قریب ہی کرسی پر بٹھا لیا۔

عابدہ بیگم خاموش بیٹھی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"اچھا اب اٹھو...... جاؤ منہ ہاتھ دھوؤ اور چل کر میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

"لڑکی نے مجھے بھی بھوکا مار دیا...... دیکھو تمہاری پھوپھی حضور نے بھی کھانا چھوڑ رکھا ہے۔"

فوزیہ نے جلدی جلدی دوپٹہ کے آنچل سے آنکھیں خشک کیں پھر پھوپھی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی۔ "آپ کھانا کھائیں پھوپھی حضور...... میں کھانے جا رہی ہوں۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ رشید احمد نے بھی کھڑے ہو کر اسے ایک بار پھر گلے سے لگایا دعائیں دیں

پھر بیوی سے مخاطب ہو کر بولے۔

"دیکھا بیگم صاحبہ! میری بھتیجی کتنی سعادت مند ہے۔ آپ بلا وجہ ہی فکر مند ہو رہی تھیں۔ ہم لوگ کھانا کھانے جا رہے ہیں۔ آپ بھی شروع ہو جائیں۔"

وہ فوزیہ کو ساتھ لیے کھانے کے کمرے میں آ گئے۔

اس سارے واقعہ کے پیچھے حقیقت کیا تھی جس نے فوزیہ کو اس حد تک مجروح کر دیا تھا۔ رشید احمد قطعی لاعلم تھے۔ ان دونوں کے جاتے ہی عابدہ بیگم نے سامنے سے ٹرالی ہٹا دی۔ ملازمہ نے بڑے پریشان کن انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"لیکن بیگم صاحبہ...... آپ نے تو...... ابھی۔"

"میں نے کہا نا...... ٹرالی لے جاؤ...... میں کھا چکی ہوں۔"

ملازمہ نے خاموشی سے تعمیل حکم میں سامنے سے ٹرالی ہٹا لی۔ پانی پیئے بغیر انہوں نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆

چادر میں منہ چھپاتے، چھپتے چھپاتے شام کے جھٹ پٹے میں جب وہ گاؤں پہنچیں تو چند گھنٹوں کے اندر ان کی دنیا بدل چکی تھی۔ قسمت بدل چکی تھی۔ اینٹوں کے بجائے کچے مکان کے صحن میں قدم رکھتے ہوئے انہوں نے بڑی بے بسی اور بے چارگی سے اپنے اطراف پر نظر ڈالی۔ شاموں نے بھاگ کر پلنگ بچھا دیا تھا۔ اس پر میلی سی چادر بھی ڈال دی۔ پھر بڑی منت سے بولا۔ "بیگم صاحبہ تشریف رکھیں۔ میں برابر والے مکان سے اپنی گھر والی کو بلا لاؤں۔ وہ آپ کو گرم گرم چائے بنا کر دے گی تو...... تو...... آپ کی تھکن کم ہو گی۔"

"نہیں...... شامو...... میں یونہی ٹھیک ہوں۔"

وہ دھیرے سے پلنگ پر بیٹھ گئیں ان کا جسم کپکپا رہا تھا۔ دماغ ماؤف ہو چکا تھا آنکھوں کے سامنے گرد و غبار کا ایک طوفان تھا جس نے بڑی تیزی سے ان کے سراپا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دکھ اور اچانک صدمہ نے انہیں دنیا و مافیا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھیں جب آنکھ کھلی تو بہت سے لوگ ان کے نزدیک ہی فرش پر خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔ شاموان کے پاؤں کے قریب کھڑا رو رہا تھا۔

"حکیم...... صاحب بیگم صاحبہ نے آنکھیں کھول دیں۔" وہ چلا پڑا۔

"ہاں...... ہاں، میں دیکھ رہا ہوں...... خدا کا شکر ادا کرو۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔" حکیم صاحب نے تسلی دی۔

ثریا بیگم نے اٹھنا چاہا ایک بوڑھی خاتون نے انہیں آہستہ سے دوبارہ لٹا دیا۔

"آپ آرام کریں بیگم صاحبہ...... اٹھنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"مگر...... مجھے کیا ہوا ہے...... میں تو اچھی بھلی تھی۔ اور میں یہاں کیسے آ گئی؟"

شامو ان کے سرہانے زمین پر بیٹھ گیا۔ "آپ...... بالکل ٹھیک ہیں...... فکر نہ کریں۔ آپ...... میرے گھر میں ہیں۔"

"تمہارے گھر میں...... مگر کیوں؟" وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

اس کے پاس ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ میرا اپنا گھر کہاں ہے۔ نواب صاحب کہاں ہیں؟"

"بیگم صاحبہ!" حکیم صاحب نے تسلی آمیز انداز میں سمجھانا چاہا۔ "آپ یہاں محفوظ مقام پر ہیں۔ باغیوں نے سب کچھ ختم کر دیا ہے۔ باغی عوام کا طوفان سمندر کی بپھری موجوں کی طرح ہوتا ہے جو اپنے راستہ کی ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ خدا کا شکر ادا کیجیے۔ آپ کی جان بچ گئی۔"

"میری جان بچ گئی۔" اور ان کی آنکھوں اور لہجے میں انجانا سا خوف امڈ آیا تھا۔ "نواب صاحب...... اور بچیاں...... خیریت سے تو ہیں؟" وہ چلا پڑیں۔

ہر شخص خاموش تھا۔ غالباً تسلی کے لیے کسی کے بھی پاس ایک لفظ بھی نہیں بچا تھا۔

"آپ...... لوگ بولتے کیوں نہیں؟"

"ہمیں افسوس ہے بیگم صاحبہ کہ...... ہم لوگ کوشش کے باوجود نواب صاحب کو نہ بچا سکے۔"

"آخری الفاظ ثریا بیگم پر بجلی بن کر گرے۔ وہ پتھر کی طرح ساکت رہ گئیں۔ ان کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرہ خوفناک حد تک سفید پڑ گیا تھا۔ زبان سے تاسف یا واویلا کا ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔

"بیگم صاحبہ!...... ہمت سے کام لیں۔" حکیم صاحب نے سمجھانا چاہا لیکن......

ثریا بیگم تو ہوش و حواس کی دنیا سے بہت دور جا چکی تھیں۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ کوشش کے باوجود ان کی یادداشت واپس نہ آ سکی۔

شامو نے علاج کے لیے اپنے گھر کی ایک ایک چیز فروخت کر دی۔ یہی نہیں بلکہ دشمنوں سے بچائے رکھنے کے لیے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں لیے لیے پھرتا رہا۔ صرف اس موہوم سی امید پر کہ شاید کرم داد کی حفاظت میں نواب صاحب بچ ہی گئے ہوں لیکن اس دوران یہ اطلاع بھی مل گئی کہ کرم داد ان کی حفاظت نہ کر سکا اور باغیوں نے اس کے ہی گھر میں انہیں قتل کر دیا۔

شامو کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ لیکن حوصلہ نہیں ہارا تھا۔

اب اس کی زندگی کا مقصد بچیوں کے لیے ثریا بیگم کی جان بچانا تھا۔ جو صرف زندہ تھیں۔ ورنہ قدرت نے ان کے تمام احساسات چھین لیے تھے۔ جو غم اور خوشی، اچھائی برائی سب کی حدیں پار کر چکی تھیں۔ زمانے نے اتنی بڑی ٹھوکر اتنے اچانک پن سے لگائی تھی کہ وہ پاش پاش ہو چکی تھیں۔

گلزار نگر میں امن قائم ہونے کے بعد شامو نے کئی بار ہوسٹل جا کر بچیوں سے ملنا چاہا لیکن اجازت نہیں مل سکی۔ آخر تھک کر اس نے کوشش ہی چھوڑ دی اور اپنی تمام تر توجہ ان کے علاج پر صرف کر دی۔

یوں سال گزرتے رہے خیراتی ہسپتالوں کے علاج میں جب کوئی خاطر خواہ فائدہ نظر نہ آیا تو...... وہ انہیں لے کر گلزار نگر ہسپتال آ گیا تھا۔

آپریشن کے بعد نفسیاتی علاج سے مریضہ کی کھوئی ہوئی یادداشت دھیرے دھیرے واپس آ رہی تھی۔ لیکن اس ہونے اور نہ ہونے میں ذہنی کشمکش بڑھ گئی تھی۔ ڈاکٹر نادیہ سے مل کر اس سے باتیں کر کے اس کے ذہن پر شدید بوجھ ہو جاتا۔ عجیب سی الجھن اور بے چینی محسوس کرتی۔ اسی بے چینی سے نجات پانے کے لیے جب اس نے ڈاکٹر سے ان کا نام پوچھا تو...... اسے سن کر کوئی حیرانی کسی خوشی کا احساس تک نہ ہوا۔

البتہ مریضہ رات بھر بے چین ضرور رہی۔

سونے کی انتہائی کوشش کے باوجود نیند آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ تمام رات وہ کھلی آنکھوں اور منتشر خیالات کے ساتھ دنیا جہاں کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

صبح ہسپتال سے چھٹی مل رہی تھی۔

لیکن عجیب بات تھی کہ چند دن پہلے تک جیسے ہسپتال سے جلد سے جلد چلے جانے کی خواہش تھی اب اس کا دل یہ چاہ رہا تھا کہ یونہی ساری زندگی اسی ہسپتال میں پڑی رہے۔

شام کو اپنا راؤنڈ ختم کر کے ڈاکٹر نادیہ جاتے جاتے واپس پلٹ آئی۔ بیڈ نمبر 8 کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''صبح آپ کو چھٹی مل رہی ہے مبارک ہو۔''

مریضہ کے چہرے پر عجیب سی رونق آ گئی۔ جواب میں وہ بھی مسکرا دی۔

''لیکن...... اپنی صحت کا خیال رکھیے گا۔ خوش رہیے گا۔ آپ کو آرام کی بے حد ضرورت ہے۔''

مریضہ نے بڑی شفقت اور پیار سے اس کی طرف دیکھا آہستہ سے بولی۔

''جس جگہ آپ جیسی پیاری اور نیک دل ڈاکٹر ہوں وہاں سے تو جانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔''

نادیہ کو ہنسی آ گئی۔ ''آپ بھی تو بڑی شفیق خاتون ہیں۔ اچھا خدا حافظ اب آپ آرام کریں۔'' مریضہ نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھاما اور چوم لیا۔

''اگلے ہفتہ آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔ معائنہ کے لیے ضرور آیئے گا۔'' اور نادیہ جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔

''اسے رکھ لیجیے...... میری طرف سے پھل کھا لیجیے گا۔''

ایک لمحہ کے لیے اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید اور بے جان سا ہو گیا۔ پھر فوراً ہی مسکراتے ہوئے بولی۔

''شکریہ بیٹی...... اسے کسی مستحق مریض کو دے دینا۔''

نادیہ شرمسار ہو گئی۔ جلدی سے بولی۔

''معاف کیجیے گا...... میرا مطلب۔''

''کوئی بات نہیں...... آپ شرمندہ نہ ہوں۔'' اس نے نادیہ کی بات کاٹ دی۔ ''بلکہ مجھے تو بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو غریبوں کا اتنا خیال ہے۔''

نادیہ خفت آمیز انداز میں مسکرا دی۔

''ایک بات پوچھوں ڈاکٹر...... برا تو نہ مانیں گی؟''

''بالکل نہیں...... آپ ضرور پوچھیں...... مجھے خوشی ہو گی۔''

''آپ......'' لیکن مریضہ وہ کچھ نہ پوچھ سکی جو کئی دن سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔

''آپ...... بہت رحم دل اور نیک ڈاکٹر ہیں خدا آپ کو خوش رکھے۔ آپ کے والدین مبارک باد کے قابل ہیں۔'' نادیہ ہنس پڑی۔

''اب آپ سو جائیں...... میں نے بڑے میاں سے کہہ دیا ہے وہ صبح نو بجے تک آ کر آپ کو لے جائیں گے۔ اللہ حافظ۔'' نادیہ چلی گئی۔

لیکن مریضہ کی نظریں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں پھر اس نے دھیرے سے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں بند کیں تو نامعلوم سے جذبہ کے تحت آنکھوں کے کونوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک کر تکیے میں جذب ہو گئے۔ ہوتے رہے۔

یہاں تک کہ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ مدتوں بعد ماضی کے مٹے مٹے نقوش نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ کاش میرا حافظہ مجھے واپس نہ ملا ہوتا۔

رات ڈیوٹی کی نرس جب دوا دینے آئی تو نہ چاہنے کے باوجود محض اپنی تسلی کے لیے وہ دل کی بات پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''جی ہاں...... ان کا نام نادیہ وجاہت علی ہے۔'' نرس نے بتایا۔

بجلی اپنی پوری طاقت سے چمکی۔

کڑکی...... اور ثریا بیگم کے وجود پر گر پڑی۔

اسے دیکھ کر پہلے ہی ان کا دل دھڑکا تھا۔

اپنے اندر عجیب سی خلش محسوس کی تھی۔ عجیب سی مٹھاس کا احساس ہوا تھا۔ دلوں کا تعلق کتنا اٹوٹ ہوتا ہے اور خون کے یہ رشتے کتنے انمول ہوتے ہیں اس کی اہمیت اور قیمت کا اندازہ اس وقت کوئی ثریا بیگم سے پوچھتا۔

جن کی آنکھوں سے...... آنسو بہہ رہے تھے۔ لیکن ہونٹوں پر بڑی پُرسکون مسکراہٹ تھی۔

''تو...... واقعی...... یہ تم ہو...... میری جان...... نادیہ میں تو اس وہم کو اپنی بے وقوفی سمجھ بیٹھی تھی۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس بوسیدہ لباس میں تمہارے ہسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑی ہوئی یہ مریضہ...... تمہاری بدنصیب ماں ہے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کل صبح میں یہاں سے جا رہی ہوں اور آج اس وقت میرا شک یقین میں بدلا ہے ورنہ ممکن ہے میں کوئی ایسی

حرکت کر بیٹھتی جو تمہارے اسٹیٹس کے خلاف ہوتی۔"

صبح آٹھ بجے ہی بڑے میاں ٹیکسی لے کر آ گئے۔ ثریا بیگم نے جیسے تیسے چیزیں سمیٹیں اور کٹی ہوئی شاخ کی طرح ٹیکسی میں آن کر گر پڑیں۔

گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے وہ ساری جان سے کانپ رہی تھیں۔

خوشی اور مایوسی دونوں ہی اتنے اچانک طور پر ملی تھیں کہ ان کے کمزور جسم کے لیے سہارنا مشکل ہو گیا تھا۔ شاموں نے سہارا دے کر پلنگ پر لٹا دیا چادر اوڑھاتے ہوئے بولا۔

"آپ کو ابھی ہسپتال سے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اتنی کمزور ہیں۔ کچھ دن اور رک جاتیں۔"

"نہیں شامو...... اب...... تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

انہوں نے اپنے ملگجے دوپٹہ سے سفید بالوں کو ڈھانپتے ہوئے جواب دیا۔

کچھ سوچتی رہیں۔ پھر دھیرے سے بولیں۔

"شامو! تم جانتے ہو۔ وہ ڈاکٹرنی جس کی تم وقتی تعریف کر رہے تھے کون ہے؟"

"کون ہے بیگم صاحبہ؟ پر ہے بڑی پیاری اور نیک دل...... اسے دیکھ کر ماں باپ کا کلیجہ کتنا ٹھنڈا ہوتا ہو گا۔ اللہ بڑی عمر دے۔"

وہ مسکرا دی۔ "ہاں...... تم نے ٹھیک کہا۔ نیک اور قابل اولاد ماں باپ کے لیے بڑی نعمت ہوتی ہے، لیکن ہمارے اعمال بڑی کڑی آزمائشوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ دعا کرو اللہ مجھے معاف کر دے۔ مجھ میں اب ہمت نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندے کو اتنی ہی تکلیف دیتا ہے جس کو وہ سہار سکے۔ طاقت سے زیادہ تو نہیں دیتا۔ مجھ میں بھی اب طاقت نہیں ہے۔ میں بھی اب برداشت کی حدوں سے دور نکل آئی ہوں۔"

وہ آنکھیں بند کیے آپ ہی آپ بولے جا رہی تھیں۔

"شامو" اچانک وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "یہ کتنی بڑی اذیت اور سزا ہے کہ...... میں اسے سینے سے لگا کر پیار بھی نہیں کر سکتی۔"

"کس کو...... بیگم صاحبہ آپ...... سو جائیں...... تھک گئی ہیں۔"

شامو ڈر گیا کہیں دوبارہ وہ ذہنی طور پر بیمار نہ ہو جائیں۔ عجیب و غریب باتیں کر رہی ہیں۔

"تم جانتے ہو...... وہ ڈاکٹرنی کون ہے۔ نادیہ وجاہت علی ہے۔"

"نا...... دیہ...... بی بی۔" شامو چیخ پڑا۔

اس کی آنکھیں حیرت اور خوشی کے مارے پھٹی پڑ رہی تھیں۔

"اگر...... یہ سچ ہے...... اور آپ کو یقین ہے تو...... پھر آپ نے انہیں بتایا کیوں نہیں۔"

وہ مسکرا دیں۔ میلی اور بوسیدہ رضائی کو اپنے چاروں طرف لپیٹتے ہوئے بولیں۔ "کیسی بے عقلی کی باتیں کرتے ہو۔ وہ وہاں کی اتنی بڑی ڈاکٹر ہے۔ اس کی وہاں اتنی عزت ہے۔ لوگ نواب وجاہت علی کی بیٹی کی حیثیت سے اس کا احترام کرتے ہیں...... میں...... اس فقیرانہ حال میں اس سے کہتی۔ میں تمہاری ماں ہوں کون میرا یقین کرتا۔ خود وہ بھی میرے بارے میں کیا سوچتی۔"

وہ دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں۔

"مصیبتوں اور پریشانیوں نے آپ کا یہ حال کر دیا بیگم صاحبہ کہ وہ پہچان نہ سکیں۔ پھر جب وہ آپ سے جدا ہوئی تھیں تو بہت چھوٹی تھیں۔ آپ انہیں بتاتیں۔ نواب صاحب کی انگوٹھی...... اپنی پرانی تصویریں...... نواب صاحب کا وہ آخری خط جو آپ نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ دکھاتیں تو...... بھلا کیسے نہ پہچانتی...... آپ...... اگر اجازت دیں تو...... میں......"

"نہیں...... شامو" ثریا بیگم تڑپ اٹھیں۔ "ایسا ہرگز مت کرنا۔ اگر بالفرض اسے ہماری باتوں کا یقین نہ آیا اور نہ پہچان سکی تو...... یاد رکھو میں...... ایک لمحہ بھی جی نہ سکوں گی۔ میرے لیے یہی کیا کم خوشی اور سکون کی بات ہے کہ...... اسے دیکھ سکتی ہوں...... بات کر سکتی ہوں۔ اللہ جانے فوزیہ کہاں ہے؟" وہ رو پڑیں۔

شاموں کی بوڑھی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

دونوں کتنی ہی دیر تک یونہی روتے رہے۔ پھر شامو دھیرے سے اٹھا چولہا جلا کر پانی رکھا اور ان کے قریب آن کر آہستہ سے بولا۔

"آپ آرام کریں بیگم صاحبہ...... اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

☆

منصور کے خط کو آئے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ گزر چکے تھے۔ اس عرصہ میں کئی بار

نادیہ نے جواب دینے کے لیے سوچا لیکن ہمیشہ ارادے کی تکمیل میں کوئی نہ کوئی چیز رکاوٹ بن جاتی۔

آج اس کی رات فری تھی۔ مریم ڈیوٹی پر تھی۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کیا۔ الماری میں سے خط نکال کر ایک بار پھر پڑھا لیکن جواب دینے کے بجائے وہ بستر پر آن کر لیٹ گئی۔

''بیرسٹر منصور...... مجرم سے اگر یہ پوچھا جائے کہ تمہیں پھانسی کی سزا دی جائے یا نہیں......تو......تم ہی بتاؤ...... وہ کیا جواب دے گا۔ کیا جواب دے سکتا ہے۔'' وہ دکھ سے مسکرادی۔

''تم بھی کتنے کم عقل نکلے منصور کہ بچپن سے لے کر اب تک ایک معمولی سی لڑکی کو نہ سمجھ سکے۔ تم نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ زندگی تماشہ نہیں اور انسان ایک کھلونا بھی نہیں ہے۔ کتنے مزے کی یہ بات ہے تم سب نے مجھے تماشہ بنالیا اور آخر میں کھلونا سمجھ کر کس آسانی سے توڑ ڈالا ہے۔ پھر...... مجھی پر الزام دھرتے ہو۔ چلو وہ بھی اٹھالوں گی۔ اس لیے کہ جس جذبہ کے تقدس اور خلوص پر تمہیں بھروسہ نہیں ہے وہی جذبہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''میرا یہاں آنا اور پریکٹس کرنا اتنا بڑا گناہ تو نہیں تھا جس کی پھوپھی حضور اتنی سنگین سزا دیے جارہی ہیں۔ خدا کی قسم پھوپھی حضور!''

اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

''آپ کو نہیں معلوم کہ...... یہاں تو میں صرف امی حضور کی خاطر رہ رہی ہوں۔ ورنہ...... اس شہر نے تو مجھے دکھ ہی دکھ دیئے ہیں۔ یہاں تو میرا دم گھٹتا ہے۔ اپنی لاوارثی کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے آپ سے کتنی بار یہ بات کہی تھی جب بھی وہ مجھے مل گئیں...... میں آپ کے پاس چلی آؤں گی...... اس وقت تک کے لیے کیا آپ اپنا یہ فیصلہ نہیں روک سکتیں۔''

ہتھیلیوں سے بھیگی ہوئی پلکوں کو پونچھ کر اس نے لمبی سی سسکی لی۔

''ویسے...... منصور...... اگر پھوپھی حضور کی یہی ضد ہے اور تمہاری اپنی مرضی بھی تو...... بخوشی فوزیہ کو اپنا سکتے ہو...... لیکن شاید تم یہ کبھی نہ جان سکو کہ تم سے الگ ہو کر میں کتنی تنہا اور

بے سہارا ہو جاؤں گی۔ آج ان تنہائیوں میں اس بات کا اعتراف کر رہی ہوں کہ میری محبت تو اتنی شدید اور پاگل ہے کہ تم نے اگر کسی اور کی طرف یا کسی اور نے تمہاری طرف دیکھا بھی ہے تو میں تڑپ اٹھی ہوں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ یہ تقدیر کی ستم ظریفی ہے کہ آج جبکہ تم میری اپنی ہی بہن سے شادی کرنے جارہے ہو تو حالات کے سامنے مجبوراً سر جھکا دیا ہے۔ اپنی شکست مان لی ہے۔ خدا کرے تم اور فوزیہ دونوں ہمیشہ خوش رہو۔ میرے سائے سے ہمیشہ دور رہنا کہ سایہ بھی نحوست کی علامت ہوتا ہے۔''

وہ دوبارہ چپ چاپ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

آنسو دھیرے دھیرے رک رک کر بہہ رہے تھے۔

یونہی بہتے رہے۔

اور وہ نہ جانے کب سوگئی۔ صبح ہی صبح مریم کے کھٹکھٹانے پر اس کی آنکھ کھلی تو حیران رہ گئی۔ انہی کپڑوں میں جوتوں سمیت سوگئی تھی وہ ہڑبڑا کر اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

دروازہ کھولنے سے قبل مسہری پر پڑا ہوا خط اٹھا کر الماری میں رکھا آئینہ میں اپنی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں دیکھیں۔

دروازہ کھولا اور مریم کی طرف دیکھے بنا ہی تیزی سے غسل خانہ میں گھس گئی۔

جواب پھر بھی نہیں دیا جاسکا تھا۔

☆

منصور سال ختم ہونے سے پہلے ہی وطن واپس آگیا تھا۔

زندگی میں جب ٹھہراؤ اور سکون نہ ہو تو انسان کا دل کہیں اور کسی جگہ بھی نہیں بہلتا وہ بھی دل اور ذہنی مسرتوں کی تلاش میں اتنی دور بھاگا ہوا گیا تھا لیکن جب وہاں کی دلچسپیاں اور رنگینیاں بھی اس کی کھوئی ہوئی خوشیوں کو نہ لاسکیں تو ایک صبح خاموشی سے اپنا سامان اٹھا کر ایئرپورٹ آگیا۔

منصور کی اس غیر متوقع آمد نے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔ عابدہ بیگم کی تو آدھی بیماری جاتی رہی تھی۔

لیکن منصور کو دیکھ کر یوں لگا جیسے کسی نے اس سے اس کی ساری امنگیں اور خوشیاں چھین کر تہی دامن کر دیا ہو۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے فوزیہ نے منصور کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور وہ کانپ اٹھی تھی۔ سب سے پہلے بھاگ کر منصور کا استقبال کرنے والی کل کی اور آج کی فوزیہ میں میلوں کا فاصلہ ہو چکا تھا۔

"آپ...... کیوں آئے منصور بھائی...... میں نے ہر لمحہ اپنے اللہ سے یہی دعا مانگی تھی کہ آپ نہ آئیں...... کبھی نہ آسکیں۔"

اتنے طویل عرصہ کی غیر حاضری کے بعد دوپہر کے کھانے پر عابدہ بیگم میز پر آئی تھیں۔

لیکن...... فوزیہ موجود نہیں تھی۔

رشید احمد کو تشویش ہوئی۔ پوچھنے پر نوکر نے تایا۔

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کھانا نہیں کھائیں گی۔"

منصور نے سر اٹھا کر نوکر کی طرف دیکھا۔

"جاؤ اسے بلا کر لاؤ...... ورنہ تمام دن بھوکی پڑی رہے گی۔" رشید احمد نے حکم دیا۔

منصور نے سوالیہ نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا۔

اسے قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ حالات اتنے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکے ہوں گے۔

روانگی کے وقت...... پھر اپنے ایک خط میں عابدہ بیگم نے اپنی جس مرضی کا اظہار کیا تھا اسے منصور نے پڑھا ضرور تھا۔ غور بھی کیا تھا لیکن قطعاً قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔ اسے معلوم تھا اماں جان کا غصہ شدید ہوتا ہے لیکن وقتی اس وقتی جوش و غضب میں یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ جب غصہ کم ہوگا تو خود ہی شرمندہ بھی ہوں گی۔ البتہ اسے نادیہ پر ضرور غصہ تھا اسے جانا تھا۔ چلی گئی تھی لیکن عقلمندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک آدھ چکر تو لگا لیتی۔ یا کم از کم میرے خط ہی کا جواب دے دیا ہوتا۔

رہا فوزیہ کے بارے میں کسی اور انداز سے سوچنا، سو وہ اس کے لیے گناہ کے مترادف تھا۔

چند منٹ بعد نوکر واپس آگیا۔

فوزیہ نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔

عابدہ بیگم خاموشی سے سر جھکائے کھانا کھاتی رہیں۔

رشید احمد چپ تھے۔ منصور نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

"کیا طبیعت خراب ہے۔ میں خود جا کر اسے لاتا ہوں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"منصور......" عابدہ بیگم نے آہستہ سے پکارا۔ "کھانا کھاؤ...... وہ نہیں آئے گی۔"

"مگر کیوں...... اماں جان؟" وہ حیران تھا۔

"بتا دوں گی۔ جلدی کیا ہے پہلے کھانا تو ختم کرلو۔"

منصور چپ چاپ بیٹھ گیا لیکن کھانا اس نے بھی نہیں کھایا۔

کھانے کے بعد رشید احمد اور منصور بھی عابدہ بیگم کے کمرے میں آگئے۔

تینوں خاموش...... اپنی اپنی نامعلوم سوچوں میں غرق تھے۔

آخر اس خاموشی کو منصور ہی نے توڑا...... اسے بے چینی تھی۔

"آپ نے بتایا نہیں اماں جان...... آخر فوزیہ کی کیا طبیعت خراب ہے اسے کیا ہوا ہے؟ کہ وہ مجھ سے ملنے بھی نہیں آئی۔"

"وہ...... ملنے آ بھی نہیں سکتی ہے۔" عابدہ بیگم کا بڑا تحکمانہ انداز تھا۔

"کیوں...... مجھ سے...... ملنے کیوں نہیں آ سکتی؟"

"میں نے تمہیں خط میں لکھا تھا۔ پڑھا تو ہو گا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا کہنا مان کر تم جلدی واپس آگئے۔ اب مزید کسی تاخیر کے تم دونوں کے فرض سے نمٹ جانا چاہتی ہوں۔"

"تو...... یہ بات ہے۔" منصور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے نزدیک ہی تخت پر بیٹھ گیا۔

"اماں جان...... جو آپ چاہتی ہیں وہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ غصہ اور ضد میں آ کر آپ نے جو غلط فیصلہ کر لیا ہے اسے ہم پر تھوپنے کی کوشش نہ کریں۔ فوزیہ میرے لیے نازی کی جگہ ہے۔ کسی اور رشتہ کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔"

"منصور...... مجھے حماقت مآب گفتگو قطعی پسند نہیں۔ تم جانتے ہو میں بار بار اپنے فیصلے بدلا نہیں کرتی۔"

"آپ کے نزدیک یہ حماقت ہو گی لیکن معاف کیجیے گا۔ مجھے آپ کے اس فیصلہ سے قطعی اختلاف ہے۔ آخر آپ اس حقیقت کو سمجھتی کیوں نہیں؟"

"میں تم سے زیادہ بہتر طور پر سمجھتی ہوں جو طے کر چکی ہوں وہی ہو گا۔ اگلے ماہ تم دونوں کی شادی ہے۔"

منصور کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ اس کی دونوں مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں کچھ دیر بڑی بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ پھر باپ کے قریب آن کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"ابا جان...... آپ ہی کچھ کہیں...... اماں جان کو سمجھائیں...... یہ کیسے ممکن ہے۔ خدا کی قسم میں یہ شادی نہیں کروں گا، نہیں کر سکتا۔" وہ جھنجلاہٹ میں پھر ٹہلنے لگا۔

"منصور......" رشید احمد کھڑے ہو گئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھاتے ہوئے بولے۔ "اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے بیٹے! آج تو تم آئے ہو۔ تمہارے سامنے ایک مسئلہ پیش کیا گیا ہے سمجھدار ہو۔ اچھی طرح سوچ لو اگر بخوشی اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ...... میں زبردستی کا قائل نہیں۔"

منصور نے سر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں عجیب سی وحشت اور پژمردگی تھی کہ ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"جاؤ......" انہوں نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ "اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو اب اس موضوع پر سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے بڑی مایوسی اور بے بسی سے رشید احمد اور عابدہ بیگم کی طرف دیکھا۔ پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

منصور کے جانے کے بعد رشید احمد واپس کرسی پر بیٹھ گئے۔

خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"بیگم...... آپ کو اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ ورنہ یاد رکھیے منصور اور فوزیہ دونوں ہی اس کو قبول نہیں کریں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ بعد میں آپ کو پچھتانا نہ پڑے۔" وہ ذرا رکے۔ "آپ کو اپنے بیٹے کی شادی ہی کرنا ہے نا...... سو اس کے لیے اس شہر میں نادیہ اور فوزیہ کے علاوہ بھی بے شمار لڑکیاں پڑی ہیں کسی کو بھی منتخب کر لیں۔"

"گھر میں اچھی لڑکیاں موجود ہوں تو...... باہر جا کر لڑکیاں تلاش کرنا کوئی عقلمندی تو نہیں ہے۔"

"گھر کی لڑکیاں اگر اس رشتہ پر راضی نہ ہوں تو...... کرنا ہی پڑتا ہے۔ کرنا پڑے گا۔"

انہوں نے سمجھانا چاہا۔

"آپ جانتے ہیں نادیہ اور منصور کی نسبت بچپن سے طے ہو چکی تھی اب اگر وہ اتنی خود سر اور آزاد ہو گئی ہے تو فوزیہ موجود ہے۔ وجاہت کی خواہش پوری کرنا میرا فرض ہے۔ اس میں کسی کو بھی اعتراض کرنے کی یا ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"کیا خوب۔" رشید احمد کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "وجاہت کی خواہش

پوری ہو جائے خواہ اس کے لیے تین جانوں کا زیاں کرنا پڑے۔ بیگم صاحبہ ناجائز قسم کی ضدیں اکثر و بیشتر پچھتاوے کا باعث بن جاتی ہیں۔" انہیں بھی غصہ آ گیا تھا۔

"ہم لوگ نہیں پچھتاتے...... آپ بے فکر رہیں۔"

"اچھی بات ہے لیکن قابل فکر بھی نہیں۔" وہ کھڑے ہو گئے پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولے۔

"آج اگر وجاہت زندہ ہوتے تو...... وہ بھی اس خواہش کے باوجود بیٹی کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ یہ یاد رکھیے عابدہ بیگم! ان کو اپنی دونوں بیٹیاں جان سے زیادہ عزیز تھیں۔"

اور جواب سنے بغیر باہر نکل گئے۔

☆

شامو کے لیے صبر و ضبط کا امتحان بڑا کٹھن تھا۔

جس امید اور خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے برسہا برس گزار دیئے تھے اتنی صعوبتیں اٹھائی تھیں آج منزل سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ اس کو اپنا نہیں سکتا تھا۔ روزانہ کئی ہفتے سے دوا لینے ہسپتال آتا۔ گھنٹوں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہتا۔ اکثر نادیہ نظر آ جاتی۔ کبھی کبھار دو چار باتیں بھی ہو جاتیں۔ ہر بار اسے دیکھ کر اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کے جسم کا ایک ایک عضو زبان بن کر حقیقت حال بیان کرنے کے لیے تڑپ اٹھتا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اسے ثریا بیگم کی تنبیہہ بھی یاد آ جاتی۔

"تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے شامو!"

اور وہ بڑے حوصلے سے اپنی زبان روک کر مجبوراً واپس پلٹ آتا حالانکہ واپسی پر اس کو دیکھتے ہی ثریا بیگم کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اس طرح اٹھ جاتیں جیسے پوچھ رہی ہوں۔

"تو آج بھی تم نے اسے کچھ نہیں بتایا۔"

آخر برداشت کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے صبر کا پیمانہ کبھی نہ کبھی تو لبریز ہو کر چھلکتا ہے۔

دوا بنوانے کے بعد وہ حسب عادت سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ کافی انتظار کے بعد نادیہ ادھر سے گزری۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیسے بڑے میاں دوا ملی یا ابھی انتظار ہی کر رہے ہیں۔" اس نے رک کر پوچھا۔

”جی...... جی مل گئی۔ ڈاکٹرنی صاحبہ......“

”اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟ اس ہفتہ تو انہیں معائنہ کے لیے آنا تھا۔“

”جی ہاں...... میں نے تو بہت کہا تھا پر میری مانیں تب نا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ اب جب آنا تو ساتھ ضرور لانا۔ چیک اپ بہت ضروری ہے۔“

”اللہ ان پر رحم کرے۔ مجھے تو اچھی ہوتی نظر نہیں آتیں۔“

”اتنے مایوس کیوں ہو...... اب تو پہلے سے بہت بہتر ہیں۔“

نادیہ نے تسلی دی۔

”ڈاکٹر صاحبہ...... جس طرح دیمک اندر ہی اندر لکڑی کو کھا جاتی ہے ویسے ہی ان کو غم اور دکھ اندر ہی اندر کھوکھلا کیے دے رہا ہے۔“

”تم لوگ ان کا بے حد خیال رکھو۔ ورنہ ایسی صورتحال ان کے لیے خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ ہاں...... تمہارے علاوہ ان کی تیمار داری کے لیے اور کون کون ہے گھر پر؟“

شامو کو ہنسی آ گئی۔ ”میرے سوا کون ہو گا میں ہی ان کی تیمار داری کرتا ہوں۔“ نادیہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

”کیوں؟“ وہ حیران تھی۔ ”ان کے شوہر...... بچے رشتہ دار کوئی تو ہو گا۔“ شاموں نے سر اٹھا کر نادیہ کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نادیہ کا دل دکھ گیا۔

”آپ...... آرام سے مجھے بتائیں۔ پریشان نہ ہوں۔ ایسے نفسیاتی مریض کے لیے ذہنی سکون بے حد ضروری ہے۔“

”وہ...... وہ بالکل تنہا ہیں...... میں ان کا ملازم ہوں۔ اللہ رکھے بچے ہیں۔ پر بہت دور ہیں۔“

”تو آپ کو چاہیے بچوں کو اطلاع دے دیں۔ تنہائی اور بچوں سے دوری کا دکھ تو...... انہیں...... خدا نہ کرے ختم ہی نہ کر دے۔ اچھا...... مجھے راؤنڈ پر جانا ہے۔ بہت دیر ہو چکی ہے ایسا کریں کل انہیں لے کر ہسپتال آ جائیں۔ ڈاکٹر صاحب معائنہ بھی کر لیں گے اور میں بھی انہیں سمجھا دوں گی۔ بچوں کو بلوا لیں۔“

نادیہ چلی گئی۔ شامو ایک بار پھر شکست خوردہ سا دوائیں ہاتھ میں لیے واپس آ گیا۔ دوائیں میز پر رکھ کر ان کے پلنگ کے نزدیک ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ ثریا بیگم کی سوالیہ نظریں

اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

”بیگم صاحبہ...... ڈاکٹر نے معائنہ کے لیے کل آپ کو بلایا ہے۔ جانا ضروری ہے۔ ورنہ وہ مجھے بڑا ڈانٹیں گی۔“

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ غالباً شامو کے منہ سے وہ کوئی اور بات سننے کی منتظر تھیں۔

”ٹھیک ہے شامو...... اگر ہمت پڑی تو ضرور چلی جاؤں گی۔“

”ہمت تو کرنا پڑے گی بیگم صاحبہ، ٹیکسی میں بٹھا کر بڑے آرام سے آپ کو لے جاؤں گا۔ فکر نہ کریں۔“ اسے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ تھا۔

”وہ...... آج...... آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ یہ کہ گھر میں کون کون ہے۔ ان کی تیمار داری کون کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔“

”تو...... پھر تو نے کیا بتایا؟“ انہوں نے آنکھیں کھول کر بڑی بے چینی سے پوچھا۔

”کیا بتاتا...... یہی کہ میں ان کا ملازم ہوں۔ میں ہی ان کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ بچے بہت دور ہیں اس بات پر کچھ ناراض سی ہوئیں دور ہیں تو کیا ہوا۔ اطلاع دے کر بلا لینا چاہیے تھا۔“

”اور...... اور کچھ نہیں پوچھا۔ یہ بھی نہیں کہ یہ مریضہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے کتنے بچے ہیں اور دور کیوں ہیں؟ دراصل شامو ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے۔ اتنے برسوں کا فاصلہ اتنی آسانی اتنی جلدی کیسے طے ہو سکتا تھا۔ میں نے پہچانا بھی تو ایسے وقت اور اس حال میں کہ...... اپنی شناخت کراتے ہوئے ڈر گئی۔ تم ہی بتاؤ اگر میں اس سے یہ کہتی ڈاکٹر نادیہ میں تمہاری ماں ہوں اور وہ پلٹ کر فوراً جواب دیتی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے خاتون میرا نام نادیہ ضرور ہے مگر آپ میری ماں نہیں ہیں۔ ہو ہی نہیں سکتیں اس لیے کہ آدمی کا ظاہر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لیے تو میں اس بدتر حالت میں اپنا آپ منوانا بھی نہیں چاہتی میرے لیے تو یہی باعث خوشی اور سکون ہے کہ...... وہ میری اپنی نادیہ ہے۔ میرے سامنے ہے۔ میں اسے دیکھ سکتی ہوں۔ بات کر سکتی ہوں۔ چھو سکتی ہوں۔ ہاں فوزیہ کا خیال ضرور آتا ہے وہ جہاں بھی ہو خوش ہو مطمئن ہو۔“

”آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔ بیگم صاحبہ!“ مبادا ان کی حالت بگڑ جائے شامو

نے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔

''ہاں...... آں...... لاؤ...... پی لوں۔'' دوا پی کر چپ چاپ لیٹ گئیں۔ شامو نے رضائی ٹھیک کر کے اڑھائی۔ پانی کا گلاس ان کے قریب ہی میز پر رکھا اور مطمئن ہو کر کھانے کا انتظام کرنے باورچی خانہ میں چلا گیا۔

☆

شامو دوسرے دن دوا لینے اکیلے ہی ہسپتال چلا گیا۔ ثریا بیگم نے جانے سے پہلے صاف انکار کر دیا تھا۔ دراصل وہ جانا ہی نہیں چاہتی تھیں ان میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ وہ وہاں جا کر اپنا آپ...... اپنا رشتہ اس پر ظاہر کرتیں۔ ان کے دل و دماغ میں ایک خوف تھا ایک اندیشہ تھا جس کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ زمانے نے اتنی ٹھوکریں دی تھیں۔ اتنے امتحان لیے تھے کہ اب وہ کسی بہت بڑی ٹھوکر کسی سخت امتحان کے لیے قطعی تیار نہیں تھیں۔

شاموں دوا لے کر گیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ دور سے ڈاکٹر نادیہ نے اسے دیکھا اسے تعجب ہوا۔ یہ شخص اکیلے ہی آ گیا...... مجھے بتایا بھی نہیں اور اب ملے بغیر ہی جا رہا ہے۔ وارڈ بوائے کو بلانے بھیجا اور خود سیڑھیوں پر ہی رک گئی۔ شاموں نے قریب آن کر بڑے ادب سے سلام کیا۔

''آپ دوا لے کر واپس جا رہے تھے؟'' اس نے حیرانی سے سوال کیا۔ حالانکہ میں نے کہا تھا مریضہ کو لے کر آئیے گا۔ میں نے تو ڈاکٹر سے ٹائم بھی لے لیا تھا۔''

شاموں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''وہ آپ کی مریضہ آخر کیوں نہیں آئیں؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحبہ معاف کیجیے گا...... میں نے تو بہت کہا تھا...... لیکن...... وہ کسی صورت آنے پر راضی نہیں ہوئیں۔''

نادیہ کو کچھ برا سا لگا۔

''کیوں...... نہیں؟ کیا اچھا نہیں ہونا ہے؟ ابھی ان کی بیماری پوری طرح ختم تو نہیں ہوئی ہے۔ کم از کم ڈاکٹر کے بلانے پر تو انہیں آنا چاہیے تھا۔ مریض ڈاکٹر کے کہنے پر عمل نہ کرے تو علاج کرنا بے کار ہے۔''

شامو خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اس خفگی کے لیے حق بجانب تھیں۔ شامو کے پاس ان باتوں کے جواب میں کہنے کے لیے بہت تھا۔ کہنا بھی چاہ رہا تھا لیکن موقع اور وقت دونوں نہیں تھے

''کیا سوچنے لگے آپ...... آپ کو معلوم نہیں کہ اس طرح ڈاکٹر ناراض بھی ہو سکتا ہے مریض کی بے پرواہی انہیں قطعی پسند نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ علاج کرنے سے انکار نہ کر دیں۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحبہ...... ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ دراصل ان کی بھی ایک مجبوری ہے اگر آپ کے پاس تھوڑا بھی وقت ہو تو میں کچھ بتانے کی جرأت کروں۔''

نادیہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''میرے پاس صرف پندرہ بیس منٹ ہیں آپ کو جو کچھ کہنا ہے جلدی سے کہہ دیجیے۔ میرے راؤنڈ کا وقت ہے اور وارڈ میں مریض انتظار کر رہے ہیں۔''

''آپ مجھے صرف یہ بتا دیں کہ آپ...... نواب وجاہت علی کی بیٹی ہیں نا؟''

''جی...... جی ہاں...... پھر؟'' نادیہ کا دل دھڑک اٹھا۔

''نواب صاحب کے ساتھ کیا آپ کی والدہ بھی ختم کر دی گئی تھیں؟''

''لیکن...... آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟ یہ میری ذاتی زندگی کا معاملہ ہے۔'' بڑے میاں کے سوالوں سے اسے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔

شاموں مسکرا دیا۔ ''آپ بھروسہ رکھیں...... میں غلط آدمی نہیں ہوں۔ میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ شاید آپ کی والدہ کے بارے میں کچھ بتا سکوں۔''

نادیہ کو اچانک طور پر کرم داد یاد آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی زمیندار صاحب بھی، ابا حضور کو کرم داد نے پناہ دی تھی۔ لیکن پھر وہ۔

وہ کانپ سی گئی۔ آج پھر وہی پرانی تاریخ نہ دہرائی جانے والی ہو۔ پیسہ بڑی ظالم چیز ہے۔ اب تو اس میں ابا حضور کے لیے کوئی بری خبر سننے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔

''تمہارا...... نام...... شامو تو نہیں ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

شامو کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسکرا دیا۔

''جی...... جی جی...... میں ہی نواب صاحب کا پرانا خدمت گار شامو ہوں۔''

نادیہ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں کپکپاہٹ تھی۔

''تو...... امی حضور کو...... تم ہی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔''

''جی ہاں...... نواب صاحب کا میرے لیے آخری حکم یہی تھا۔ شامو تم کسی طرح بھی بیگم صاحبہ کو لے کر گلزار نگر سے نکل جاؤ۔ ان کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے۔ اور میں خوش اور مطمئن ہوں ڈاکٹر صاحبہ کے مرنے کے بعد اپنے صاحب اور خداوند تعالیٰ کے سامنے سرخرو ہوں گا۔''

''وہ...... ہیں کہاں؟'' نادیہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''خیریت سے تو ہیں...... کہیں تم نے بھی کریم داد کی طرح ان کے بھروسہ کا خون تو نہیں کر دیا۔''

''مجھے شرمندہ نہ کریں نادیہ بی بی...... کریم داد کی حرکت نے ہمیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا...... آپ...... میری وفاداری پر تو شک نہ کریں۔''

''تو...... امی...... حضور...... کیا؟'' وہ خواب کے عالم میں بول رہی تھی۔

''وہ میرے پاس ہیں...... خیریت سے ہیں۔''

''کیا...... واقعی...... امی حضور...... زندہ ہیں؟'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

سارا جسم منوں برف میں دھنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کیا سچ ہے، کیا جھوٹ ہے ان کے بیچ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

''آپ پہچان ہی نہ سکیں نادیہ بی بی...... بیڈ نمبر 8 کی مریضہ تو بیگم صاحبہ ہی تھیں۔''

یہ انکشاف بڑا جان لیوا تھا۔ نادیہ چند سیکنڈ تک پھٹی پھٹی نظروں سے اسے تکتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں بڑی وحشت تھی۔

''تم جھوٹ...... بول رہے ہو۔ وہ میری امی حضور نہیں تھیں۔ ہو ہی نہیں سکتیں۔''

''آپ میری بات کا یقین کریں۔'' شامو نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''آپ کو کیا معلوم انہوں نے ان گزرے سالوں میں کتنے دکھ، کتنی سختیاں جھیلی ہیں کتنے سال روپوشی میں گزارے ہیں۔ کئی کئی ماہ باغیوں کے خوف سے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو پیدل سفر کیا ہے۔ جب گلزار نگر کے حالات سنبھلے تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کئی سال ذہنی مریضہ رہنے کے بعد اب جا کر اتنا بہتر ہوئیں کہ لوگوں کو پہچان سکتی ہیں۔''

''تم...... انہیں لے کر میرے پاس کیوں نہیں آ گئے۔ میرے ہوسٹل کا پتا تو معلوم تھا۔''

نادیہ کی آواز میلوں دور سے آتی ہوئی معلوم دے رہی تھی۔

شاموں کے ہونٹوں پر پژمردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''وہ اس قابل ہوتیں تب نا...... وہ تو اپنے حواس ہی کھو بیٹھی تھیں۔ کسی سے ملنا تو بڑے دور کی بات تھی۔''

نادیہ سکتہ کے عالم میں خاموش کھڑی تھی۔

امی حضور...... واقعی اسے یوں مل جائیں گی۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔

''آپ کا نام معلوم ہونے کے بعد انہوں نے آپ کو پہچان لیا تھا لیکن حیثیتوں کے فرق کی وجہ سے انہوں نے اپنی زبان بند رکھی کہ کہیں آپ کی بے عزتی نہ ہو جائے۔''

''امی...... حضور......'' نادیہ نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ لیکن سارا جسم نامعلوم سی ٹھنڈک میں پگھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''وہ تو گلزار نگر آ کر علاج کروانا بھی نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں تو اس شہر کے نام سے نفرت ہو چکی تھی۔ ''لیکن......'' وہ تھوڑی دیر رکا پھر بولا۔ ''جب مرض لاعلاج ہو گیا تو...... بے ہوشی کے عالم میں میں انہیں یہاں لے آیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ اس ہسپتال کی اتنی بڑی ڈاکٹر ہیں۔''

نادیہ ستون سے ٹیک لگائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر بہت آہستہ لیکن فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''میں ابھی...... تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔''

''پھر تو...... وہ بہت خوش ہو جائیں گی۔''

''تم رکو...... میں ابھی آئی۔'' اندر جا کر ہیڈ نرس کو یہ بتا کر کہ وہ کسی مریض کو ایمرجنسی میں دیکھنے جا رہی ہے۔ باہر آ گئی۔

''سنو...... اندر جا کر انہیں ایک دم سے ساری حقیقت نہ بتا دینا۔ اس قسم کے مریض کے لیے اچانک خوشی، اچانک غم نقصان دہ ہوتا ہے۔''

گاڑی کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں وہ شامو کو سمجھاتی رہی۔

اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سرد تھے۔

گھر پہنچ کر شامو نے دروازہ کھولا۔ سامنے ہی پلنگ پر ثریا بیگم لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کی

نظریں ہمیشہ کی طرح دروازے پر تھیں۔

"بیگم صاحبہ! ڈاکٹرنی صاحبہ آپ کو دیکھنے آئی ہیں۔"

وہ ایک دم سے یہ انہونی خبر سنانا نہیں چاہتا تھا۔ نادیہ چند سیکنڈ بعد اندر داخل ہوئی اس کے قدم کانپ رہے تھے۔

"کون...... نا......" وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ لیٹ گئیں۔

نادیہ کا اپنا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ ایک لمحہ رک کر اس نے ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اس چھوٹے سے کچے مکان میں بان کے پلنگ پر میلی سی رضائی اوڑھے اس کی ماں تھی۔ کہاں وہ محل اور خوبصورت قیمتی چیزوں سے آراستہ کمرہ اور کہاں یہ...... پھر بھی اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا امی حضور جس حال میں بھی ہیں مل تو گئیں۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے نزدیک آئی۔

"آپ کی...... طبیعت کیسی ہے؟ میں نے آپ کو بلوایا تھا۔"

آواز میں کپکپاہٹ تھی لیکن...... چہرے پر بلا کا ضبط تھا۔

ثریا بیگم پلک جھپکائے بغیر حیرانی سے اس کے چہرے کو تک رہی تھیں۔

شاید انہیں اس حقیقت کا یقین نہیں تھا۔ کتنی ہی بار خوابوں میں بھی وہ نادیہ کو اس طرح اپنے سامنے دیکھ چکی تھیں۔

شامو نے کرسی پلنگ کے قریب رکھ دی۔ "بیٹھ جائیے ڈاکٹرنی صاحبہ!"

نادیہ کرسی کی طرف دیکھے بغیر۔ ان کی پٹی پر ٹک گئی اور اپنا کانپتا ہوا ہاتھ ان کی پیشانی پر رکھ دیا۔ ثریا بیگم نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کا چہرہ خوفناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔ نادیہ نے فوری طور پر بیگ سے دوا نکالی شامو سے چمچہ لے کر اس میں ڈالی اور آہستہ سے ان کو پلا دی ان کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ نادیہ نے غور سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ غالباً وہ اس کھنڈر نما عمارت میں وہ نقوش تلاش کر رہی تھی جو آج تک اس کے دل پر نقش تھے۔ سالوں گزر جانے کے باوجود کسی لمحہ بھی وہ انہیں بھلا نہیں سکی تھی۔ اسے اپنے آپ پر غصہ بھی تھا اور تعجب بھی کہ اتنے دنوں تک ہسپتال میں ان کا علاج کرنے کے باوجود وہ انہیں کیوں نہ پہچان سکی۔ حالانکہ آج کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ انہیں بخوبی پہچان گئی تھی۔

اس کے سرہانے رکھی ہوئی تصویر اور اس مٹی مٹی تصویر میں کتنی مماثلت تھی۔ "تو...... واقعی...... امی...... حضور زندہ ہیں۔ وہ مجھے مل گئی ہیں۔"

وہ بے چین ہو اٹھی۔

"امی...... حضور۔" اس نے بہت ہی دھیرے پن سے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آواز دی۔ ثریا بیگم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ چند سیکنڈ تک وہ اسے غور سے دیکھتی رہیں۔ پھر ان کے کمزور اور بے جان سے ہاتھ تیزی سے اٹھے اور انہوں نے اپنی پوری طاقت سے نادیہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"میری...... بچی!" وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ نادیہ بھی گھبرا گئی اس نے جلدی جلدی دوائیں دیں۔

آخر ایک گھنٹہ بعد جب ان کی حالت قدرے سنبھلی تو نادیہ نے مسکراتے ہوئے ان کی پیشانی چوم لی۔

"آپ واقعی مجھے مل گئی ہیں امی حضور......"

وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"کسے امید تھی کہ میں تمہیں دیکھ سکوں گی۔ تم سے مل سکوں گی۔ خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے یہ سچ ہے کہ تیرے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔"

"فوزیہ...... کہاں ہے؟" انہیں فوراً ہی وہ یاد آگئی۔

"وہ اسلام پور میں پھوپھی حضور کے پاس ہے۔ خوش ہے۔"

نادیہ نے اپنا چہرہ ان کے چہرہ پر رکھ دیا۔

"میں نے ان سب سے کہا تھا...... گھ ارنگر اس وقت تک نہیں چھوڑوں گی جب تک میری امی مجھے نہیں مل جاتیں...... اللہ میاں! آپ بہت پیارے ہیں۔ آپ نے میری ضد پوری کر دی۔ میرا مان رکھ لیا۔"

"میں نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہی کہا تھا نادیہ کہ مجھے اس وقت تک موت نہ آئے جب تک میں اپنی بچیوں سے نہ مل لوں۔ یوں کرو...... تم فوزیہ کو بلوا لو میرا کیا بھروسہ۔"

"ایسی باتیں تو نہ کریں امی حضور!...... آپ کی بیٹی ڈاکٹر ہے۔ آپ کا علاج میں کروں گی۔ جب آپ بالکل تندرست ہو جائیں تو تب...... اچانک آپ کو لے کر اسلام پور

جاؤں گی۔ سب حیران رہ جائیں گے۔ کتنے خوش ہوں گے۔ فوزیہ تو خوشی سے بوکھلا جائے گی۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی کہ...... آپ مجھے مل گئی ہیں۔'' ثریا بیگم نے اس کی پیشانی پر ڈھیر سارے پیار کر لیے۔

شاموں دور کھڑا ہنس بھی رہا تھا اور رو بھی...... کسی کا خلوص اور محنت رائیگاں نہیں جاتی۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کے ایک دوست منصور صاحب بڑی دیر سے آپ کے منتظر ہیں۔'' نرس کی اطلاع پر وہ چونک اٹھا۔ وارڈ کا راؤنڈ لے کر واپس آیا ہی تھا کہ نرس نے یہ غیر متوقع خبر سنائی۔

''منصور۔'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں آیا سچ مچ ہی منصور اس کا منتظر تھا۔

''ہیلو...... بیرسٹر صاحب...... کیسے بھول پڑے۔'' عامر نے اندر داخل ہوتے ہوئے پُرجوش آواز میں استقبال کیا۔

''ہیلو۔ ڈاکٹر تم کیسے ہو؟'' منصور نے اس سے زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

''تمہیں معلوم ہے گھنٹہ بھر سے انتظار کر رہا ہوں اور جناب ہیں کہ کسی صورت میں تشریف ہی نہیں لا رہے تھے۔'' وہ آگے بڑھ کر عامر سے بغلگیر ہو گیا۔

''صبح کا بھولا اگر شام کو آ جائے......''

''تو اسے مجبور کہتے ہیں۔'' منصور نے جلدی سے عامر کا ادھورا جملہ پورا کر دیا۔

دونوں ہنستے ہوئے وہیں صوفے پر بیٹھ گئے۔

''خدا کی قسم منصور! تم جیسا بے پرواہ اور بے مروت دوست مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ یاد ہے کتنے سالوں کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ یقین جانتا جب نرس نے تمہاری آمد کی خبر سنائی تو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا۔ پھر سوچا کہلا دوں یہاں کوئی ڈاکٹر عامر نہیں ہوتا۔''

''یہ جملہ کہلواتے تو میں وارڈ میں آن کر مریضوں کے سامنے گردن دبا تا۔''

''تم بہت کمینے ہو۔''

"کیوں شرمندہ کرتے ہو ڈاکٹر بھلا تمہاری برابری کر سکتا ہوں۔" منصور نے برجستہ کہا اور دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

عامر نے گھنٹی بجا کر نوکر سے کافی لانے کے لیے کہا پھر منصور سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اب بتاؤ یہ ایکا ایکی مجھ ناچیز کی یاد کیسے آ گئی؟"

ایک لمحہ کے لیے منصور کے چہرے کا رنگ بدلا پھر فوراً ہی ہنستے ہوئے بولا۔

"یہ نہ سمجھنا کہ تم جیسے اناڑی ڈاکٹر کے پاس علاج کروانے آیا ہوں۔"

"کیا سمجھتے ہو کہ میں تم جیسے فراڈ بیرسٹر کا علاج کر کے کیا اپنے آپ کو پھنسواتا۔" حضور کو ہنسی آ گئی۔ "ویسے دوست تم صحیح سمجھے میں علاج ہی کروانے آیا ہوں۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو۔ بیمار ایسے تو نہیں ہوتے۔" عامر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو آپ کے خیال میں بیمار کیسے ہوتے ہیں؟"

"فضولیات بند اس لیے کہ آپ ضرورت سے زیادہ صحت مند اور سرخ و سفید نظر آ رہے ہیں۔"

"وہ تو ہمیشہ سے ہوں پھر بھی کچھ بیماریاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتیں۔ یہ ڈاکٹر کا کمال ہے کہ ان کی تشخیص کرے۔"

"بیرسٹر منصور صاحب! میں ایک ڈاکٹر ہوں کان کن نہیں کہ آپ کے جسم کے اندر سے کھود کر بیماری برآمد کروں۔" منصور ہنس دیا۔

دراصل وہ نادیہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ اس سے ملنے آیا تھا۔ یہاں آن کر براہ راست ملنے کے بجائے وہ عامر کے پاس چلا آیا تھا اور اب اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ آخر عامر نے خود ہی اس کی مشکل کو حل کر دیا۔

"علاج کروانا ہے تو ڈاکٹر نادیہ سے کرواؤ۔ تمہاری منگیتر کامیاب ڈاکٹر ہے۔" نادیہ کی تعریف سن کر منصور کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آہستہ سے بولا۔

"تم بڑے کائیاں۔ ہو ارے میں اسی سے ملنے آیا ہوں۔ وہ ہے کہاں ذرا بلواؤ تو۔"

عامر نے معنی خیز نظروں سے منصور کو گھورا پھر زور سے ہنس پڑا۔ اسی لمحہ نوکر کافی کی ٹرے لیے اندر آ گیا۔ پیالی تھامتے ہوئے منصور نے سوالیہ نظروں سے عامر کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا ٹالتے ہوئے بولا۔

"اور کہو امی ابا جان کیسے ہیں۔ نازلی تو مزے میں ہے؟"

"ہاں..... آں..... سب او کے ہے۔" منصور نے کافی کا گھونٹ لے کر سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "خیر و عافیت بعد میں پوچھنا پہلے نادیہ کو بلواؤ۔"

عامر کو ہنسی آ گئی۔ "خدا کی پناہ اتنی بے صبری، کچھ توقف تو کرو۔"

"وہ تو کر لیتا لیکن میرے پاس بھی زیادہ وقت نہیں ہے اور مجھے اس سے بہت ضروری ملاقات کرنی ہے۔" منصور سنجیدہ تھا۔

عامر بھی سنجیدہ ہو گیا۔ دھیرے سے بولا۔

"منصور! کافی دنوں سے وہ ہسپتال میں کم ہی نظر آتی ہے۔ آج بھی صبح سے گئی ہوئی ہے۔"

"مگر..... کہاں؟" منصور کے لیے یہ اطلاع بڑی حیران کن تھی۔

"میں نے کہا نا..... کافی پی لو پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ میں خود تم سے ملنا چاہتا تھا۔" منصور نے پیالی میز پر رکھ دی۔

"عامر! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ایک گھنٹے بعد مجھے کورٹ پہنچنا ہے۔"

"وقت نہیں تھا تو آئے کیوں تھے؟"

"ایک نہایت اہم اور ضروری کام کے سلسلہ میں۔"

"کس سے..... مجھ سے۔ یا ڈاکٹر نادیہ سے؟"

"نادیہ سے۔" منصور نے بتایا۔

عامر گردن جھکائے چند سیکنڈ کچھ سوچتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"مجھے افسوس ہے میرے دوست کہ اس وقت وہ ہسپتال میں موجود نہیں ہیں اور کب آئیں گی اس کا بھی کسی کو قطعی علم نہیں۔"

"کسی مریض کو دیکھنے گئی ہے؟"

"نہیں۔" عامر نے کافی کا آخری گھونٹ لے کر پیالی میز پر رکھ دی۔

"پھر کہاں گئی ہے؟ کسی کو بتا کر نہیں جاتی؟" منصور بے چین سا ہو گیا تھا۔ عامر نے منصور کے پریشان چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔

"اسی سلسلہ میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ صبح مشکل سے گھنٹہ دو گھنٹہ ڈیوٹی اٹینڈ کر کے اچانک کسی کو بتائے بغیر ہی چلی جاتی ہیں۔ پھر رات گئے کب واپس آتی ہیں کسی کو نہیں معلوم۔"

''آخر کہاں جاتی ہے۔ کہاں رہتی ہے تم لوگوں نے پوچھا تو ہوتا؟'' منصور کی آواز میں بے شمار اندیشے تھے۔

''اتنا موقع ہی نہیں دیتیں۔ اب تو اسٹاف میں بھی ان کے لیے عجیب عجیب باتیں ہونے لگی ہیں۔''

منصور نے سر جھکا لیا کچھ دیر تک نامعلوم سوچوں میں ڈوبا رہا پھر سر اٹھا کر دھیمی آواز میں بولا۔

''یہ کب سے ہے؟''

''پندرہ دن سے زیادہ ہو چکے ہیں۔'' عامر خود بھی افسردہ تھا۔

''لیکن عامر...... نادیہ کمزور لڑکی نہیں ہے۔ وہ بھٹک نہیں سکتی۔''

''فرشتہ بھی نہیں ہے۔ جوان اور خوبصورت ہے۔''

''اس کے باوجود...... میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کر سکتا۔ تم نے سختی سے پوچھا ہوتا۔''

''کئی بار پوچھا لیکن ہر بار ٹال گئی۔ ویسے ان دنوں وہ جتنی خوش نظر آتی ہیں اس سے پہلے کبھی بھی اتنی مطمئن اور مسرور نظر نہیں آئیں۔'' منصور کھڑا ہو گیا اور عامر نے بھی کرسی چھوڑ دی۔

''منصور!'' عامر اس کے قریب آ کر کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تم دونوں کے رشتہ کے بارے میں جانتا ہوں۔ یہ بھی کہ تم دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہو لیکن ایک بات پوچھوں؟ چھپانا نہیں کہ ان دس گیارہ مہینوں میں ایسی کون سی بات ہوئی جس نے ڈاکٹر نادیہ کو تم سب سے اور تم سب کو ان سے بیزار سا کر دیا۔ پچھلے کئی ماہ سے انہوں نے ہنسنا تو درکنار دوسروں سے بات تک کرنا چھوڑ دی تھی۔ کام اور صرف کام، ان کی زندگی کا مقصد بن گیا تھا لیکن اب ان پندرہ بیس دنوں سے ان کے پژمردہ چہرے پر مسرتوں کی چمک دیکھ رہا ہوں لیکن پوچھنے کی ہمت نہیں ہے۔'' منصور تیزی سے پلٹا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''عامر!'' وہ اسے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ ''تم اگر میرے دوست ہو تو مجھ سے کوئی بات نہیں چھپانا۔ وہ کہاں جاتی ہے؟ کس سے ملتی ہے؟ کون سی ایسی ہستی مل گئی جسے پا کر وہ اتنی خوش اور مطمئن ہے؟''

''یقین کرو منصور...... اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں جانتا مجھے خود ان حالات پر تشویش ہے۔''

''یہاں کوئی ملنے آتا تھا؟'' منصور نے ٹوٹے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔

''سوائے مریضوں اور ان کے گھر والوں کے میں نے تو کبھی کسی بھی مرد کو ان کے پاس آتے نہیں دیکھا۔''

''رات کس وقت واپس آتی ہے؟ میں انتظار کر لوں گا۔''

''بے کار ہے۔ اس لیے کہ کبھی تو دس گیارہ بجے تک واپس آ جاتی ہے اور کبھی......'' وہ جھجک کر رک گیا۔

''اور کبھی کیا......؟ رک کیوں گئے بتاؤ نا۔'' منصور تڑپ اٹھا تھا۔

''اور کبھی کبھی صبح آتی ہیں۔'' بڑا دل شکن انکشاف تھا۔

''ہوں......'' منصور نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا پھر فوراً ہی اٹھتے ہوئے بولا۔

''میں سمجھ گیا شاید اس لیے وہ یہاں رہنے پر بضد تھی۔ اسی لیے وہ میری امی حضور، ابا میاں اور فوزیہ سب کو ناراض کر کے ان کی پرواہ کیے بغیر چلی آئی تھی۔ آخر میں تو وہ اس رشتہ پر بھی خوش نہیں تھی۔ ٹھیک ہے مجھے بھی ایسی لڑکی کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں۔'' وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا پھر جاتے جاتے رکا پلٹ کر بولا۔

''اس سے ملاقات ہو تو کہہ دینا میں آیا تھا لیکن تمام حالات معلوم ہونے کے بعد اب کبھی نہ ملنے کے لیے واپس جا رہا ہوں اور یہ کہ نئے لوگ نئی خوشیاں مبارک ہوں۔ پرانے لوگ اس کے لیے مر چکے ہیں۔ واپس پلٹ کر آنے کی کوشش نہ کرے۔'' اور باہر نکل گیا۔ عامر ششدر کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کے قدموں میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ آگے بڑھ کر اسے روک سکتا۔ نہ گویائی میں وہ طاقت تھی کہ تسلی کے دو لفظ بول سکتا۔ وہ آنکھیں پھاڑے کھلے دروازے پر تکتا رہا۔

باہر گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی تیزی سے بیک کی گئی اور طوفانی آواز کے ساتھ باہر نکل گئی۔

''دوست اللہ حافظ و ناصر ہے۔'' وہ نڈھال ہو کر صوفے پر ٹک گیا اس کا جسم کمرے میں تھا لیکن ذہن اپنی تمام سوچوں کے ساتھ ڈاکٹر نادیہ کے سامنے تھا۔

تم تو اتنی پتھر اور بے حس ہو ڈاکٹر نادیہ وجاہت علی کہ اس غریب کو بھی جھوٹی محبت کے دلاسے دے کر یوں بے دردی سے چھوڑ ڈالا۔ میں تو غیر تھا۔ انجانے میں تمہاری ذات سے حسین خواب کے تانے بانے بن لیے۔ اب تک پچھتا رہا ہوں وہ تمہارا اپنا تھا۔ اس کا کیا قصور تھا۔ اسے کیوں بے دردی سے بیچ راستے میں چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ ہو لیں۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے کم از کم اسے بتا تو دیتیں۔ آج جس طرح وہ چکنا چور ہوا ہے۔ تم اس کا احساس بھی نہیں کر سکتیں۔

عامر نے بند آنکھیں کھول دیں۔ بال ٹھیک کیے اور کوٹ پہن کر باہر نکل آیا۔

☆

اپنوں کی بیگانگی اور اپنوں کے دیئے ہوئے دکھ انسان کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔ ان ریزوں کو سمیٹ کر یا تو وہ باغی ہو جاتا ہے یا اپنا آپ موت کے حوالے کر دیتا ہے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ وقت بڑا ظالم ہے لیکن اصل میں سب سے بڑا ظالم تو خود انسان ہے جو تصنع اور خود غرضی کا بیش بہا لبادہ اوڑھ کر کس آسانی سے بہت سے اپنوں کی آرزوؤں کو کچلتا ہوا گزر جاتا ہے اور احساس تک نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر عامر اپنی ڈیوٹی پر جا رہا تھا کہ کوریڈور میں نادیہ سے ملاقات ہو گئی۔

''ہیلو ڈاکٹر نادیہ...... خیریت سے تو ہیں؟'' وہ رک گیا۔

''ہیلو ڈاکٹر عامر!...... آپ کیسے ہیں؟'' وہ مسکرا دی۔

''خدا کا شکر ہے۔ وارڈ کا راؤنڈ لے کر واپس آ رہی ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں...... اور غالباً آپ جا رہے ہیں؟'' وہ کچھ جلدی میں تھی۔

''پھر تو ٹھیک ہے۔ چلیں ایک ایک کپ چائے ہو جائے۔'' عامر نے دعوت دی۔

''سوری ڈاکٹر عامر میں اس وقت جلدی میں ہوں پھر کبھی سہی۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے زیادہ سے زیادہ دس منٹ ضائع ہوں گے۔'' عامر نے سنجیدگی سے کہا۔ نادیہ ہنس دی۔

''آج کل تو آپ روزانہ ہی باہر کے ضروری کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔'' عامر کے طنز کو محسوس کرنے کے باوجود وہ مسکرا دی۔

''ایسی ہی بات ہے پھر کسی دن آپ سے چائے ضرور پیوں گی۔''

''ڈاکٹر نادیہ۔'' ڈاکٹر عامر کے لہجے میں نہایت سنجیدگی تھی۔ ''کل منصور آپ سے ملنے آئے تھے۔''

''منصور۔ مجھ سے ملنے آئے تھے؟'' وہ چونک اٹھی۔

عامر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ چہرے پر بیک وقت متضاد کیفیات نظر آئیں۔ مسرت...... حیرانی اور دکھ۔

لیکن فوراً ہی اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پا کر آہستہ سے بولی۔

''یہ بتایا کہ کیوں آئے تھے۔ کوئی پیغام؟''

''آپ سے ملنے آئے تھے غالباً کسی اہم مسئلہ پر بات کرنی تھی۔ نہ ملنے پر رنجیدہ ہو کر چلے گئے۔''

''آپ نے انہیں کیا بتایا؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''کیا بتاتا ڈاکٹر نادیہ۔ یہی نا کہ کچھ عرصہ سے آپ ہسپتال میں کم اور باہر زیادہ مصروف رہتی ہیں۔''

''خدا کی پناہ آپ نے یہ کیوں کہہ دیا؟ آپ نہیں جانتے وہ کتنے الٹے دماغ کا ہے۔ آپ کے اس جملہ سے وہ نامعلوم کتنی کہانیاں گھڑ لے گا۔'' وہ جھنجلا گئی تھی۔

ڈاکٹر عامر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میرے خیال میں...... میں نے غلط تو نہیں کہا۔ روزانہ جو کچھ خود دیکھ رہا تھا وہی اس کو بھی بتا دیا۔''

''آپ کے اس کہنے پر کیا ردعمل ہوا۔ ناراض تھا؟''

وہ زور سے ہنس پڑا لیکن فوراً سنجیدگی سے بولا۔

''ڈاکٹر نادیہ کسی کی ناراضگی یا خوشی سے آپ کو کیا فرق پڑے گا۔ آپ کو دوسروں کی فکروں اور پریشانیوں میں شیئر کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ آپ جس راستہ پر جا رہی ہیں اگر وہ آپ کو آپ کی کھوئی ہوئی مسرتیں واپس کر سکتا ہے تو کبھی کسی کی بھی پرواہ نہ کریں۔ ہاں کسی کو جھوٹے سہارے میں نہ رکھیں۔''

''آپ کی اس لمبی چوڑی تقریر کا مفہوم میری سمجھ سے باہر ہے ڈاکٹر عامر! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مجھے نہیں معلوم۔ ہاں یہ ضرور کہوں گی کہ یہ راستے میں نے خود تلاش کیے

ہیں۔ کسی نے میری انگلی تھام کر سہارا نہیں دیا ہے۔ رشتوں کی اہمیت اور افادیت پر سے میرا اعتبار اٹھ چکا ہے اس بارے میں کچھ کہنا یا جاننا بے کار ہے۔" وہ جانے کے لیے مڑ گئی۔

"ڈاکٹر نادیہ بس ایک منٹ۔" اس نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔ "منصور صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں کہ اب کبھی نہ ملنے کے لیے واپس جا رہا ہوں اور یہ کہ آپ کو نیا ساتھی، نئی زندگی، نئی خوشیاں مبارک ہوں۔" نادیہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے ایسے تلخ جملے کی توقع نہیں تھی۔ آنکھیں شدت غم اور غصہ سے پھٹی ہوئی تھیں۔

"ڈاکٹر عامر!" اس کے صبر وضبط کا زبردست امتحان تھا۔ "تو اس کے پست خیالات کی اڑان یہیں تک تھی۔ کتنی کم ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے اس نے۔ مجھے دکھ تو اس بات کا ہے کہ وہ شخص اتنے چھوٹے دل اور چھوٹی ذہنیت کا مالک نکلا ہے جس کی رگوں میں میرا اپنے باپ کا خون بھی ہے۔" اس کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا تھا۔

"اتنا بڑا اور آخری فیصلہ کرنے سے پہلے کم از کم مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا۔ خیر مجھے بھی اب کسی کی پرواہ نہیں۔" وہ غصہ سے پیر پٹختی سیڑھیاں اتر گئی۔

☆

عابدہ بیگم سخت ناراض تھیں لیکن اس حالت میں بھی انہوں نے شادی کے سارے انتظامات مکمل کر لیے تھے۔

یہ بھی عجیب وغریب تقریب تھی۔ جس نے بیک وقت اس گھر کے افراد کو پژمردہ بھی بنایا ہوا تھا اور پر مسرت بھی۔

جس کی تیاریوں میں بیزاری اور بے دلی شامل تھی۔

جس میں ڈھولک کے گیتوں کے بجائے سہمی سہمی آہیں تھیں۔ جہاں قہقہوں کی جگہ آنسوؤں نے لے لی تھی۔ مانگے کی مسکراہٹوں نے تصنع، بناوٹ کا لباس پہن لیا۔

منصور کی اچانک اور غیر متوقع رضامندی پر سوائے عابدہ بیگم کے سارا گھر حیران و پریشان تھا۔ عابدہ بیگم کسی حد تک مطمئن تھیں اور خوش بھی کہ سعادت مند اولاد نے ان کا بھرم رکھ لیا۔

فوزیہ بے جان سی اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔

نازلی آ گئی تھی لیکن گھر کے اس ویران اور بیزار کن ماحول میں ہر طرف بولائی بولائی

پھرا کرتی۔ فوزیہ کے پاس جاتی تو وہ نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔

عابدہ بیگم بخار میں آنکھیں بند کیے خاموش پڑی رہتیں۔

منصور صبح کا نکلا رات گئے اس وقت گھر میں داخل ہوتا جب سب سو چکے ہوتے۔

شادی میں صرف دو ہفتے باقی تھے۔

ایک دن عابدہ بیگم کا بخار قدرے کم ہوا تو بہت دنوں بعد وہ بستر سے اٹھ کر باہر برآمدے میں آ کر بیٹھیں۔ نازلی نے اپنے ہاتھ سے انہیں سوپ پلایا دوائیں دیں پھر قریب ہی بیٹھ کر سر دبانے لگی۔ کچھ دیر بعد عابدہ بیگم نے آہستہ سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"بس کرو میری جان تھک جاؤ گی۔"

"آپ کی بیٹی اتنی نازک بھی نہیں ہے۔" نازلی نے ماں کے ہاتھ چوم لیے۔ "اچھا نازلی بیٹا میرا ایک کام تو کرو۔ ذرا میری الماری کھول کر دیکھو تو اس دن نکاح کا دوپٹہ بن کر آیا تھا۔ کریمن بوا نے ٹھیک سے کپڑے میں لپیٹ کر ڈبہ میں رکھا ہے یا یونہی ڈال دیا ہے۔"

نازلی نے غور سے ماں کی طرف دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔ اپنی جگہ سے بھی نہیں اٹھی۔

"جاؤ اٹھو نا...... میں کیا کہہ رہی ہوں۔" انہوں نے ڈانٹا۔

"اماں جان!" نازلی اٹھنے کے بجائے ڈرتے ڈرتے بولی۔ "ایک بات کہوں۔ ناراض مت ہوئیے گا۔ خدا کے لیے شادی کی تاریخ بڑھا دیجیے۔ ان حالات میں شادی تو کیا مرنا بھی کوئی پسند نہیں کرے گا۔"

"کیوں بری زبان نکالتی ہو۔ اللہ میرے بچوں کی عمر دراز کرے۔" وہ برا مان گئیں۔

"اماں جان...... میں اپنے بھائی کی دشمن تو نہیں ہوں۔ میرے دل میں ان کی شادی کے بڑے ارمان ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ ابھی بھی وقت ہے۔ آپ یہ ضد چھوڑ دیں اور اس رشتہ کو یہیں ختم کر دیں۔ اس میں آپ کی اور ہم سب کی بھلائی ہے۔" عابدہ بیگم نے گھور کر نازلی کی طرف دیکھا پھر بڑے سخت لہجہ میں بولیں۔

"تمہاری ان دونوں باتوں میں سے ایک بات بھی ماننا میرے لیے ناممکن ہے۔"

"آپ کو سمجھانا بڑا مشکل ہے۔ لیکن تاریخ بڑھا دینے میں تو کوئی حرج نہیں۔ آپ اتنی بیمار ہیں۔ بستر سے اٹھ نہیں سکتیں اور گھر میں شادی کا ہنگامہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کچھ تو سوچیے۔"

"بے وقوف لڑکی اسی لیے تو تاریخ بڑھائی نہیں جا سکتی۔ میرا اب کوئی بھروسہ نہیں

نازلی! نہ جانے کب بلاوا آ جائے۔ یہ شادی مجھے اپنی زندگی میں کرنی ہے۔'' نازلی مسکرا دی۔

''آپ کی بیماری کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی بے جوڑ شادی ہے اماں جان! غلط قسم کی ضد، غم و غصے نے آپ کی یہ حالت بنا دی ہے۔ خدا کے لیے اس کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ یہ رشتہ ان دونوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ منصور بھائی تو ملک چھوڑ کر چلے جائیں گے لیکن فوزیہ مر جائے گی۔''

''تو مر جائے۔'' وہ غصہ میں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''منصور بھائی کی ساری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ آپ یہ شادی محض اپنی بات پوری کرنے اور نادیہ کو اس کی خودسری کی سزا دینے کے لیے کر رہی ہیں حالانکہ اپنے اس فیصلہ پر آپ بھی مطمئن اور خوش نہیں ہیں۔''

''یہ تم سے کس نے کہا۔ میں تو بہت مطمئن اور خوش ہوں۔''

''یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں اور یہ بھی کہ آپ کی خواہش کے احترام میں فوزیہ کے لیے اپنی رضامندی دے کر منصور بھائی نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ بالکل خوش نہیں۔''

عابدہ بیگم کو جلال آ گیا۔ ''نادیہ کی غلط حرکتوں کے بارے میں سننے کے باوجود اگر وہ اس رشتہ پر خوش نہیں ہے تو اس کی حماقت ہے۔''

''لیکن اماں جان ذرا سوچیے تو، فوزیہ کا کیا قصور ہے۔ نادیہ کی سزا اس غریب کو کیوں دی جا رہی ہے۔ مجھ سے تو اس کا حال دیکھا نہیں جاتا۔''

''وہ بے وقوف ہے۔ نہیں سمجھتی کہ نادیہ کی طرف سے اتنا شدید دھچکا لگنے کے بعد میں اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ شادی ہو جائے کچھ مہینوں بعد خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔'' نازلی چپ ہو گئی۔

ان کو کمرے کے اندر لا کر لٹاتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

''اماں جان اگر آپ اجازت دیں تو اس شادی سے پہلے ایک بار نادیہ سے مل کر میں خود بات کر لوں اس کی مرضی معلوم کر لوں۔ منصور بھائی نے جو کچھ بتایا ہے اس کا مجھے یقین نہیں آتا۔''

عابدہ بیگم کے ہونٹوں پر زخم خوردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا نازلی! کہ وہ میرے وجاہت کی اولاد ہے لیکن جب اس

کی دوست مریم اور وہاں کے دوسرے ڈاکٹروں اور نرسوں نے بھی یہی بات بتائی تو یقین کرنا پڑا۔ کیسے نہ کرتی۔'' ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''میں اس سے ملنا چاہتی ہوں بلکہ ضرور ملوں گی۔ اگر وہ اپنی زبان سے میرے سامنے اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرنے لگی ہے تو خدا کی قسم اماں جان میں آپ کو کبھی اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کروں گی۔''

''نہیں...... تم اس سے نہیں ملو گی۔'' یہ ان کا آخری اور حتمی فیصلہ تھا۔ نازلی نے بڑی بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔

وہ چاہتی تو ضد کر کے ان سے اپنی منوا سکتی تھی لیکن اس بیماری نے انہیں اس قابل نہیں رکھا تھا کہ وہ مزید کوئی دکھ اٹھا سکیں۔ نازلی کو بھائی کی شادی سے زیادہ ماں کی زندگی عزیز تھی۔

وہ بڑی دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر ہار مان کر آہستہ سے پوچھا۔

''آپ نے اس کو اطلاع دے دی ہے؟''

''ہاں کارڈ بھجوا دیا ہے۔'' انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اور نازلی نے تھک کر اپنا سر دیوار سے ٹکا دیا۔

☆

''نادیہ کل شام کی ڈاک سے یہ لفافہ آیا تھا۔ لگتا ہے کوئی کارڈ ہے۔'' مریم نے ہسپتال جانے سے پہلے میز پر سے لفافہ اٹھا کر نادیہ کو تھما دیا۔ وہ دو دن کے بعد صبح ہی ہسپتال آئی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ دو دن کہاں اور کس کے گھر رہی۔ دوستی کے بیچ اگر راز آ جائے تو اس میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ ہاں فطری طور پر اس نے اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا ضرور تھا۔ پوچھنا بھی چاہا مگر ٹال گئی۔ مبادا ٹکا سا جواب مل گیا تو رہی سہی دوستی اور محبت دھری کی دھری رہ جائے گی۔ البتہ نادیہ کے مطمئن اور مسکراتے ہوئے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ ساری جان سے سلگ اٹھی تھی۔ ''ڈھٹائی کی بھی انتہا ہے۔'' وہ بیزار ہو کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

''مریم سنو تو۔'' کارڈ ہاتھ میں پکڑ کر اس نے دوڑ کر مریم کا روکا۔

''تمہیں صرف یہ بتانا تھا کہ میں ایک ہفتہ کی چھٹی پر جا رہی ہوں۔ تم پلیز میری یہ

درخواست سرجن تک پہنچا دینا۔"

مریم نے پلٹ کر اسے گھورا۔ "یہ درخواست تم خود بھی دے سکتی ہو یا اس کی بھی فرصت نہیں ہے۔" لہجہ نہایت کٹیلا تھا۔

نادیہ اس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے غصہ اور انداز گفتگو پر مسکرا دی۔

"میں جانتی ہوں تم مجھ سے بہت خفا ہو لیکن آج تمہیں سب کچھ بتا کر تمہاری خفگی اور شک و شبہ کو دور کر دینا چاہتی ہوں۔ چند منٹ بیٹھو تو سہی۔"

"شکریہ..... نادیہ وجاہت علی۔" مریم نے لٹھ کھینچ مارا۔ "مجھے کچھ بھی جاننے کی نہ خواہش ہے نہ ضرورت۔ دوسرے یہ کہ میں آپ سے خفا بھی نہیں ہوں اس لیے کہ خفا تو اپنوں سے ہوا جاتا ہے۔"

"تمہاری مرضی لیکن اتنا بتا دوں مریم کہ مجھے غلط مت سمجھنا۔"

"چھوڑو ان باتوں کو درخواست کہاں ہے؟" مریم نے طنز آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

"یہ رہی۔" نادیہ نے جیب سے لفافہ نکال کر میز پر ڈال دیا۔ مریم کی مسکراہٹ پر اسے غصہ آ گیا تھا۔

"میں لنچ کے بعد چلی جاؤں گی۔ اس سے پہلے اگر ہو سکے تو چپراسی کے ذریعہ ان کا جواب بھجوا دینا تاکہ مجھے اطمینان رہے۔"

"تمہیں..... نادیہ وجاہت علی جواب کی کیا ضرورت اپنی مرضی کی مالک ہو۔"

"مریم۔" نادیہ بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ "تمہیں جو کچھ کہنا ہے صاف، کھلے الفاظ میں کہو دو اشارے کنائے کی گفتگو مجھے ہضم نہیں ہوتی۔"

"صاف بات یہی ہے کہ کسی بھی اہم شخصیت سے ملنے کے لیے اجازت کی بھی کیا ضرورت تم خود مختار ہو۔ بس۔" اور جواب سنے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی۔

نادیہ چند لمحے ساکت کھڑی اس کی آواز کی بازگشت سنتی رہی پھر پرس مسہری پر پھینک کر خود بھی خاموشی سے لیٹ گئی۔

"اف اللہ اس دنیا کے لوگوں کے ذہنوں میں کتنی غلاظت بھری ہوئی ہے۔ معمول سے ہٹ کر کسی بھی لڑکی کا زندگی گزارنا کتنا مشکل ہے بلکہ بہت بڑا جرم ہے۔ کہنے کو ہم

لوگ ایک آزاد معاشرے کے فرد ہیں جہاں مرد اور عورت دونوں ہی کو یکساں ماحول میسر ہے لیکن قول و فعل کا یہ تضاد آدمی کو کبھی انسان نہیں بننے دے گا کبھی نہیں۔" اس نے بال سمیٹ کر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ لیے۔ "کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ خونی اور اخلاقی رشتے ہونے کے باوجود کوئی کسی پر بھی اندھا اعتماد نہیں کرتا۔ اس لیے کہ شاید اس دور کے انسان کو خود اپنے خون پر بھی بھروسہ نہیں رہا ہے۔ مریم تو غیر ہے۔ محض ایک دوست ہے۔ میرا اور اس کا صرف چند برسوں کا ساتھ ہے۔ لیکن منصور وہ مسکرا دی۔ "وہ تو میرا پھوپھی کا بیٹا ہے۔ ہمارا اپنا خون ہے اور وہ بے بنیاد شکوک میں مبتلا ہو کر یوں قطع تعلق کر گیا۔ کوڑھ مغز کہیں کا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ برسوں کے بندھن یوں اس آسانی سے بھی کہیں ٹوٹا کرتے ہیں۔ جذباتی بندہ ہے۔ جب حقیقت کا علم ہو گا تو شرم سے ڈوب مرے گا۔"

ہاتھ میں پکڑے لفافے پر نظر پڑتے ہی وہ پھر خیالات کی دنیا سے پلٹ آئی جلدی سے لفافہ کھولا۔

شادی کا کارڈ تھا۔ پڑھا ایک بار دو بار پھر وہ پاگلوں کی طرح قہقہے مار کر ہنس پڑی۔ ہنستی رہی۔

کارڈ پر لکھے ہوئے الفاظ آنکھوں کے سامنے شعلے بن کر رقص کر رہے تھے اور وہ اس آگ میں جل جل کر ہنسے جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ آگ بھی پانی بن کر آنکھوں کی راہ بہہ نکلی۔

"یہ تم نے کیا کیا منصور؟" اس نے کارڈ کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ "تم فوزیہ سے شادی نہیں کرو گے۔ نہیں کر سکتے میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔" اسی غصہ میں میز پر رکھے گلاس کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔

چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلے جا رہی تھی۔

دفعتاً کچھ سوچا۔ پرس اٹھا کر بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔

کار اسٹارٹ کی اور اس تیزی سے باہر نکالی کہ دیکھنے والوں کے دل دھڑک اٹھے۔ اسپیڈ لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی اور وہ ہر خطرے سے بے نیاز منزل کی طرف بھاگ رہی تھی اچانک تیز چیخ کے ساتھ ہی بریک لگے اور وہ دوڑتی ہوئی اندر آ گئی۔ سامنے مسہری پر ثریا

بیگم لیٹی ہوئی تھیں۔

آتے ہی ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اس طرح لپٹ گئی جیسے منٹوں کی غفلت اس سے یہ آخری سہارا بھی چھین لے گی۔

''امی حضور!'' ثریا بیگم حیران پریشان اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ نادیہ کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔

''خیر تو ہے۔ یہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ فوزیہ کیسی ہے؟'' وہ ڈر گئی تھیں۔ نادیہ ان سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ثریا بیگم کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ ان کا دل ڈوبنے لگا۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں تو کبھی آنسو بھی نہیں آئے تھے۔

''نادیہ!...... بیٹا جلدی بتاؤ آخر کیا ہوا ہے۔ اسلام پور میں تو سب خیریت سے ہیں؟'' خوف اور گھبراہٹ سے ان کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔ نادیہ نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر پھیلی زرد رنگت اور آنکھوں میں انجانی سی وحشت دیکھ کر فوراً اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا وہ روتے ہوئے ہنس پڑی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں امی حضور!...... بس اتنی جلدی گھبرا گئیں۔ مجھے تو بس یونہی حماقت میں رونا آ گیا تھا۔''

''یوں...... تو تم کبھی نہیں روئیں۔ میری جان!''

''یوں کبھی ایسا ہوا بھی نہیں تھا۔'' اس نے فوری طور پر جھوٹ بولا۔ دراصل آج ایک ایسی عورت کی موت ہوئی جس کا اس دنیا میں ایک بیٹی کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ لڑکی بری طرح رو رہی تھی۔ بے چاری اکیلی جو رہ گئی۔ مجھے آپ یاد آ گئیں اگر خدا نہ کرے آپ کو کچھ ہو جاتا اور آپ مجھے نہ ملتیں تو میں بھی اکیلی رہ جاتی۔'' اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہہ نکلے۔

ثریا بیگم نے غیر یقینی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ان کا دل اور ذہن اس مفروضہ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''بیٹا اللہ کی مصلحت اللہ ہی جانے۔ ہم مداخلت کرنے والے کون؟ ویسے اللہ تعالیٰ کبھی کسی کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ یہ بتاؤ اسلام پور میں تو خیریت ہے۔''

''جی...... سب خیریت ہے۔ میں اپنی فضولیات میں بھول ہی گئی کہ اس ماہ کی آٹھ تاریخ کو اپنی فوزیہ کی شادی ہے۔''

وہ ہنس رہی تھی لیکن غیر ارادی طور پر آنسوؤں کے قطرے آنکھوں کی راہ بہے جا رہے تھے۔

''ہے نا خوشی کی بات۔ آپ کم از کم مسکرائیں تو۔'' ثریا بیگم کے ہونٹوں پر ٹوٹی پھوٹی مسکراہٹ پھیل گئی۔ حالانکہ نادیہ کے آنسوؤں نے ان کو بے حد پریشان کر دیا تھا۔ وہ متعجب بھی تھیں۔

''ہاں...... آں...... ہے تو بڑی خوشی کی بات لیکن کس سے ہو رہی ہے تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ اسلام پور سے کوئی آیا تھا؟''

''خدا کی پناہ آپ نے ایک ہی سانس میں اتنے سوال کر ڈالے۔ بس ہو رہی ہے۔ یقیناً کسی آدمی ہی سے ہو گی۔ میرے نام شادی کا کارڈ آیا تھا۔''

''کارڈ کہاں ہے؟'' ثریا بیگم نے اچانک پوچھ لیا۔

''وہ...... وہ تو میں ہسپتال میں ہی بھول آئی۔ ویسے آپ فکر مند نہ ہوں اس کی شادی منصور سے ہو رہی ہے۔''

جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اپنا چہرہ ماں کی گود میں چھپا لینا چاہتی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ چہرہ چھپا لینے یا چہرے پر مصنوعی مسکراہٹیں سجا لینے سے کہیں ماؤں کو بھی دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ وہ ہستی تو اولاد کے سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپی خوشیاں اور دکھ دونوں ہی ڈھونڈ نکالتی ہے۔

انہیں نادیہ کے اس بچپنے پر ہنسی آ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے فوزیہ کی شادی کی خبر سن کر جو خوش ہوئی تھی نادیہ کے ان لفظوں نے آن کی آن میں ساری خوشی ملیا میٹ کر دی۔ انہوں نے دھیرے سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ کر بال سمیٹے۔

''لیکن آپا بیگم ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ منصور کے لیے تو انہوں نے وجاہت سے تمہیں مانگا تھا۔''

پھر ایک دم ہی انہوں نے کچھ سوچا کچھ یاد آیا جلدی سے بولیں۔

''نادیہ...... یقیناً آپا بیگم اور منصور کسی بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور اس میں تمہاری غلطی ہے۔ میرے مل جانے کو اس طرح راز میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔''

''امی حضور!'' نادیہ نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔ رونے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چند منٹ پہلے ان آنکھوں سے برسنے والی طوفانی بارش کی جگہ اب اس میں خشک

صحراؤں کی ویرانی تھی۔ اسے پھر سے غصہ آ گیا تھا۔

"بڑے سے بڑے مجرم کو بھی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے تو کچھ پوچھے بغیر ہی اپنے فیصلہ پر آخری مہر لگا دی۔ انہوں نے میرے کردار پر شک کر کے گویا آپ پر اور ابا حضور کے کردار پر شک کیا ہے۔ میں انہیں کبھی بھی معاف نہیں کر سکتی۔"

"بیٹا اس میں ان کا بھی قصور نہیں ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ مشتبہ حرکات و سکنات سے کوئی بھی اچھا یا برا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ تم کم از کم منصور کو تو بتا دیتیں۔"

وہ ہنس دی۔

"میں تو انہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ اچانک اتنی بڑی خوشخبری سنانا چاہتی تھی لیکن......"

"بہر حال جو کچھ بھی ہوا اچھا نہیں ہوا۔" وہ بے حد افسردہ تھیں۔

"مجھے ان لوگوں سے کسی اچھائی کی توقع بھی نہیں ہے۔ انسان کا اعتماد ایک ہی دفعہ میں قائم ہوتا ہے اور ایک ہی جھٹکے میں ختم بھی ہو جاتا ہے۔"

"فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے اسلام پور لے چلو۔ میں آپا بیگم سے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

"آپ ضرور چلیں۔ وہ سب آپ کو اچانک اپنے سامنے پا کر کتنے حیران کتنے خوش ہوں گے۔ خاص کر فوزیہ۔ پھر اس کی شادی میں بھی تو شرکت کرنی ہے۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ جانے کی تیاری کریں۔ اتنی دیر میں آپ کے لیے اچھی سی ساڑھی اور فوزیہ کے لیے تحفہ لے کر ابھی آئی۔"

"نہیں نادیہ!" ثریا بیگم نے حکم دیا۔ "ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپا بیگم محض غلط فہمی اور غصہ میں یہ قدم اٹھا رہی ہیں۔ میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ انہیں اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا۔"

"لیکن...... امی حضور!" وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

ثریا بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا اور آپا بیگم کا مسئلہ ہے۔"

انہوں نے مسہری سے اترتے ہوئے اسے سمجھایا۔ "ہم یونہی بغیر سامان کے چلیں گے۔ شامو گھر پر رہے گا۔"

"لیکن......" نادیہ بڑی دیر بعد نہایت سنجیدگی سے بولی۔ "یہ میرا مسئلہ بھی ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔ فکر نہ کرو تمہاری ماں تمہیں کسی حال میں بھی شکست خوردہ نہیں ہونے دے گی اور تمہاری مرضی اور خوشی کے بغیر اگلا قدم بھی نہیں اٹھاؤں گی۔" ساڑھی بدلے بغیر ہی شال اوڑھتے ہوئے انہوں نے شامو کو ہدایات دیں اور نادیہ کے ہمراہ آ گئیں۔

نادیہ نے خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسلام پور جانے والی سڑک پر ڈال دی۔

☆

دوپہر کھانے کے بعد حسب معمول سب لوگ آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ نازلی اپنے کمرے میں جانے کی بجائے فوزیہ کے پاس چلی آئی۔ دو دن سے بازاروں کے چکر اور عابدہ بیگم کی تیمارداری نے اسے اتنی فرصت ہی نہیں دی تھی کہ چند لمحوں ہی کے لیے وہ فوزیہ کے پاس جا سکتی۔ کھانے پر تو اس نے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ نازلی نے کمرے میں قدم رکھا سامنے مسہری پر لیٹی وہ کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔

"فوزیہ!......" نازلی نے آہستہ سے پکارا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم نے کھانا کھایا؟" قریب آن کر نازلی نے پیار سے پوچھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"رات بھی بھوک نہیں تھی۔" فوزیہ کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔

نازلی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔ غور سے چہرہ دیکھا۔ کتنا زرد اور کمزور نظر آ رہا تھا۔ بال بکھر کر الجھ گئے تھے۔ نہ جانے کتنے دنوں سے کنگھی بھی نہیں کی تھی۔ روتے روتے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اس نے ہلکے سے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"فوزی...... یوں گھٹ گھٹ کر مرنے سے کیا فائدہ؟"

جواب میں فوزیہ نے محض نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔

"اماں جان سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ میں شادی نہیں کر سکتی۔ نہیں کروں گی۔ منصور بھائی تو غم و غصہ میں پاگل ہو گئے ہیں۔ خود بھی خوش نہیں ہیں۔ بنا سوچے سمجھے وقتی جوش میں آ کر حامی بھر لی ہے۔ خدا معلوم کس کی سزا دے رہے ہیں اپنے آپ کو یا

نادیہ کو۔ بہرحال ابھی بھی وقت ہے تم نڈر بنو۔ انکار کر دو۔ اماں جان سے میں نمٹ لوں گی۔''

''نازلی!'' فوزیہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی۔ ''نامعلوم کتنی بار ان سے کہہ چکی ہوں لیکن وہ نہیں مانتیں مانیں گی بھی نہیں۔''

''تم بہت بزدل ہو...... بے وقوف کہیں کی۔'' نازلی کو غصہ آ گیا۔ ''یقین مانو یہ انکار اس سے تو بہتر ہوگا کہ اماں جان کو خدا نہ کرے تمہارا جنازہ دیکھنا پڑے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ حالانکہ موت بھلا اتنی آسانی سے کہاں آتی ہے۔'' فوزیہ آنسو پونچھ کر مسکرا دی۔

''یوں...... دن رات بھوکے پیاسے کمرے میں پڑے رہ کر اپنے آپ کو اذیت پہنچانا اسے بھی زندگی تو نہیں کہتے۔''

''ایسی زندگی لے کر بھی کیا کروں جس میں کوئی خوشی نہ ہو۔ کوئی اپنا نہ ہو۔'' نازلی خاموش ہو گئی۔ فوزیہ ٹھیک ہی کہتی ہے ماں باپ کے بعد شاید کوئی بھی اپنا نہیں ہوتا۔ سارے رشتے کتنے مصنوعی ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی دیر تک سر جھکائے فوزیہ کے دکھ پر کڑھتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

''فوزی! نادیہ کے بارے میں جو کچھ بھی پتا چلا ہے تمہیں اس پر یقین ہے۔'' نادیہ کا نام آتے ہی فوزیہ کے چہرے پر شام کا اداس ملگجا سا اندھیرا چھا گیا۔ بڑی بڑی سوچی سوچی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے ڈولنے لگے۔

''آپی کے لیے کوئی بری بات سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ نازلی ہم دونوں بہنوں نے بغیر کسی تحفظ اور سہارے کے پندرہ سال گزارے ہیں۔ وہ کوئی غلط قدم اٹھائیں گی میں یہ مان نہیں سکتی۔''

''فوزیہ!'' نازلی سوچتے ہوئے بولی۔ ''یقین تو مجھے بھی نہیں آتا لیکن جب اتنے لوگ ایک ہی بات کہہ رہے ہیں تو کچھ تو حقیقت ہوگی۔'' فوزیہ کی آنکھوں میں پھر آنسو امڈ آئے تھے۔

''خیر تم پریشان نہ ہو۔ میں نے ابا جان سے بات کی ہے۔ ہم دونوں خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر آج شام گلزار نگر جا کر خود نادیہ سے بات کریں گے۔ اگر بالفرض اس نے اپنے لیے کسی ساتھی کا انتخاب کر ہی لیا ہے تو کسی کو بھی اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں۔''

وہ تھوڑی دیر رکی۔

''لیکن...... نادیہ سے ضرور کہوں گی کہ محبت کرنا جرم نہیں لیکن اس کو تماشہ بنا دینا ضرور جرم ہے۔ وہ اپنے اس راز میں تمہیں، مجھے کسی ایک کو شریک کر سکتی تھی۔ یوں اماں جان کی انا کو تو چکنا چور نہ کرتی۔''

فوزیہ گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔ کہنے کے لیے اب رہا بھی کیا تھا۔ نازلی نے اٹھ کر گلاس میں پانی ڈالا قریب آن کر پیار سے بولی۔

''میری ننھی بہن...... خدا کے لیے اب بس کرو۔ پانی پیو۔ میں کھانا لے کر آتی ہوں تھوڑا بہت غذا کھا سکتی ہو۔ کھاؤ ورنہ خدا کی قسم فوزیہ رات سے میں بھی بھوک ہڑتال شروع کر دوں گی۔'' فوزیہ نے گلاس پکڑ لیا۔ ''اٹھو منہ دھو کنگھی کرو میں کھانا لے کر ابھی آئی۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

گیلری میں سے گزر رہی تھی کہ گاڑی رکنے کی آواز پر چونک اٹھی۔

''ایسے بے وقت کون آ سکتا ہے؟ شاید منصور بھائی ہوں گے۔''

کئی روز سے منصور بھائی سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس وقت گھر گھستا جب سب ہی سو چکے ہوتے۔ اس وقت اُس کا خیال آتے ہی وہ باورچی خانے کی طرف جانے کی بجائے تیز تیز قدم اٹھاتی باہر برآمدے میں نکل آئی لیکن برآمدے میں قدم رکھتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔ اس کا سارا وجود جم کر رہ گیا تھا۔

کھلی حیران حیران نظروں سے وہ گاڑی میں سے اترنے والوں کو تکے جا رہی تھی۔ نادیہ کسی ضعیف لیکن باوقار خاتون کے ساتھ سیڑھیاں طے کر کے اوپر آ گئی تھی۔

''ہیلو نازلی!'' اس کی مخصوص آواز سن کر نازلی دوبارہ اس حقیقی دنیا میں پلٹ آئی تھی۔

''ہیلو!'' اس نے نہایت مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

نادیہ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے گلے میں ڈال دیئے۔

''یوں کیوں تکے جا رہی ہو یہ میں ہوں۔ میرا بھوت نہیں ہے۔''

نازلی مسکرا دی۔ ''اس کی بات کا یقین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔'' اس کے ساتھ ہی پرانی محبت بھی عود کر آئی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

''تم اتنی بے مروت نکلو گی نادیہ یہ امید نہیں تھی۔''

"امیدیں اور آرزوئیں غلط بھی ہوتی ہیں ان کے چنگل میں نہ آیا کرو۔" نادیہ ہنس رہی تھی۔

"گلزار نگر کی محبت نے تمہیں یہاں والوں سے اتنا دور کر دیا یقین نہیں آتا۔" نازلی نے شکوہ کیا۔

"وہم کا کوئی علاج نہیں اور میری جان کسی بات کا یقین دلانا بھی بڑا مشکل ہے خیر چھوڑو یہ بتاؤ پھوپھی حضور کیسی ہیں؟ فوزی کہاں ہے؟"

"بڑی جلدی خیال آیا۔" نازلی نے ڈانٹا۔

"صبح کا بھولا شام کو آ جائے تو...... ڈانٹتے نہیں۔"

"اماں جان بہت بیمار ہیں۔ فوزیہ کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں ہے۔"

"اچھا چلو پہلے پھوپھی حضور سے مل لوں۔" نازلی نے متجسس نظروں سے خاتون کی طرف دیکھا۔ جو بڑی خاموشی اور سنجیدگی سے ان کی گفتگو سن رہی تھیں۔

"پھر تینوں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی عابدہ بیگم کے کمرے تک آ گئیں۔ نازلی نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔

"شاید اماں جان سو رہی ہیں۔"

"تو انہیں جگا دو بیٹی!" بڑی دیر بعد خاتون نے زبان کھولی۔ نازلی نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

"تم ہٹو میں خود ہی اندر جا کر انہیں جگا دوں گی۔" ثریا بیگم اس کو ایک طرف ہٹا کر اندر چلی گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے نادیہ اور نازلی تھیں۔ عابدہ بیگم واقعی سو رہی تھی یا نہیں البتہ ان کی آنکھیں ضرور بند تھیں۔ نازلی نے ان کے نزدیک جا کر دھیرے سے اپنا ہاتھ ان کی پیشانی پر رکھ دیا۔

"کون ہے؟" انہوں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"ادھر دیکھئے اماں جان...... نادیہ آئی ہے۔"

"نا...... د...... یہ......" وہ بڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

نادیہ نے آگے بڑھ کر اپنا سر ان کے آگے جھکا دیا۔ "آداب پھوپھی حضور"

"جیتی رہو۔" سر پر ہاتھ پھیرے بغیر ہی نہایت سرد مہری سے جواب دیا۔

ثریا بیگم کچھ دور خاموش کھڑی تھیں۔

عابدہ بیگم نے اچٹتی سی نظر ان پر ڈالی پھر دوبارہ بڑے غور سے دیکھا۔ وہ مسکرا دیں۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں آپا بیگم!"

"کون...... ثریا...... دلہن؟" وہ چلا پڑیں آواز میں جوش اور مسرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"پہچان تو پہلی نظر میں گئی تھی لیکن اعتبار نہیں آ رہا تھا۔"

"بھلا کیسے آتا۔ معجزوں پر مشکل سے یقین آتا ہے۔" وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ عابدہ بیگم نے بے اختیار ہو کر انہیں اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نازلی بھی رو رہی تھی۔ لیکن نادیہ کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ خاموش پتھر کی مانند چپ چاپ کھڑی دونوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ ان کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر عابدہ بیگم سسک اٹھیں۔

"کسے امید تھی کہ کبھی زندگی میں دوبارہ دیکھوں گی۔ کمزور ہو گئی ہو ثریا دلہن پھر بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے تم کو ہم لوگوں سے ملا دیا۔ کون جانتا تھا۔ میری زندگی میں یہ دن بھی آئے گا۔"

نادیہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ "میں نے آپ سے کہا تھا نا پھوپھی حضور! کہ ایک نہ ایک دن امی حضور کو لے کر آپ کے پاس آؤں گی۔"

"ہاں...... آں تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔" عابدہ بیگم نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ چہرے پر وہی پرانی معصومیت تھی۔ آنکھوں میں نکھری نکھری مسکراہٹیں چھپی ہوئی تھیں۔

نازلی فوزیہ کو بلانے جا چکی تھی۔

"میں نے تو تہیہ کر لیا تھا آپا بیگم کہ کبھی بھی آپ سب کو اپنی صورت نہیں دکھاؤں گی لیکن یہ میری نادیہ تھی جو مجھے دوبارہ اس دنیا میں لے آئی۔" عابدہ بیگم چپ تھیں۔

"اس نے تو میری تلاش میں گلزار نگر کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ اتفاق دیکھیں ملی بھی تو اس وقت جب میں شدید بیمار تھی۔"

وہ دھیرے دھیرے بتاتی جا رہی تھیں۔ عابدہ بیگم گم صم آنکھیں پھاڑے سنے جا رہی

تھیں۔ حالانکہ اس لمحہ ان کا ذہن ان کی سوچیں کہیں اور بھٹک رہی تھیں۔

"میرے بچنے کی تو کوئی امید نہیں تھی۔ میں گلزار نگر ہسپتال بھی جانا نہیں چاہتی تھی لیکن اللہ کے کھیل نرالے ہیں۔ شامو بے ہوشی کی حالت میں مجھے گلزار نگر ہسپتال لے کر آ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے لیکن وہ کہتے ہیں خون کی کشش ہوتی ہے ڈاکٹر نادیہ نے میرے علاج کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ آخر کار آزمائش کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ خدا کو بھی ترس آ گیا۔" وہ چپ ہو گئیں ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے عابدہ بیگم بھی رو رہی تھیں اس لمحہ نازلی کے ہمراہ فوزیہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ چہرہ برف کی مانند ٹھنڈا اور سفید تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے دروازے کا سہارا لے کر رکی۔ نادیہ نے مڑ کر دیکھا اور دوڑ کر اسے لپٹ گئی۔ نازلی نے ثریا بیگم کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

فوزیہ، نادیہ کی بانہوں میں آتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔

"اسے کیا ہو گیا ہے؟ پھوپھی حضور! کب سے بیمار ہے؟"

نادیہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے بہن کے زرد مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا پھر گود میں اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا۔

"فوزی میری جان آنکھیں کھولو۔" بہن کی ابتر حالت پر تڑپ اٹھی تھی۔ نازلی نے بھاگ کر پانی لا کر دیا۔ اس نے تھوڑا سا پانی لے کر اس کے منہ پر چھڑکا ایک گھونٹ پانی میں گلوکوز ملا کر قطرہ قطرہ حلق میں ڈالا آخر چند منٹ بعد فوزیہ کو ہوش آ گیا لیکن اس کا سارا جسم برف کی طرح سرد تھا۔ نازلی نے عابدہ بیگم کے پاس سے کمبل اٹھا کر اسے اوڑھا دیا۔

"فوزیہ میری جان!" نادیہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیشانی پر ڈھیروں پیار کر ڈالے۔

"آ..... پی....." وہ اس کی گود میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"فوزیہ....." نادیہ نے اپنے دوپٹہ سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے بالوں کو ٹھیک کیا۔

"ادھر دیکھو کون آیا ہے۔ آج میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ مجھے شاباشی دو۔"

"کون ہے؟" فوزیہ نے سر اٹھا کر ثریا بیگم کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو تیر رہے تھے۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا ایک نہ ایک دن امی حضور کو ڈھونڈ کر تمہارے پاس ضرور لاؤں گی۔"

"کیا..... امی حضور؟" فوزیہ نے اٹھنا چاہا لیکن ثریا بیگم نے خود ہی اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔

"میری فوزیہ..... میری بچی کسے امید تھی کہ تمہیں دیکھ سکوں گی۔" دونوں ایک دوسرے سے لپٹے روئے جا رہی تھیں۔ آن کی آن میں سارا گھر کمرے میں جمع ہو گیا تھا۔

نازلی نے جھٹ پٹ رشید احمد اور منصور کو بھی فون کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں بھی پہنچ گئے۔ رشید احمد نے آتے ہی ثریا بیگم کو گلے سے لگا کر ان کی پیشانی چوم لی۔ وہ بے حد خوش تھے۔

"آج کتنا خوش قسمت دن ہے ثریا دلہن! جس نے دوبارہ تم کو ہم سے ملا دیا ورنہ ساری امیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔"

"اللہ تیرا شکر ہے جس نے برسوں بعد بچھڑوں کو ملا دیا ہے۔" منصور کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

"کہو بھئی، نادیہ بیٹی! کہاں سے ڈھونڈ لائیں امی حضور کو؟" رشید احمد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا۔ وہ ہنس پڑی۔

ثریا بیگم نے بڑے پیار سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی فخریہ مسکراہٹ تھی۔ نیک اور قابل اولاد ماں باپ کے لیے کتنی انمول دولت ہوتی ہے۔ سنی سنائی اس بات کا آج انہیں یقین آیا تھا۔ دھیرے سے بولیں۔

"بھائی صاحب وہ ننھی سی جان جو بچپن ہی میں ہم سے دور کر دی گئی تھی۔ جس نے زندگی کے پندرہ سولہ سال تن تنہا کسی سرپرست کے بغیر گزار دیئے ہوں وہ اتنی قابل اور نیک ڈاکٹر بنے گی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ سب اللہ کا کرم اور وجاہت کی نیکیوں کا صلہ ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ ثریا دلہن! والدین کی نیکیوں کا صلہ اللہ تعالیٰ اولاد کی صورت میں دیتا ہے۔ تم اور وجاہت بہت خوش قسمت ہو۔" ان کی آواز میں لرزش تھی۔

"میری بیٹی نے میری بہت خدمت کی ہے۔ اسے ایک جنون رہا کہ آپ کو تندرست

ہونا ہے اس کی خاطر اس نے ہسپتال کی، اپنی نوکری کی وہاں کے ڈاکٹروں کی، کسی کی بھی پرواہ نہیں کی۔'' ثریا بیگم کے چہرے پر ایک لازوال نور تھا۔

''ہاں...... آں اچھا بڑی بات ہے۔'' رشید احمد کو اپنی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ عابدہ بیگم حیران و پریشان آنکھیں پھاڑے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ ثریا بیگم دنیا و مافیہا سے بے خبر سکون سے مسکرائے جا رہی تھیں۔

''اور مزے کی یہ بات ہے آپا بیگم کہ کسی کو میرے بارے میں بتاتی بھی نہیں تھی۔ کتنی دفعہ میں نے سمجھایا بھی کہ لوگ نہ جانے کتنی غلط باتیں کریں گے لیکن بس اس کی تو ایک ہی رٹ تھی۔ آپ تندرست ہو جائیں پھر اچانک سب کو یہ خوشخبری سناؤں گی۔''

منصور کے رخسار تپ اٹھے تھے۔ اسے اپنا سارا جسم دلدل میں دھنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر نادیہ پر ڈالی وہ ان سب سے بے نیاز فوزیہ کے قریب بیٹھی اپنے ہاتھوں سے اس کے سرد ہاتھوں کو گرم کر رہی تھی۔

''کم از کم مجھے تو بتا دیا ہوتا۔ نادیہ بیٹی!''

''جب بتانے کا وقت آیا پھوپھی حضور تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ آپ لوگ انتظار کی زحمت نہیں اٹھا سکتے تھے اور میں جلدی ہار کی قائل نہیں۔''

''مانا کہ ہماری غلطی ہے لیکن کسی کو تو اعتماد میں لیتیں۔'' رشید احمد نے سمجھانا چاہا۔

''پھر وہ لطف، وہ خوشی، وہ مزہ تو نہیں ملتا پھوپھا حضور! جو یقیناً آج امی حضور کے اس طرح اچانک سامنے آ جانے پر آپ لوگوں کو ملا ہوگا۔''

''اس بات کو مانتا ہوں واقعی اس ناامیدی میں اچانک ہی اتنی بڑی حقیقت سامنے آ جائے تو آدمی ان محسوسات کو خود کوئی نام نہیں دے سکتا۔ لیکن بیٹا تمہارے صبر اور حوصلہ کی ضرور داد دوں گا جس نے اتنے مہینے لوگوں کی آڑی ترچھی نظروں کے وار سہے اور کسی سے فریاد بھی نہیں کی۔'' رشید احمد کے پاس اس کی تعریف کے لیے اس سے زیادہ مناسب الفاظ نہیں تھے۔

''پھوپھا حضور! میں نے تو ایک بڑے نیک مقصد کے لیے اپنے آپ کو سولی پر چڑھایا تھا۔ فریاد کیوں کرتی۔ میں تو بہت مطمئن اور خوش تھی۔''

''خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔'' انہوں نے دعا دی۔ نادیہ مسکرا دی۔

''امی حضور! میں ابھی اسی وقت فوزیہ کو لے کر گلزار نگر ہسپتال جا رہی ہوں۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ پھوپھی حضور کے پاس رہیں۔ اور اس کی طبیعت سنبھل جائے گی تو میں واپس لے آؤں گی۔''

عابدہ بیگم خاموش تھیں۔ رشید احمد کے پاس بھی بولنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ منصور پتھر کی طرح ساکت ساکت صرف سن رہا تھا۔

''نہیں نادیہ! میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ نادیہ نے بہن کو اٹھا کر اچھی طرح شال لپیٹی۔ سہارا دے کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔

رشید احمد! نازلی اور منصور ان کے ساتھ تھے۔ ہر ایک خاموش تھا کسی کے پاس بھی گویائی کے لیے الفاظ نہیں تھے۔

گاڑی میں بیٹھ کر نادیہ نے ایک نظر ان سب پر ڈالی۔

وہ سب کے سب کتنے افسردہ اور شرمسار نظر آ رہے تھے۔ اسے دکھ ہوا ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

ہسپتال پہنچ کر نادیہ نے سب سے پہلے فوزیہ کا مکمل چیک اپ کیا۔ مختلف ٹیسٹ کروائے لیکن بالکل ہی غیر متوقع طور پر رپورٹ دیکھ کر اس کا دل ڈوب ڈوب گیا، وہ شرمسار تھی۔

''اس کی ذمے دار میں ہوں۔ میں جس نے اپنی بہن کو سلگنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا جو کبھی بھی اپنی تکلیف کسی سے نہیں کہتی تھی۔ میں سمجھتی رہی وہ وہاں بڑے آرام چین سے ہے اور......''

رپورٹوں کے مطابق فوزیہ کا دل بے حد کمزور ہو چکا تھا۔ خون کی خطرناک حد تک کمی تھی اور...... نروس سسٹم...... وہ نامعلوم کتنی دیر تک دونوں ہاتھوں سے سر تھامے گم صم دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی رہی۔

اپنی اتنی بڑی غلطی کا ازالہ مجھے ہی کرنا ہے۔ مجھے ہر قیمت پر ہر حال میں اس کی جان بچانا ہے۔ وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھی اسٹیتھسکوپ اٹھایا اور راؤنڈ پر نکل گئی۔

دو گھنٹہ بعد جب واپس آئی تو حسب معمول فوزیہ سو رہی تھی۔ ثریا بیگم مسہری کے نزدیک ہی کرسی پر بیٹھی خاموش ایک ٹک بیٹی کے زرد کمزور اور مرجھائے ہوئے چہرے کو تکے جا رہی تھیں۔ اولاد کی تکلیف ماں کے لیے کتنی ناقابل برداشت ہوتی ہے اس کا احساس نادیہ کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اندر آ کر اپنے دونوں ہاتھ ان کے کندھوں پر رکھ دیے۔

''کیا سوچ رہی ہیں۔ امی حضور؟'' انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر کندھے پر رکھا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔ نادیہ نے دیکھا ان کی آنکھوں میں بڑے بڑے شفاف قطرے ڈول رہے تھے۔ نادیہ کا جی اندر سے زخم خوردہ ہو گیا۔

''فوزیہ کو کیا ہو گیا ہے بیٹا؟ یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا'' ان کے لہجے میں بڑی مایوسی تھی۔

''اسے بس کمزوری ہے۔ یہاں میں ہوں، آپ ہیں، میں علاج کروں گی آپ ڈانٹ ڈپٹ کر اسے کھلائیں پلائیں۔ دیکھیے گا دو دن میں ایک دم فٹ فاٹ ہو جائے گی۔''

ثریا بیگم نے نادیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بالکل اپنے سامنے بٹھا لیا۔ ''دیکھو نادیہ مجھ سے اپنی ماں سے کچھ چھپانا نہیں۔ آخر اسے کیا دکھ تکلیف تھی آپا بیگم کے یہاں کہ یہ حالت ہو گئی؟''

نادیہ ششپٹا گئی۔

''اب میں کیا بتا سکتی ہوں امی حضور! بظاہر تو ان سب کا برتاؤ فوزیہ کے ساتھ بڑے پیار و محبت کا تھا۔''

ثریا بیگم کچھ دیر خاموش کچھ سوچتی رہیں پھر آہستگی سے بولیں۔ ''یہ بتاؤ منصور کے ساتھ اس کی شادی کا کیا معاملہ ہے؟ بچپن میں نواب وجاہت نے تو...... یہ رشتہ......''

''اب اس قصہ پارینہ کو بھول جائیں امی حضور یہ پھوپھی حضور کا فیصلہ ہے۔''

''فوزیہ کی مرضی سے ہوا ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم...... بہر حال ان فضول باتوں کے چکر میں پڑ کر کہیں آپ دوبارہ نہ بیمار پڑ جائیے گا۔ آپ یوں کریں دوسرے کمرے میں جا کر آرام کریں۔ میں اس کے پاس ہوں۔ کب سوئی تھی؟''

''تمہارے جانے کے بعد، بڑی مشکل سے ایک پیالی چائے کے ساتھ آدھا سلائس کھایا۔ اس کے بعد سے سو رہی ہے۔'' وہ بڑی فکر مند تھیں۔

''کوئی بات نہیں۔ اس کے لیے سونا اچھا ہے۔ آپ تو جا کر آرام کریں میں اسے اٹھاتی ہوں۔ کھانے اور دوا دونوں کا وقت ہو چکا ہے۔''

''جیسے تمہاری مرضی ورنہ...... میں تو اس صوفے پر آرام سے تھی۔'' ان کا دل بہت بے چین تھا۔

''نہیں...... بالکل نہیں۔ آپ کی ڈیوٹی ختم اب یہ میری ذمے داری ہے۔''

ثریا بیگم بادل نخواستہ اٹھیں اور دوسرے کمرے میں جا کر لیٹنے کے بجائے کرسی پر ہی بیٹھ گئیں۔ ان کا ذہن ہزاروں خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا ڈھونڈنا بڑا مشکل تھا۔

نادیہ نے فوزیہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے اسے آواز دی۔ اس نے آنکھیں

کھول کر عجیب اجنبی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی اور کروٹ بدل کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"فوزی!" نادیہ نے اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ "اٹھو...... میری جان! یہ میں ہوں تمہاری آپی کھانا نہیں کھاؤ گی؟"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ کھانا نہیں کھاؤں گی۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ تم چلی جاؤ نازلی!" نادیہ کی آنکھوں میں دھند چھا گئی۔

اللہ مجھے معاف کرے میں نے اسے وہاں تنہا چھوڑ کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ اس کے بالوں کو سمیٹ کر پیشانی پر کئی پیار کر ڈالے۔

"آنکھیں تو کھولو میری طرف دیکھو میں نادیہ ہوں۔" فوزیہ نے آنکھیں کھولنے کی بجائے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آنکھیں چھپا لیں۔

"تم...... جھوٹ مت بولو۔ آپی؟ وہ بھلا یہاں کیوں آئیں گی۔ یہاں سب ان سے ناراض ہیں۔"

نادیہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا اس کے رخسار تپ اٹھے تھے۔

"ہوش میں آؤ فوزی تم یہاں ہو میرے اور امی حضور کے پاس۔"

فوزیہ نے ڈرتے ڈرتے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں پھر پوری کی پوری آنکھیں پھاڑ دیں۔

"آپ...... آپ آگئیں؟" اور تکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

نادیہ کی اپنی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے لیکن وہ چپ چاپ بیٹھی اسے روتا ہوا دیکھتی رہی۔

'اچھا ہے۔ بھڑاس نکل جائے۔'

تھوڑی دیر بعد نادیہ نے ہلکے سے اس کا چہرہ سیدھا کیا اور ہنستے ہوئے بولی۔

"بس رو چکیں یا ابھی باقی ہے؟" فوزیہ کے ہونٹوں پر پژمردہ مایوس کن مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ...... کب آئیں؟" بڑی کمزور آواز میں سوال کیا۔

"آپ نہیں بلکہ آپ یہاں میرے اور امی حضور کے پاس آئی ہیں۔"

"سچ۔" اس کی آنکھوں میں چمک اتر آئی تھی۔

"بالکل سچ۔ امی حضور ابھی دوسرے کمرے میں گئی ہیں۔ یوں کرو تم تھوڑا سا کچھ کھا کر دوا پی لو۔ پھر انہیں بلاتی ہوں صبح سے تمہارے ہی پاس بیٹھی تھیں۔" نادیہ نے اسے تکیہ

کے سہارے بٹھا دیا۔ "تم آرام سے بیٹھو میں سوپ لے کر ابھی آئی۔"

☆

سب سے بڑا گناہ کسی کے کردار پر شک کرنا ہے۔ یہی شکوک و شبہات انسان کو اس قعرِ مذلت میں گرا دیتے ہیں جہاں سے نکلنا بھی دشوار ہے اور نکل کر سامنا کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔

عابدہ بیگم پشیمان تھیں۔ حالات اور واقعات نے انہیں اتنی بڑی شکست دی تھی کہ وہ بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گئی تھیں۔ انا کا وہ پہاڑ جس کے سہارے انہوں نے اپنی اتنی عمر گزار دی تھی لمحوں میں ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

وقت کتنا ظالم ہے اور اللہ کا انصاف کتنا اٹل۔ یہی وہ حقیقت ہے جس سے بندہ نظریں چرا کر نکل جانا چاہتا ہے پر نکل نہیں پاتا۔

ان تینوں کے چلے جانے کے بعد سے وہ چپ چاپ آنکھیں بند کیے اپنی مسہری پر پڑی تھیں۔ رشید احمد اپنی لائبریری میں بظاہر پڑھنے میں مصروف تھے لیکن ان کا دل و دماغ دونوں اس چھوٹے سے جملے کی زد میں تھے۔

"میں نے کہا تھا نا ایک دن امی حضور کو لے کر ضرور آؤں گی۔"

منصور تمام بازیاں ہار کر شکست خوردہ نڈھال سا اپنے کمرے میں پڑا بے شمار سوچوں میں غرق تھا۔

"منصور بھائی، میں اندر آ جاؤں؟" اچانک نازلی کی آواز نے اسے حقائق کے بیچ دوبارہ لا کر کھڑا کر دیا۔

"ہاں...... آں...... آؤ۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

نازلی اندر آن کر چپ چاپ کرسی پر ٹک گئی۔

تھوڑی دیر بعد منصور نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"خیریت...... کوئی کام تھا مجھ سے؟ اماں جان تو ٹھیک ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں...... میں صرف یہ بتانے آئی تھی منصور بھائی کہ ایک گھنٹہ بعد میں اور ابا جان گلزار نگر جا رہے ہیں۔"

منصور بولا کچھ نہیں صرف سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ...... چلیں گے؟'' نازلی نے ہمت کی۔

''سوچ تو میں بھی یہی رہا تھا۔ لیکن کیا اس قابل رہ گیا ہوں کہ ان سب کا سامنا کر سکوں۔'' نازلی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

''اماں جان بھی جائیں گی؟'' تھوڑی دیر بعد اس نے خود ہی پوچھا۔

''شاید یا شاید نہیں...... یہ ان کی طبیعت پر منحصر ہے۔''

''ہاں بیٹا تمہاری ماں ہمارے ساتھ جائیں گی۔'' رشید احمد کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔ ''اور انہیں نادیہ اور فوزیہ سے معافی بھی مانگنا ہوگی تاکہ سترہ سال سے تکبر کے جس بے معنی حصار میں وہ بند ہیں کسی طرح تو ٹوٹے۔ نازلی تم تیار ہو؟''

''جی بابا جان!...... آپ نے اماں جان کو بتا دیا۔''

''وہ تیار ہو رہی ہیں۔ منصور تم بھی تیار ہو کر باہر آؤ۔'' وہ حکم دے کر باہر نکل گئے۔

☆

ثریا بیگم! فوزیہ کا سر اپنی گود میں رکھے اسے بڑے پیار سے سمجھا رہی تھیں۔ تسلیاں دے رہی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بچی کا دل پھوپھی کی طرف سے اتنا میلا ہو کہ زندگی بھر کے لیے بیگانگی کی دیوار حائل ہو جائے۔ نادیہ ہسپتال میں تھی۔ اچانک ہی غیر متوقع طور پر اسلام پور والوں کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''ارے آپا بیگم آپ نے اتنی دور آنے کی کیوں زحمت کی۔ پہلے ہی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' فوزیہ کا سر تکیہ پر رکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

''ہماری بیٹی اب کیسی ہے؟'' رشید احمد نے جھک کر فوزیہ کی پیشانی پر پیار کر لیا۔

''بیٹی! اب کیسی طبیعت ہے؟'' عابدہ بیگم اس کے پاس مسہری پر بیٹھ گئیں۔ منصور کمرے کے کونے میں پڑی کرسی پر ٹک گیا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔ پھوپھی حضور!'' فوزیہ نے تھوڑی سی آنکھیں کھول کر ان سب کی طرف دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا چہرہ بے حد زرد اور کمزور نظر آ رہا تھا۔

''نادیہ کہاں ہے۔ ثریا دلہن؟'' رشید احمد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی ابھی ہسپتال گئی ہے۔ صبح سے تو بہن کے پاس ہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہو گئی ہے۔ رات بھر جاگتے گزری ہے۔''

رشید احمد اور عابدہ بیگم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ ثریا بیگم بھی خاموش تھیں ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور قدرے ناگواری کے اثرات تھے۔

''ہم سب دعا کر رہے ہیں۔'' آخر رشید احمد نے دھیمی آواز میں اس سناٹے کو توڑا۔ ''اللہ نے چاہا تو بہت جلد ہماری بیٹی تندرست ہو جائے گی تم گھبراؤ نہیں۔''

''ہاں ممانی حضور! آپ تو بے حد پریشان نظر آ رہی ہیں۔ کمزوری ہے ان شاء اللہ دو چار روز میں فٹ فاٹ ہو جائے گی۔'' نازلی نے ممانی کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

''نہ جانے کتنے جتن کے بعد تو نادیہ کی بدولت آپ کی صورت دیکھنے کو ملی ہے۔ ویسے آپ کی اپنی صحت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ زیادہ ٹینشن نہ لیں۔''

''ہاں بیٹی...... خدا تم سب کی زبان مبارک کرے اور میری فوزیہ صحت یاب ہو جائے لیکن آپا بیگم! اور بھائی صاحب! مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ وجاہت نے جو امانت آپ دونوں کے سپرد کی تھی آپ لوگ اس کی خاطر خواہ حفاظت نہ کر سکے۔''

''ہم اپنی اس کوتاہی پر شرمندہ ہیں۔'' عابدہ بیگم نے دھیمے لہجے میں اعتراف کیا۔

''غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں۔ ہم سے بھی بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ اس کے لیے ثریا دلہن تم سے معافی کے خواست گار ہیں۔'' رشید احمد کی آواز میں لرزش تھی۔

''مجھے گناہ گار نہ کریں بھائی صاحب!'' ثریا بیگم کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ ''مجھے صرف شکوہ ہے کہ میری بچی کے اس جذبہ کی آپ لوگوں نے قدر نہ کی جس کا یقیناً اللہ تعالیٰ قدردان ہو گیا ہوگا۔'' آواز میں بڑی متانت تھی۔

''اسے ماں کی تلاش کی یہ سزا دی گئی کہ بالکل ہی فراموش کر دیا۔ بے سہارا چھوڑ دیا، اور تابوت میں آخری کیل آپ کا وہ فیصلہ تھا آپا بیگم! جس کو سن کر آپ کے مرے ہوئے بھائی کی روح بھی دکھ سے لرز اٹھی ہوگی۔ آخر ایسا کیوں کیا؟''

رشید احمد کا سر جھکا ہوا تھا۔ عابدہ بیگم کی زبان گنگ تھی اور منصور پتھر کی طرح ساکت دور سے آتی آوازیں سن رہا تھا۔

''یہ میری غلطی، میرا قصور ہے ثریا دلہن!'' عابدہ بیگم ڈوبی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''میں نے غصہ اور ضد میں یہ فیصلہ کیا تھا۔ میں شرمندہ ہوں تم لوگ مجھے معاف کر دو۔''

''لیکن میں صرف۔ یہ پوچھتی ہوں کہ گلزار نگر میں رہ کر ہسپتال میں کام کرنا کوئی گناہ یا

جرم تو نہیں تھا کہ آپ اتنی سخت خفا ہو گئیں۔"

"یہ بات نہیں ہے ثریا دلہن!" رشید احمد ندامت آمیز لہجے میں بولے۔"بسا اوقات غلط فہمیاں انسان کو ہوش وخرد سے بھی بے گانہ کر دیتی ہیں۔ حقیقت جاننے کے بجائے سنی سنائی پر یقین کر لینا ہی ہماری کمزوری تھی۔ نادیہ کی ہسپتال سے متواتر غیر حاضری نے سب کو مشکوک کر دیا تھا۔"

"ہسپتال والے تو غیر تھے۔ وہ حق بجانب تھے۔ آپ لوگ تو اپنے تھے۔"

وہ چپ ہو گئے۔ گویا اقرار جرم کرتے ہوئے گھبرا رہے ہوں۔

ثریا بیگم بڑے طنز آمیز انداز میں مسکرائیں۔

"آپا بیگم نادیہ تو وجاہت علی اور ثریا بیگم کی بیٹی تھی، آپ کی اپنی بھتیجی تھی، آپ نے یہ کیسے سوچ لیا تھا کہ وہ غلط راہ پر گامزن ہو سکتی ہے؟"

"نادیہ کے غلط رویئے نے ہم لوگوں کو ایسا سوچنے پر مجبور کیا۔" عابدہ بیگم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔"اسے چاہیے تھا اس بات کو اس حد تک راز نہ بناتی۔

یہ بھی...... اس کا بچپنا تھا۔"

"ہاں...... آں...... ٹھیک ہے ہم اپنی غلطی مانتے ہیں اور شرمندہ بھی ہیں۔"

"کس بات پر شرمندہ ہیں پھوپھی حضور ہمیں بھی تو معلوم ہو۔" پھوپھی کی بات کا جواب دیتی ہوئی اسی لمحے نادیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ عابدہ بیگم نے اسے پاس بلا کر بڑے پیار سے گلے لگایا۔ پیار کیا۔ پھوپھا کو سلام کر کے وہ بہن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"فوزیہ جان کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں آپی! آپ مجھے دوسرے کمرے میں لے چلیں مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" فوزیہ نے بے حد چپکے سے نادیہ کے کان میں کہا وہ مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے۔ امی حضور میں اسے اپنے کمرے میں لیے جا رہی ہوں آرام سے سو سکے گی آپ لوگ باتیں کریں۔" وہ فوزیہ کو سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے آئی ایک گلاس دودھ کے ساتھ دوائی پلا کر اسے لٹایا۔ ٹھیک سے کمبل اوڑھایا۔

"تم سو جاؤ۔ تھکی تھکی لگ رہی ہو۔ میں تھوڑی دیر ان سب کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

اس نے فوزیہ کو تسلی دی اور اٹھ کر ماں کے پاس آ گئی۔

نوکر گرم گرم کافی لے آیا تھا۔ نازلی نے سب کو بنا کر دی۔

"تمہاری ڈیوٹی ختم ہو گئی نادیہ بیٹی؟" رشید احمد نے کافی پیتے ہوئے سوال کیا۔

"جی پھوپھا حضور! اب کل صبح ہی جاؤں گی۔ فوزیہ کی وجہ سے جلدی آ گئی ورنہ تو رات ہو جاتی ہے۔"

"فوزی ٹھیک ہو جائے تو ممانی حضور اور فوزی کے ساتھ تم بھی اسلام پور آ جانا۔" بڑی دیر بعد نازلی نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہاں...... دیکھو کوشش کروں گی۔ اگر چھٹی مل گئی تو۔" نادیہ نے روکھے پن سے جواب دیا۔

کافی کی پیالی میز پر رکھ کر عابدہ بیگم نہایت رکے رکے لہجے میں آہستہ سے بولیں۔

"ثریا دلہن! ہم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اپنے اس گناہ کی تم سے معافی بھی مانگ لی اب۔" ثریا بیگم نے بات کاٹ دی۔

"آپ میری بزرگ ہیں آپا بیگم! ایسی بات نہ کریں کہ مجھے شرمندگی ہو۔"

"تو...... کیا میں یہ امید رکھوں کہ وہ ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے استوار ہو سکتا ہے۔ میں اس قابل تو نہیں لیکن نادیہ اب بھی میرے منصور کی امانت ہے۔"

نادیہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے گردن گھما کر پھوپھی کی طرف دیکھا۔ سامنے ہی جھکے ہوئے سر کے ساتھ بیٹھے منصور پر نظر پڑی۔ اس کا سارے کا سارا جسم شدید غصے میں جل اٹھا تھا۔ نظروں میں ایسی شکایت تھی جس کا مداوا ناممکن ہو چکا ہو۔ ثریا بیگم نے ایک اچٹتی سی نظر بیٹی کے چہرے پر ڈالی وہ سمجھ گئیں اعتراف جرم کا وقت گزر چکا ہے۔

"آپا بیگم! فوزیہ صحت یاب ہو جائے پھر دیکھا جائے گا۔ منصور میاں کی شادی کے تو کارڈ بھی چھپ چکے ہیں۔"

"وہ تقریب تو اب منسوخ سمجھو۔" عابدہ بیگم جلدی سے بولیں۔

منصور ابھی تک خاموش بیٹھا تھا۔ دراصل اس لمحے نادیہ یا کسی بھی فرد سے بات کرنے کے لیے جس ہمت اور جسارت کی ضرورت تھی وہ اس کے اندر مفقود ہو چکی تھی۔ کسی نے کتنا ٹھیک کہا ہے کہ اگر کبھی غم و غصے کے عالم میں کسی پر پتھر اٹھا کر مارنے کی خواہش پیدا ہو تو کوشش کرو پتھر اٹھاتے وقت تمہارا جسم نہ جھکے اور اگر ایسا ممکن نہیں تو اپنا ہاتھ روک لو

لیکن منصور کا جسم تو پتھر اٹھانے کے لیے جھک چکا تھا۔

نادیہ نے خالی پیالی ٹرالی میں زور سے رکھی۔ پھر نہایت تیز لہجے میں بولی۔

"میرے خیال میں اگر آپ لوگ اپنی یہ بیش بہا تجاویز کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ فوزیہ کے اعصاب بے حد کمزور ہو چکے ہیں۔"

"ادھر آؤ نادیہ! میرے پاس۔" عابدہ بیگم اس کے تیور پہچان گئی تھیں۔ وہ اٹھ کر ان کے قریب آ گئی چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

"ہم لوگوں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے بیٹا۔ تمہاری ناراضگی حق بجانب ہے لیکن کیا تم اپنی پھوپھی کو معاف نہیں کرو گی؟"

"پھوپھی حضور!" نادیہ جبراً مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ شرمندہ نہ کریں۔ نہ میں ناراض ہوں نہ آپ کو کسی قسم کی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔"

"تم ناراض ہو۔ بلکہ غصہ بھی ہے۔ میں جانتی ہوں۔ لیکن دیکھو بیٹا بڑوں سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔ ہم نے تم پر، وجاہت علی کی اولاد پر شک کیا خدا ہمیں معاف کرے۔"

نادیہ نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر اندر ہی روک لیا بولی کچھ نہیں۔ ان کے اس جملے کے جواب میں بولتی بھی کیا۔

"فوزیہ کی طبیعت بہتر ہو جائے تو کچھ دنوں کے لیے تم سب اسلام پور آ جاؤ۔" ماحول کی تلخی کم کرنے کے لیے رشید احمد نے مشورہ دیا۔

"اس کی طبیعت ٹھیک ہو جائے تو ضرور آؤں گی بھائی صاحب!" ثریا بیگم نے تسلی دی۔

"لیکن......" نادیہ بیچ میں بول پڑی۔ "آپ لوگوں کو یہ بتانا بے حد ضروری ہے کہ جب تک فوزیہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتی، شادی ناممکن ہے میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔"

عابدہ بیگم نے بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک دیکھتی رہیں پھر آہستگی سے بولیں۔

"ہم خود اس کے حق میں نہیں ہیں۔ خدا اس کو تندرست کرے تاریخ بڑھا دی جائے گی بلکہ بڑھانی پڑے گی۔ اس لیے کہ بیٹا اب بارات کی دلہن فوزیہ نہیں نادیہ ہے......"

وہ تیزی سے اٹھی جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ کسی شدید ترین جذبہ پر قابو پا لینے کے

لیے زور سے سر کو جھٹکا۔ دونوں ہاتھوں سے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹا پھر نہایت پُرسکون انداز میں ثریا بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"امی حضور! میں نے فوزیہ کے کچھ ٹیسٹ کروائے تھے ان کی رپورٹ لینے ہسپتال جا رہی ہوں ممکن ہے دیر ہو جائے۔"

"ہم لوگ بھی بس تھوڑی دیر بعد چلے جائیں گے۔" نازلی نے بتایا۔

"پھر ممکن ہے ملاقات نہ ہو سکے اس لیے خدا حافظ۔" لہجہ بے حد سپاٹ تھا۔ رشید احمد مسکرائے۔ قریب آن کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"اچھا جانے سے پہلے یہ تو بتاتی جاؤ کہ تم نے اپنی پھوپھی اور پھوپھا کو معاف کر دیا نا اس لیے کہ میری بھی یہی خواہش ہے بیٹا کہ تم ہی منصور کی......" وہ تیزی سے پھوپھا کی طرف پلٹی۔ بڑے سخت اور فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"گستاخی معاف پھوپھا حضور! جو کچھ آپ لوگ سوچ رہے ہیں وہ مجھے کسی حال میں قطعاً منظور نہیں۔"

عابدہ بیگم کو اسی جواب کی توقع تھی۔ اس لیے وہ زیادہ حیران نہیں ہوئیں۔ ثریا بیگم نے خاموشی سے گردن جھکا لی۔

منصور کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ چند سیکنڈ تک کمرے میں مکمل خاموشی چھائی رہی آخر اس تکلیف دہ خاموشی کو رشید احمد کی آواز نے توڑا۔

"ہم نے جو قصور کیا ہے نادیہ بیٹی! اس سزا کی مستحق ہیں۔ یہ زبردستی نہیں خوشی کا سودا ہے تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔"

"شکریہ پھوپھا حضور!" اس نے کوٹ اور بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

"ثریا دلہن!" اس کے جانے کے بعد عابدہ بیگم ڈوبتی ہوئی آواز میں بولیں۔ "میں جانتی ہوں نادیہ کے منہ سے جو بات نکل جائے وہ پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ پھر بھی تم سمجھاؤ تو......"

"آپا بیگم!" بڑی دیر بعد ثریا بیگم بولیں۔ "اپنوں کی دی ہوئی چوٹ ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ میں آپ کو کوئی الزام نہیں دوں گی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ منصور میاں کے لیے ایک سے ایک اچھا رشتہ مل جائے گا۔ فوزیہ کا خیال ہی چھوڑ دیں۔"

عابدہ بیگم نے شکوہ آمیز نظروں سے بھاوج کی طرف دیکھا۔ کچھ بولنا چاہا لیکن نازلی

نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اماں جان! رشتوں کی اس جنگ میں آپ ہار چکی ہیں۔ میں نے پہلے ہی آپ کو بتا دیا تھا۔ فوزیہ کی مرضی نہیں ہے اور نادیہ؟ اسے ہم لوگوں نے خود ہی گنوا دیا۔ آیئے اب ہم لوگ واپس چلیں۔"

☆

نادیہ نے چھٹیوں کے لیے جو درخواست دی تھی وہ منظور ہو گئی تھی لیکن اس دوران اسے فوری طور پر اسلام پور جانا پڑا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے چھٹیاں منسوخ کرا دیں۔

"کیا حرکت تھی۔ یا تو چھٹیوں کے لیے مری جا رہی تھیں۔ آسانی سے مل گئیں تو منسوخ کرا دیں۔" مریم نے بڑی ناگواری سے ڈانٹا۔ وہ ہنس پڑی۔

"شاید آسانیاں مجھے راس نہیں آتیں۔ سوچا تو بہت کچھ تھا لیکن اب جب سب کچھ بدل گیا تو ارادہ بھی بدل دیا۔ دراصل مریم جانی! راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا۔"

مریم نے حیران ہو کر آنکھیں پھاڑ دیں۔

"خیریت..... طبیعت تو ٹھیک ہے اتنا پھڑکتا ہوا شعر تمہیں کیسے یاد رہ گیا۔" وہ مسکرا دی۔

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔"

"سنگ و خشت کے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا چاہتی لیکن یہ دل تماشہ ضرور ہے۔"

بڑی سخت چوٹ تھی وہ خاموشی سے سہہ گئی۔

"اکثر حالات میں تو انسان تماشہ بن جاتا ہے۔ دل تو معمولی سا عضو ہے۔"

"درست فرمایا لیکن انسان تماشہ ہی اپنی حرکتوں اور اپنے اعمال کی وجہ سے بنتا ہے۔ لوگوں کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ کسی پر ضائع کریں۔" مریم بے حد سنجیدہ تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو مریم!" وہ کرسی پر ٹک گئی۔ "لیکن کبھی کبھار نیک اعمال بھی باعث گردن زدنی بن جاتے ہیں۔" وہ ذرا کرسی قریب آن کر مریم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولی۔

"تم سب کے نزدیک میری حرکتیں مشتبہ تھیں۔ لیکن تم تو میری بے حد قریبی دوست تھیں اگر اعتماد تھا تو اعتماد میں لیا ہوتا۔ دوستی کا حق استعمال کر کے پوچھ لیا ہوتا۔"

مریم کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے تم پر اندھا اعتماد بھی تھا نادیہ وجاہت علی اور اندھا یقین بھی کہ تمہاری کوئی بات

میرے لیے راز نہ ہو گی اور....."

"چلو یہ مانا میری غلطی تھی۔ دراصل میں ہر چیز کو انتہا پر لے جا کر افشاء کرنا چاہتی تھی کہ میرے خیال میں سب سے بڑی خوشی تب ہی ملتی ہے لیکن وہی ہوا کہ انسان کچھ سوچتا ہے اور اللہ کچھ کرتا ہے۔ حالات اور واقعات نے سب بگاڑ دیا۔"

مریم نے نظریں اٹھا کر بڑے غور سے دیکھا اس کے چہرے پر عجیب سی شکستگی تھی، ہار جانے والی یاسیت۔ وہ آہستہ آہستہ بولے جا رہی تھی۔

"جس روز میں نے تمہیں درخواست دی اسی روز میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہ رہی تھی لیکن تم بھی، تم بھی اوروں کی صف میں شامل ہو چکی تھیں۔ سو میری بات سنے بغیر ہی ناراض ہو کر چلی گئیں اور پھر تمہارے جاتے ہی فوراً مجھے اسلام پور جانا پڑ گیا۔"

"نادیہ میں زبردستی کی قائل نہیں۔" مریم نے بڑی ملائمت سے سمجھایا۔ "لیکن یہ یاد رکھو جب کوئی بہت اپنا غیر بن جائے تب بڑا درد ہوتا ہے۔ ناقابل برداشت اور تم یہ جانتی ہو کہ حالات نے مجھ سے قوت برداشت چھین لی ہے۔"

نادیہ زور سے ہنس پڑی حالانکہ اس کی ہنسی میں بڑا کرب تھا درد کی ٹیس تھی۔

"تمہاری مرضی لیکن یہ مت بھولنا کہ غلط فہمیاں اور غلط مفروضے انسان کو زندگی بھر کا پچھتاوا دے جاتے ہیں۔"

مریم جواب دیئے بغیر ہی کمرے سے باہر چلی آئی۔

اور وہ خاموشی اور بڑے دھیرے پن سے تھک ہار کر مسہری پر ٹک گئی۔

اب اس نے سوچا میری زندگی کا مقصد اس ہسپتال اور اس کے کمروں میں پڑے ہوئے مایوس اور دکھی انسانوں کی خدمت کرنا اور ان کو ان کی بچی کھچی خوشیاں بانٹنا ہے۔ اگر کسی ایک کے چہرے پر بھی مطمئن اور پُرسکون مسکراہٹ آ گئی تو میں سمجھوں گی کہ اللہ نے میرے جذبے کا بھرم رکھ لیا ہے۔

وہ جانتی تھی کہ جن آرزوؤں اور تمناؤں کی بنیاد پر وہ اپنا عالی شان محل تعمیر کرنے چلی تھی اسے بقول دوسروں کے اس نے خود ہی ڈھا دیا تھا۔ اب ان کھنڈروں پر کھڑے ہو کر وہ رونا نہیں چاہتی تھی بلکہ اپنی مسکراہٹوں میں آنسوؤں کو چھپا کر وہ خلوص، محبت و پیار کے سارے خزانے ان بیماروں پر لٹا دینا چاہتی تھی جنہیں ان سب کی اس سے زیادہ ضرورت تھی

اس لیے کہ جس انمول سودے میں اسے نفع کی امید تھی اس میں تو نادیہ وجاہت علی نے بڑا زبردست گھاٹا برداشت کیا تھا۔

بعض اوقات جن پر بھروسہ کیا جائے وہ کتنے ناقابل بھروسہ نکلتے ہیں۔ جن سے سچا پیار کیا جائے ان میں کتنی بناوٹ اور تصنع ہوتا ہے اور جنھیں اپنا سمجھا جائے وہ کس آسانی سے غیر بن جاتے ہیں۔ نادیہ کے لیے یہ حقیقت بڑی تلخ تھی۔

جس منصور پر اسے اتنا اعتماد تھا۔ جس کے لیے یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ یوں اجنبی بن سکتا ہے۔ اس منصور نے اتنی بڑی سزا دی تھی۔ یہ اتنی عجیب وغریب سزا تھی کہ جس پر نہ تو وہ دل کھول کر خوش ہو سکتی تھی نہ چیخیں مار کر رو سکتی تھی۔

جس درمیانی راستہ کو اس نے اختیار کیا تھا وہ کتنا کٹھن اور جان لیوا تھا یہ بات نہ منصور، نہ عابدہ بیگم اور فوزیہ کوئی بھی تو نہیں جان سکتا تھا۔

''ٹھک...... ٹھک......'' کوئی آہستہ آہستہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

اچانک ہی ذہنی طور پر بھٹکتے رہنے کے بعد وہ پلٹ آئی۔

''کون ہے؟'' اس نے مسہری سے اتر کر آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر بال درست کیے۔

''ڈاکٹر صاحبہ! کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔'' چوکیدار تھا۔

''کون ہو سکتا ہے؟'' نادیہ نے حیران ہو کر گھڑی دیکھی۔ شام کے چھ بج رہے تھے کوٹ کی سلوٹیں درست کرتی ہوئی وہ باہر آ گئی۔

کمرے کے باہر قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گئی۔

سامنے لان میں منصور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے اس کا دل اپنی پوری طاقت سے دھڑکا۔ قدموں میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بڑے باوقار انداز میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔

''ہیلو!'' منصور نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہیلو! خیریت، کیسے آنا ہوا؟'' بڑا خشک اور بے جان سا لہجہ تھا۔

منصور نے جواب دینے سے پہلے گھور کر اسے دیکھا پھر بڑی بے نیازی سے بولا۔

''اگر میرا آنا ناگوار گزرا ہے تو چلا جاؤں۔''

''کسی کے آنے اور چلے جانے سے میرے اوپر کوئی فرق نہیں پڑتا آپ کی مرضی۔''

''وہ میں جانتا ہوں۔ مجھے ممانی حضور سے ملنا تھا۔ فوزیہ کیسی ہے؟''

نادیہ کے رخسار جل اٹھے۔

''ٹھیک ہے۔ گھر پر امی حضور کے پاس ہے۔ آپ جانا چاہیں تو شوق سے جا سکتے ہیں۔'' ٹکا سا جواب ملا۔

''فوزیہ...... ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟'' منصور نے رک کر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... آں۔ اللہ نے چاہا تو وہ ایک روز میں چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو جائے گی۔ لیکن آپ کو یہ باور کرادوں کہ یہ اس کی مرضی اور خوشی پر منحصر ہے کہ وہ اسلام پور جائے یا نہ جائے۔''

''میں نے آپ سے یہ تو نہیں کہا کہ وہ اسلام پور آئے میں تو صرف اس کی طبیعت پوچھ رہا تھا۔''

''میں بھی تو بتا رہی ہوں کہ چند روز میں وہ مکمل طور پر تندرست ہو جائے گی۔ اس کے بعد۔'' وہ رک گئی منصور نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی وہ بڑی بے نیازی سے ہلکے ہلکے مسکرا رہی تھی۔ منصور کا دل چاہا اتنی سخت اور بے حس لڑکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے۔ اس کی اس مسکراہٹ کو آنسوؤں میں تبدیل کر دے۔ پھر پوچھے اب بولو نادیہ بیگم پتھر روتے ہیں یا نہیں۔ ان میں بھی شگاف پڑ جاتے ہیں۔ انہیں بھی چوٹ لگتی ہے میں بھی دیکھنا چاہتا تھا لیکن کچھ کہنے کی بجائے وہ اس کی بات کے جواب میں صرف مسکرا دیا۔

''چلو جانے دو اس بات کو۔ فی الحال میں تمہارا مہمان ہوں۔ ایک پیالی چائے تو مل جائے گی نا۔''

''سوری منصور! میرا یہ وقت مہمانوں کے لیے نہیں مریضوں کے لیے ہے۔''

''جانتا ہوں ڈاکٹر نادیہ وجاہت علی! لیکن اس کے باوجود تھوڑا وقت آپ کو مجھے بھی دینا پڑے گا۔'' وہ نہایت گمبھیر آواز میں بولا۔

نادیہ نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر نہایت سنجیدگی اور صفائی سے بولی۔

''میں مجبور ہوں منصور صاحب!''

''میں کسی مجبوری کو نہیں مانتا۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے اور ابھی اسی وقت کرنی ہے۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"بیرسٹر صاحب میں نہ آپ کی موکلہ ہوں نہ مجرم۔ آپ اپنے فیصلے زبردستی مجھ پر صادر نہیں کر سکتے۔ ویسے اگر اتنی ہی اہم بات ہے تو پانچ منٹ میرے پاس ہیں بتا دیں۔"

"یہاں نہیں۔ اندر کمرے میں جا کر بتاؤں گا۔ اگر جانے سے انکار کیا تو گھسیٹ کر اندر لے جا سکتا ہوں۔"

وہ زور سے ہنس پڑی۔

"بہت خوب تو گویا آپ ہر بندے کو مجرموں کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔"

"ہاں اگر تم جیسا مجرم سامنے آئے تب۔"

"معاف کیجیے گا بیرسٹر صاحب! میں نے کوئی جرم ورم نہیں کیا۔ مجھے اپنی ڈیوٹی پر جانے دیں میں جبر کی قائل نہیں۔"

منصور سلگ اٹھا۔ ضبط کی انتہا ہو چکی تھی۔ اگر ہسپتال کا معاملہ نہ ہوتا تو اس وقت وہ یقیناً اسے گھسیٹ کر گاڑی میں ڈال لیتا لیکن...... ہونٹ بھینچ کر وہ آہستگی سے بولا۔

"ڈاکٹر صاحبہ! آپ کے صرف دس منٹ ضائع ہوں گے لیکن جو بات مجھے کہنی ہے وہ برسرِ عام نہیں آپ کے کمرے میں ہی کہی جا سکتی ہے۔"

"تو...... آیئے۔" نادیہ نے گویا بڑا کرم کیا۔

وہ اس کو ساتھ لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔ "تشریف رکھیں۔" اس کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔ منصور بیٹھا نہیں بلکہ اس کے نزدیک آ کر دونوں ہاتھ کندھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

"نادیہ! مجھے اتنا پاگل نہ بناؤ کہ کسی بڑے جرم کا مرتکب ہو جاؤں۔ میں بغیر کسی تمہید کے صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ وہ شادی کسی بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کے بعد تم سے بدلہ لینے کے لیے کر رہا تھا۔ یوں سمجھو تمہیں اذیت دینے کے لیے اپنا آپ مار رہا تھا لیکن اب......"

"منصور!" بات کاٹ کر نادیہ نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ "شادی بیاہ کو تم لوگوں نے کھیل سمجھا ہے یا لڑکیاں تمہارے نزدیک کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں ایک بار مجھے منگنی کی انگوٹھی پہناتے ہو اور دوسری بار میری بہن سے شادی کرنے کا اعلان کرتے ہو۔ اور آج پھر میرے پاس آ گئے۔ تم ہی بتاؤ تمہاری اس حرکت کو کیا نام دوں۔ میری تم سے درخواست ہے کہ اس سے قبل کہ میں کسی برے سلوک کی مرتکب ہوں تم یہاں سے چلے جاؤ

اور پھر کبھی بھی اس سلسلے میں میرے پاس نہ آنا۔"

منصور کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ سوچتا رہا پھر آہستگی سے بولا۔

"میں جانتا ہوں تم ہماری اس غلطی کو کبھی معاف نہیں کرو گی۔ لیکن سوچو اس میں تمہارا بھی کچھ قصور تھا۔ ممانی حضور کے مل جانے کو اتنے راز میں کیوں رکھا۔ اسکینڈل کیوں بنایا کہ دیکھنے والے تمہارے کردار پر شک کرنے لگیں۔"

"مجھے اوروں کی پرواہ نہیں۔ غیر تو ہمیشہ ہی کیچڑ اچھالتے ہیں۔ تم لوگ تو اپنے تھے۔ تمہیں اگر مجھ پر، اپنے ہی خون پر بھروسہ نہیں تو پھر دنیا میں کس پر بھروسہ کرو گے۔ میرے پاس تمہارے لیے اب کوئی جذبہ نہیں بچا ہے۔ تم جا سکتے ہو۔"

"نادیہ!" منصور نے ہیجانی کیفیت میں اس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ "میں کہہ رہا ہوں مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے شرمندہ ہوں لیکن اب......"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا جو وقت اچھا یا برا جیسا گزر جائے واپس پلٹ کر نہیں آتا۔" نادیہ نے زور سے سر کو جھٹک کر اپنا آپ اس سے علیحدہ کر لیا۔ منصور کچھ نہیں بولا۔ خاموش، گہری اور تاسف بھری نظروں سے نادیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ان آنکھوں میں اتنی وحشت، جھنجلاہٹ اور افسردگی تھی کہ نادیہ برداشت نہ کر سکی۔ وہ جلدی سے دوسری طرف مڑ گئی۔ منصور آگے بڑھا۔

پشت پر سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے بولا۔

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"میری غلطی کو معاف نہیں کرو گی؟" آواز میں التجا تھی۔

"بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ہم انہیں فراموش کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ آئینہ پر لکیر پڑ جائے تو مٹائی نہیں جا سکتی اسے توڑ دیا جاتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے بہر حال ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" جس آہستگی سے ہاتھ کندھے پر آیا تھا اسی آہستگی سے علیحدہ ہو گیا۔

نادیہ پتھر کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا اور وہ باہر چلا گیا۔ قدموں کی آواز مدھم ہوتی گئی۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر وہ چونک کر پلٹی۔ جب باہر آئی تو دیکھا

منصور اس قدر خوفناک انداز میں گاڑی نکال کر لے جا رہا تھا کہ نادیہ کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ مایوس ہو کر گیا ہے۔ اللہ خیر کرے۔ دوسرے ہی لمحے غیر ارادی طور پر وہ سیڑھیوں سے نیچے اتری گاڑی اسٹارٹ کی اور باہر نکل گئی۔

منصور کا جنون اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

گاڑی کی رفتار لحظہ بہ لحظہ تجاوز کرتی جا رہی تھی وہ نتیجے سے بے خبر جلد سے جلد گلزار نگر کی حدود چھوڑ دینے کی فکر میں اپنا آپ ہی گنوائے دے رہا تھا۔ مایوسی اور ناکامی انسان کو اچھے اور برے کی تمیز سے ماورا کر دیتی ہے۔ نادیہ کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ کسی فیصلے کے بغیر ہی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اسے اسٹارٹ کرتے وقت بھی وہ خالی الذہن تھا لیکن گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ لمحوں میں گلزار نگر سے دور بہت دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ بار بار اس کے کانوں میں نادیہ کی آواز گونج رہی تھی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا منصور تم جا سکتے ہو۔" اس کی نظروں کے سامنے دور تک پھیلی ہوئی سڑک اور اس پر دوڑتی ہوئی گاڑیوں کے بجائے نادیہ کا افسردہ لیکن غضب ناک چہرہ آ جاتا۔

اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ کانپ جاتے گاڑی ڈولنے لگتی۔

احساس جرم اور احساسِ شکست بڑا ظالم ہوتا ہے، کسی کل چین نہیں ملتا ہے تین گھنٹے گزر جانے کے باوجود وہ گلزار نگر کی حدود سے باہر نہ نکل سکا تھا۔ آخری موڑ کاٹنے کے بعد جب اس نے گاڑی پوری اسپیڈ پر ڈالی تو اتفاقاً ہی وہ نواب وجاہت علی کے ویران محل کے سامنے تھا اس کا سر چکرا گیا۔ ایک لمحے کے لیے گاڑی کی رفتار میں کمی آئی۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"ماموں حضور! میں خطاوار ہوں مجھے معاف کر دیجیے گا۔" دوسرے ہی لمحے تیزی سے بھاگتی گاڑی کو قابو کرنے کی بجائے اس نے نہایت آہستگی اور سکون سے اپنا سر اسٹیرنگ پر ٹکا دیا آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے غالباً اس نے کچھ کہا تھا پھر......

☆

رات کے دس بج چکے تھے ثریا بیگم نماز سے فارغ ہو کر فوزیہ کے پاس آئیں۔ وہ خاموش لیٹی تھی۔

"کیسی ہو بیٹا۔ کھانا کھا لو نادیہ تو ابھی تک نہیں آئی نہ جانے کب آئے۔" وہ فکرمند تھیں۔

"ہاں امی حضور پتا نہیں کیا بات ہے۔ ورنہ آپی تو آٹھ بجے آ جاتی تھیں۔ آج بہت دیر ہو گئی۔ شاید کوئی آپریشن ہو گا۔" ثریا بیگم وہیں فوزیہ کے پاس بیٹھ گئیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ہسپتال فون کر کے معلوم کرتی ہوں۔" فوزیہ نے تسلی دی۔ فون پر مریم تھی فوزیہ کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر وہ خود بھی پریشان ہو گئی۔ صبح کی طویل گفتگو کے بعد سے وہ خود بڑی بے چین تھی۔

"تم فکر نہ کرو فوزی میں تمہارے پاس آ رہی ہوں ابھی چوکیدار سے معلوم کرتی ہوں شاید اسے کچھ بتا کر گئی ہو۔"

آدھے گھنٹے بعد مریم پہنچ گئی۔ چہرے سے کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔

"آپی کا کچھ پتا چلا؟" فوزیہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

فوزیہ کے نزدیک ہی بیٹھی خاتون پر نظر پڑتے ہی مریم کا دل دھڑکا۔ "میں تو تم کو سب کچھ بتا دینا چاہ رہی تھی۔" اسے نادیہ کے الفاظ یاد آئے۔ اس نے انجان بن کر جھک کر ادب سے سلام کیا۔

"مریم آپی! یہ میری امی حضور ہیں۔ جن کی خاطر میری آپی نے لوگوں کی بڑی بڑی باتیں سہی ہیں۔"

مریم کو سارا جسم برف میں ڈوبتا محسوس ہوا۔ عجیب و غریب سنسناہٹ تھی جو دماغ سے لے کر پاؤں کے تلوؤں تک پھیل گئی۔ "تو۔" اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ "یہ وہ راز تھا۔"

مریم نے ایک بار پھر بڑی عقیدت سے اپنا سر ان کے سامنے جھکا دیا۔

ثریا بیگم نے بزرگانہ شفقت سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا۔

"میں...... نادیہ کی۔" وہ ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولی۔

"تم مریم ہو۔ میں جانتی ہوں۔ خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔ اس کی تو کوئی بات تمہارے ذکر اور تعریف سے خالی نہیں ہوتی۔"

مریم شرم سے ڈوب ڈوب گئی۔

"آپ کی بیٹی بہت اچھی ہے آپ وہ خوش قسمت ماں ہیں جن کو نادیہ جیسی بیٹی ملی ہے۔"

"مریم آپی!" فوزیہ الجھ رہی تھی۔ "ان باتوں کو چھوڑیں پہلے یہ بتائیں آپی کہاں ہیں ہسپتال میں بھی نہیں ہیں۔"

"فوزیہ! میں کام سے باہر گئی ہوئی تھی واپس آئی تو کمرے میں نہیں تھی۔ چوکیدار سے پوچھا تو پتا چلا گاڑی لے کر کہیں گئی ہے۔"

"اسے کچھ بتایا تو ہوگا۔" ثریا بیگم نے پوچھا۔

"نہیں ماں جی! میرے پوچھنے پر اس نے صرف یہ بتایا کہ کوئی صاحب ان سے ملنے آئے تھے۔ ان کے جاتے ہی نادیہ بی بی بھی گاڑی لے کر چلی گئیں۔"

"کون ہو سکتا ہے؟ وہ کہاں جا سکتی ہیں؟" فوزیہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ وہ تو اکثر یونہی بغیر بتائے چلی جاتی تھی ویسے میں ہسپتال جا کر معلوم کرتی ہوں۔ ممکن ہے ایمرجنسی میں کسی مریض کو دیکھنے چلی گئی ہو۔" مریم اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں شاید ایسا ہو تم ہمیں فون پر ضرور بتا دینا میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"وہ یقیناً اللہ کی حفظ و امان میں ہوگی ماں جی! اس لیے کہ اس جیسی نیک بیٹی آپ کی دعاؤں کے حصار میں ہے۔" مریم نے سسکی روک کر جملہ پورا کیا۔

ثریا بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ فوزیہ کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ مریم خدا حافظ کہہ کر باہر آ گئی لیکن اس طرح کہ اس کے پاؤں منوں بوجھ تلے دب چکے تھے۔ احساس شرمندگی اور ندامت نے ذہن کو مفلوج کر دیا تھا۔ "لعنت ہے مجھ پر اور میری دوستی پر جو اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود اس کی فطرت، اس کا مزاج، اس کی عادت نہ جان سکی اور اس پر شک کر بیٹھی۔ اللہ مجھے معاف کرے اور یقیناً مجھ جیسی کو اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا کرنا بھی نہیں چاہیے۔"

☆

نادیہ کی گاڑی اپنی پوری رفتار سے اسلام پور جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ منصور کے جاتے ہی اسے اس بات کا اچانک ہی شدت سے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گئی تھی اور منصور اپنی ناکامی پر بڑا مایوس ہو کر گیا تھا۔ اس لیے اس کے جاتے ہی وہ بھی گاڑی لے کر اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئی تھی لیکن دو گھنٹے گزر چکنے کے بعد بھی وہ اس کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔

اسلام پور نزدیک آ رہا تھا۔ وہ ہر گزرنے والی گاڑی کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی۔ پھر

آگے بڑھ جاتی۔ مختلف چکر کاٹ کر کورٹ کے سامنے سے گزرتی ہوئی رشید احمد کی کوٹھی کے سامنے ذرا سی رکی۔ گیٹ بند تھا پورچ خالی پڑا تھا۔ اگر منصور آ گیا ہوتا تو وہاں ضرور اس کی گاڑی کھڑی ہوتی۔ اس نے سوچا اندر جا کر پوچھے ممکن ہے آتے ہی کہیں چلا گیا ہو۔ پر ہمت نہیں پڑی واپس پلٹ آئی۔

ایک بار پھر کورٹ کا چکر لگایا گاڑی روک کر چپراسی سے پوچھا معلوم ہوا۔ آج صبح سے وہ آیا ہی نہیں۔ ایک گھنٹہ تک یونہی بے خیال بے ارادہ اسلام پور کی سڑکوں کا چکر لگانے کے بعد وہ واپس گلزار نگر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس بار اس کا دل نامعلوم خدشوں اور انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ پھر بھی بڑی دلجمعی اور سکون سے وہ گلزار نگر کی طرف بھاگتی رہی۔

"خدایا...... وہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔" اس کا انگ انگ دعا مانگ رہا تھا۔

جس وقت اس کی گاڑی گلزار نگر کی حدود میں داخل ہوئی رات ہو چکی تھی۔ تسلی اور دل بہلانے کی خاطر وہ گھر آ گئی صرف اس موہوم سی امید پر کہ شاید امی حضور کے پاس آ گیا ہو۔

اس کی پریشان شکل، بکھرے ہوئے بال اور خشک ہونٹوں کو دیکھ کر ثریا بیگم دھک سے رہ گئیں۔

"خیریت تو ہے نادیہ آج اتنی دیر لگا دی۔ ہم لوگ تو پریشان ہو گئے تھے اور یہ اتنی پریشان اور گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟" دل کا حال ماتا سے چھپا نہ رہ سکا لیکن وہ اصلیت چھپا کر مسکرا دی۔

"کچھ نہیں امی حضور میں تو بالکل ٹھیک ہوں بس ذرا تھک گئی ہوں۔"

"تھکن سے زیادہ آپ کے چہرے پر پریشانی نظر آ رہی ہے۔ آپ ہسپتال میں تو نہیں تھیں کہاں گئی تھیں؟" فوزیہ نے پے در پے سوال کر ڈالے وہ فوزیہ کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ مرجھایا ہوا تھا۔

"امی حضور! کیا ابھی تک آپ لوگوں نے کھانا نہیں کھایا؟"

"تم آ گئی ہو۔ اطمینان ہو گیا۔ کھانا بھی کھا لیں گے تم بھی تو بھوکی ہو گی۔"

"میں نے کھانا کھا لیا ہے امی حضور یوں کریں آپ اور فوزیہ کھانا کھا لیں اس کو دوائیں دے دیجیے گا۔ مجھے ابھی واپس ہسپتال جانا ہے۔"

"مگر کیوں آپی سارے دن بعد تو......؟"

"سمجھا کرو فوزی ایمرجنسی ہے۔ میں گھنٹہ دو گھنٹہ میں آ جاؤں گی۔"

ثریا بیگم خاموش بیٹھی اس کو دیکھتی رہیں۔ وہ نارمل نہیں تھی۔ کچھ بے چینی تھی، گھبراہٹ تھی، الجھن تھی، لیکن انہوں نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

"اچھا امی حضور اجازت۔" اس نے جھک کر ان کی پیشانی چوم لی۔

"فی امان اللہ بیٹا دیر نہ کرنا۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

آخری بار بے نام سی آس کے سہارے اس نے دوبارہ اسلام پور جانے والی سڑک کا کچھ دور تک چکر لگایا پھر ڈوبے ہوئے دل اور بے جان ہاتھوں سے کار چلاتی ہسپتال واپس آ گئی۔

گیٹ میں گاڑی داخل ہوتے ہی نرس بھاگی ہوئی آئی۔

"ڈاکٹر نادیہ آپ کہاں تھیں؟ ڈاکٹر عامر کب سے آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔"

"کیوں مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے؟ میری ڈیوٹی تو ختم ہو چکی ہے۔" اس نے نہایت بیزاری سے جواب دیا۔

"وہ آپریشن روم میں ہیں، مجھ سے کہا تھا جیسے ہی آپ آئیں وہاں بھیج دیا جائے۔"

"میں بہت تھک گئی ہوں سسٹر۔ اس ہسپتال میں میرے علاوہ اور بھی سینکڑوں ڈاکٹر ہیں ان میں سے کسی کو بھیج دو۔" اس کا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ سسٹر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ نادیہ ان نظروں کی پرواہ کیے بغیر تھکے تھکے قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں آ گئی اور آل ایک طرف پھینک کر بے جان سی مسہری پر گر پڑی۔ منصور تم جہاں بھی ہو خیریت سے تو ہونا؟ اس کی بند آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک ٹپک کر تکیے میں جذب ہوتے رہے۔ اسی لمحے دھڑک سے دروازہ کھلا اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"نادیہ...... خدا کی پناہ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟" مریم یوں ہانپ رہی تھی جیسے میلوں کا سفر پیدل ہی طے کر کے آئی ہو۔ "ڈاکٹر عامر کب سے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں تمہیں معلوم ہے کہ......"

"خدا کے لیے مریم۔" اس کی بات کاٹ کر نادیہ نے بڑے التجا آمیز انداز میں دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیئے۔

"آگے کچھ مت کہنا مجھے تھوڑی دیر تو سکون سے پڑا رہنے دو۔ میں کسی مریض کا

آپریشن کرنا تو درکنار اسے دیکھ بھی نہیں سکتی۔"

"نادیہ!" مریم نے خشک ہونٹ زبان پر پھیر کر انہیں تر کیا۔ پھر نزدیک آ کر بہت دھیمی آواز میں بولی۔ "تم آپریشن روم میں تو جاؤ۔ وہاں منصور زخمی پڑا ہے۔"

نادیہ اس طرح اچھل کر کھڑی ہو گئی جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس نے وحشت زدہ پھٹی پھٹی نظروں سے مریم کی طرف دیکھا یکلخت حیرتوں کا ایسا ریلا آیا کہ ذہن کے سارے کواڑ پاٹوں پاٹ کھل گئے۔

"اس وقت میرا دل کہہ رہا تھا اسے کچھ ہو جائے گا کچھ ہو گیا نا......" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ پھر مریم کو ایک طرف دھکیل کر بھاگتی ہوئی آپریشن روم کی طرف ہو لی۔ اندر قدم رکھتے ہی ایسا محسوس ہوا گویا اس کا جسم منجمد ہو چکا ہو قدم اٹھانے کی بھی سکت نہیں تھی۔ سامنے میز پر منصور بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے کپڑے خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر عامر اس پر جھکے ہوئے پٹیاں باندھ رہے تھے۔ آہٹ پر انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

نادیہ خواب کی سی حالت میں بے جان قدموں سے چلتی ہوئی میز کے نزدیک آئی اور منصور کے سرہانے چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ عامر اپنا کام کر کے اس کی طرف پلٹا۔

"آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں؟" وہ جواب دیئے بغیر منصور کی بند آنکھوں کو تکتی رہی۔ عامر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ "گھبرایئے نہیں۔ خدا کا شکر ہے زیادہ خطرناک چوٹیں نہیں آئیں۔ معمولی آپریشن کرنا پڑا۔ صدمے اور تکلیف سے بے ہوش ہیں۔ ابھی ہوش آ جائے گا۔" پھر اس نے بازو سے پکڑ کر نادیہ کو ایک طرف ہٹا دیا۔ وارڈ بوائے اور سسٹرز نے بہت آہستگی سے منصور کو اسٹریچر پر ڈالا۔

"میں انہیں کمرہ نمبر چھ میں بھیج رہا ہوں آپ ساتھ چلی جائیں۔" عامر نے اسے ہدایت کی اور خود باہر نکل گیا۔ نادیہ نے نظریں اٹھا کر عامر کی طرف دیکھا۔ پھر خالی الذہن سی کسی مشینی قوت کے تحت چلتی ہوئی کمرہ نمبر چھ میں آ گئی۔

منصور کو مسہری پر لٹا دیا گیا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر قریب ہی بیٹھ گئی۔ منصور کا ایک بازو سینہ اور پیشانی پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ نادیہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے بالوں کو چھوا۔ اس کی انگلیاں سرخ سرخ خون سے رنگ گئیں وہ چند سیکنڈ تک اس خون کو جو اس کے اپنے

منصور کا تھا تکتی رہی پھر دھیرے سے اٹھی اور اپنے ہونٹ ان خون آلودہ بالوں پر رکھ دیئے۔

"منصور خدا کے لیے آنکھیں کھول دو ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔" لیکن دونوں کے بیچ جان لیوا خاموشیاں حائل تھیں۔

"ڈاکٹر نادیہ!" اسے اپنے قریب ہی ڈاکٹر عامر کی آواز سنائی دی۔ "آپ گھر جائیں رات کی نرس موجود ہے۔ اب یہ ساری رات آرام سے سوئیں گے انجکشن لگا دیا ہے۔" نادیہ بھی کھڑی ہوگئی۔

"ڈاکٹر عامر میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ ویسے ان کی حالت ٹھیک تو ہے نا۔"

ڈاکٹر عامر مسکرا دیا۔

"آپ کو میری بات کا یقین نہیں۔ یہ خطرے سے باہر ہے صبح تک مکمل طور پر ہوش میں آکر پھر بک بک شروع کر دے گا۔" نادیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آگئی۔

"میں یہیں اس کے پاس ہوں ممکن ہے کسی بھی وقت ڈاکٹر کی ضرورت پڑے۔"

"آپ کی مرضی۔ ویسے اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ میں چلتا ہوں رات کسی بھی وقت اپنے کمرے میں جا کر تھوڑا آرام ضرور کر لیجیے گا۔"

نادیہ نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ لیکن اس نے وہ تمام رات اس کے پاس بیٹھ کر گزار دی۔ اس درمیان عامر نے کئی چکر لگائے ہر بار جب وہ کمرے میں قدم رکھتا نادیہ کی محویت اور مدہوشی دیکھ کر اسے اپنے اندر کوئی چیز ڈوبتی اور ٹوٹتی محسوس ہوتی۔

رات میں اطلاع ملنے پر ثریا بیگم اور فوزیہ بھی فوراً آ گئی تھیں۔ ثریا بیگم تو اسے اس حالت میں دیکھ کر سکتہ میں آ گئی تھیں۔ فوزیہ، منصور کو دیکھ کر جب تڑپ کر روئی تو نادیہ نے بڑی عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے منصور کے لیے رونے کا حق بھی صرف اسے ہی ہو۔ عابدہ بیگم اور رشید احمد کو رات اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ نادیہ نے تھوڑی دیر بعد ثریا بیگم اور فوزیہ کو بھی گھر بھیج دیا تھا۔ اسے ان دونوں کی بھی فکر تھی۔

صبح ہو چکی تھی۔

"منصور!" نادیہ نے اس کے نزدیک ہو کر ہولے سے آواز دی۔ منصور کے پپوٹوں میں جنبش ہوئی۔ پھر اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ نادیہ نے اٹھ کر اس کا وہ ہاتھ جو زخمی ہونے سے بچ گیا تھا تھام لیا۔

منصور کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ان میں وحشت تھی، بیگانگی تھی، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ کچھ یاد کر رہا ہو۔ نادیہ کے ہونٹوں پر بھیگی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ میں ہوں نادیہ!"

"نا...... د...... یہ......" منصور نے رک رک کر غیر یقینی انداز میں دہرایا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بڑے کرب ناک انداز میں ہنس پڑی چند منٹ تک دھندلائی نظروں سے اس کا چہرہ تکتی رہی پھر اپنا سر منصور کے ہاتھ پر ٹکا دیا۔

"میری طرف دیکھو تو۔ میں نادیہ ہوں۔" منصور نے دوبارہ آنکھیں کھول کر غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

اس کے ہونٹوں پر آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

"میں تمہارے پاس ہوں تم بالکل ٹھیک ہو بس ذرا سی چوٹ آ گئی۔" منصور نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور نہایت دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ میں نے تمہارا دل دکھایا ہے۔ مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔" نادیہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ "اب ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اچھے ہو لو پھر دونوں ساتھ ہی گاڑی ٹکرا کر مر جائیں گے۔"

منصور نے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ زور سے ہنس پڑی لیکن اس ہنسی کے ساتھ ہی آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ڈھلک پڑے۔

"تو...... کیا...... تم...... نے...... مجھے۔" منصور نے ہاتھ بڑھا کر ان بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ دیا۔

"ہاں...... آں...... بس زیادہ باتیں نہیں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ ڈاکٹر عامر نے تمہیں باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تو میری شامت آ جائے گی۔"

"تو کیا واقعی تم نے مجھے معاف کر دیا۔" وہ یقین کرنا چاہتا تھا۔

"شاید۔" وہ بیک وقت ہنس بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ منصور نے اس کا برف جیسا سرد ہاتھ تھام لیا۔

"پگلی...... اس روز بتا دیا ہوتا تو یوں اپنی ہڈیاں کیوں تڑواتا۔"

"اچھا ہے مکمل صحت یابی کے لیے یہ سب بھی ضروری ہے۔" نادیہ نے ہنستے ہوئے

جواب دیا۔

"لوگ سچ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر بہت سنگدل ہوتے ہیں اتنی تکلیف دے کر بھی خوش ہو رہی ہو۔"

"اور جو تکلیف تم نے مجھے دی ہے۔ اس کی اذیت کا تو تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔"

"ہاں مانتا ہوں تم بہت بہادر ہو۔ تم میں بہت حوصلہ ہے۔" وہ خاموش ہو گیا پھر اس کا ہاتھ تھام کر آہستہ سے بولا۔ "سوچ رہا ہوں جس حقیقت کا انکشاف آج اس المیہ کے بعد ہوا ہے اگر آٹھ تاریخ گزرنے کے بعد ہوتا تو۔"

"تو۔" نادیہ ہنس پڑی۔ "تو بیرسٹر صاحب تین قیمتی جانوں کا ضیاع ہوتا۔ بس اچھا اب آرام کرو میری ڈیوٹی ختم۔"

منصور دھیرے سے اس کا ہاتھ ہونٹوں تک لایا، چوما اور چھوڑ دیا۔ نادیہ کے چہرے پر گلال پھوٹ پڑی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں ناشتہ بھجوا رہی ہوں سسٹر منہ دھلوا کر کھلا دیں گی۔ مجھے راؤنڈ پر جانا ہے۔" اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆

وہ پونم کی رات تھی۔ پُراسرار، خاموش اور نکھری نکھری شفاف چاندنی میں ڈوبی ہوئی۔ آکاش سے لے کر دھرتی تک یوں جانا پڑتا تھا جیسے تاریکی کو مٹانے کے لیے روشنیوں کا جوار بھاٹا آ گیا ہو۔ ہر چیز اسی چمکدار، ٹھنڈی اور سکون بخش روشنی میں یوں چپ چاپ کھڑی تھی جیسے کچھ سوچ رہی ہو کچھ پوچھ رہی ہو۔

پوری حویلی بقعہ نور بنی تھی۔ ہر فرد کا چہرہ مسرتوں اور خوشیوں سے دمک رہا تھا۔ اسی حویلی کے ایک کمرے میں نادیہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس کی مانگ میں افشاں کے تارے جھلملا رہے تھے۔ ماتھے پر سہاگ کا ٹیکہ پونم کے چاند سے زیادہ پُرکشش اور تابناک نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں پر بڑی مقدس اور شرمیلی مسکراہٹ تھی۔

اسلام پور کی جگمگاتی حویلی میں منصور نے آہستہ سے نادیہ کا گھونگھٹ پلٹا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔